ہندستانی اکیڈیمی کا تِماہی رِسالہ

جولائی ۱۹۳۲ع

ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ، الہ آباد

سالانہ چندہ پانچ روپیہ

هندستانی جولائی سنہ ۱۹۳۲ع

ایڈیٹر : اصغر حسین

مجلسِ مدیران

فہرست مضامین

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماهی رساله

جلد ۲ } بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۲ع { حصہ ۱

مثنوی کرامات پیران پیر جہاں

(از نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب‌الرحمان خاں صاحب شروانی)

حکیم ابوالقاسم قدرت‌الله خاں ، قاسم تخلص کا نام دنیاے ادب میں اون کے تذکرۂ شعرا موسوم بہ "مجموعۂ نغز" کی وجہ سے مشہور ہے - دہلوی تھے ، اون کا خاندان علم اور فقر میں مشہور تھا - حضرت مولانا فخرالدین کے قادریہ سلسلے میں مرید تھے - عربی علوم کی تحصیل خواجہ احمد خاں سے کی تھی - طب میں حکیم محمد شریف خاں صاحب کے شاگرد تھے - شاعری میں هدایت‌الله خاں هدایت سے تلمذ تھا - مطب کا شغل تھا - ۱۲۳۶ھجری میں بڑی عمر پاکر وفات پائی - مثنوی مذکوربالا سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھہ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے - گیارہ برس کی عمر میں میر فتح علی خاں اون کے والد کے دوست نے حضرت ممدوح‌الصدر کی خدمت میں پہنچا دیا - اور حضرت کے مدرسے میں پڑھنے لگے - مولوی سید احمد صاحب کے د تعلیم تھی - بڑی محنت سے پڑھتے تھے - چنانچہ لکھا ہے -

میں تھا گرم تحصیل جب اے خلیل
سدا تھی مجھے علم سے قال و قیل
مجھے جز کشی تھی باین آب و تاب
کہ تھا بس میں اے یارو جزو کتاب

نہ چھٹتي تھي مجھہ سے کتاب ایک پل
که کرتا تھا مشکل مسائل کا حل
غرض شام سے صبح تک میں بکد
مطالعہ کناں تھا اے اهل خرد
لے اک ساتھہ آتے کا پھرا میں خام
علی الصبح پڑھنے کو جاتا مدام
پکا اوس کو تندور سے اور کہا
میں تاشام رهتا تھا پڑھتا سدا
مجھے بسکہ مقصد میاں علم تھا
میں تھا پیچھے باندہ اوس کے آتا پڑا
کبھو بھي میں ناغہ نکرتا سبق
بلا ناغہ پڑھتا ورق دو ورق

تذکرۂ شعراے هند میں لکھا هے - "ریختہ کہنے کا بہت شوق تھا اون کی مثنوي بھي ایک کہي هوئي هے - اور ایک دیوان موجود هے اور ایک تذکرہ شعراء هند کا حکیم ثناءالله خاں فراق طب میں اون کے شاگرد تھے"۔ تذکرۂ گل رعنا میں لکھا هے۔" دیوان دیکھنے میں نہیں آیا " نمونۂ کلام -

قاسم کے ساتھہ بادہ خوري تھي تمام شب
اور نام سے هے اوس کے تجاهل علے الصباح
سر بسر قول ترا اے بت خود کام غلط
دن غلط رات غلط صبح غلط شام غلط
دشنام دے منانے غو روٹھے کو آن میں
کیا جانے کیا فسون هے تمہاري زبان میں
مسلمانو! اوسے پروا هو کیا احیاء عاشق کي
وہ نصراني بچہ عیسیٰ نفس تو هے پہ کافر هے

جان جاوے یا رهے قاسم یہ دیکھینگے اوسے
ہے ارادہ یہ مصمم دیکھئے کیسے بنے

تذکرۂ قاسم کي عبارت سے معلوم هوتا هے که اون کے دیوان میں سات هزار شعر تهے - دیوان کے علاوہ دو مثنویاں تهیں - ایک مولانا روم کي مثنوي کي بحر میں؛ بیان معراج میں - دوسري مثنوي بوستان کے بحر میں؛ حضرت غوث‌اعظم کي کرامات کے ذکر میں - تیسری مثنوی غزوۂ بدر کے حال میں لکھنے کا ارادہ مصمم تها - میرے اس مقالے کا موضوع قاسم کي وہ مثنوي هے جس کا تاریخی نام "کرامات پیران پیر جہاں" هے - اس سے ۱۱۹۶ هجري برآمد هوتے هیں - یہ ایک ضخیم مثنوی هے - $\frac{۲۲}{۱۹}$ تقطیع- خط صاف جلي- شنجرفي آمیز؛ سطرفی صفحہ ۱۳ - صفحات ۳۰۴ -نسخہ کامل هے ۱۱۹۶ هجري میں تالیف شروع کي-چنانچہ دیباچہ میں لکھا هے-

شروع اسکي تحریر کي میں نے جب	تهے گیارہ سو چهہ‌یانوہ سال تب
هے تاریخ کا مصرع اے بخردان	کرامات پیران پیر جهان
هے اسکا یهي یعني نام سترگ	که رکهتا نهایت هے شان بزرگ

تالیف کے بعد عرصہ تک مسودہ جزدان میں رکها رها - ۱۲۱۷ هجري میں نظر ثاني کرکے صاف کیا - چنانچہ دیباچہ میں هے -

کہوں کیا یہ آغاز کے بعد پر	رها سالها طاق نسیان پر
بر آیا پس از سال اکیس کے	فرامش کري کے یہ جزدان سے
بتائید و توفیق رب‌الانام	اوسي برس اسکو هوا انصرام
رقم هوچکا جب تمام و کمال	هزار $\frac{۱۲۱۷}{\text{و دو صد اور هفدہ}}$ تها سال
یہ مصرع هے تاریخ کا دلپذیر	رموز کمالات پیران پیر[سنہ ۱۲۱۷ ھ]

بوستان کي بحر هے- مع دیباچہ ۱۰۵ (ایک سو پانچ) عنوان هیں- هر عنوان کے آخر میں فارسي کا ایک شعر شیخ سعدي وغیرہ شعرا کا

لکھا ہے - کل اشعار کي تعداد پانچ ہزار ایک سو ساٹھہ (۵۱۶۰) ہے - ہر ایک بیان کا عنوان بھي منظوم ہے - جسکي بحر اصل مثنوی سے جدا ہے - اس مثنوی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلاني رضی‌الله عنه کے حالات مبارک ہیں اور نسب و پیدایش سے لیکر آخر تک گیارہ باب باندھے ہیں - دیباچه میں حمد - نعت - منقبت آل و اصحاب - منقبت پیران پیر رضی الله عنه و منقبت حضرت مولانا فخرالدین ہے - مدح شاہ عالم بادشاہ - اور سبب تالیف و تاریخ و فہرست کتاب ہے - آخر میں مناجات مدح میر فتح علي خاں صاحب مدظله - مدح حضرت مولانا فخرالدین - مدح استاد سید احمد بوالحسن جانشین حضرت مولانا فخرالدین - مدح حضرت خواجه قطب‌الدین بختیار کا کي - مدح نواب نجیب‌الدوله بہادر - مناجات مکرر - تاریخ از حکیم ثناءالله خاں فراق و عبدالصمد فدا - ان دونوں کي تاریخونکي تقریب خود مولف مثنوی نے کی ہے -

یه نسخه امیرالدین ولد میر علیم نے ۳۰ رمضان سنه ۱۲۹۲ ھ میں لکھا ہے - کاتب کے قلم سے ۱۱۹۲ ھ نکل گیا ہے - جو ظاہر ہے که صحیح نہیں ہو سکتا - اسلئے که آغاز تالیف کتاب ۱۱۹۶ ھ میں ہوا تھا -

نمونه کلام

(حمد)

ہے یه توحید خدا میں داستاں گوش دل سے تم سنو اے دوستاں

* * *

کرے کیا کوئی حق کي مدح و ثنا سراسر وہ ہے نور ارض و سما
جہاں اوسکے جلوے سے معمور ہے ہراک پر نمایاں وہي نور ہے
بچھایا خلائق په فرش وجود کیا آپکو اون نے یعنی نمود
حقیقت میں دیکھو تو ہے ایک نور کیا ہے په سو سو طرح سے ظہور

کہیں ہے وہ لیلائے محمل نشیں　　بنا ہے عزیزو وہ مجنوں کہیں
کہیں ہے وہ شیرینِ شیریں سخن　　کہیں ہے وہ تیشہ کہیں کوہکن
کہیں بن کے موسیٰ کیا ہے ظہور　　کہیں ہے تجلی کہیں کوہ طور
کہیں ہے وہ بندہ کہیں ہے خدا　　کہیں ہے سفینہ کہیں نا خدا
وہی جسم آدم وہی روح تھا　　یہ طوفاں رہی تھا وہی نوح تھا
سکندر نہ تھا نے فریدون تھا　　نہ بقراط تھا نے فلاطون تھا

(نعت)

محمد کو سردار عالم کہا　　اوسے سید وُلد آدم کہا
یہ مقدور رکھتا ہے کوئی بشر　　کرے نعت اس کی جو وہ سر بسر
وہ احمد نبی خاتم المرسلیں　　کہ بندہ ہے جس در کا روح الامیں
سرشت اوسکی ہوتی نہ گر دوستاں　　نہ مخلوق ہوتے زمین و زماں
زباں کیوں نہو وصف میں اونکے لال　　کسیکا یہ ہے حوصلہ کیا مجال

(منقبت غوث اعظم)

ائمہ کے من بعد اے دوستاں　　ہزاروں ہوئے قطب و غوث زماں
ہر ایک کو دیا حق نے عالی مقام　　ہیں مقبولِ ذات مقدس تمام
ولے مرتبہ ہے ہر اک کا جدا　　کوئی انمیں چھوٹا ہے کوئی بڑا
سرے سب سے دیکھو گر انصاف کر　　کدورت سے سینے کو ہاں صاف کر
نہ پاؤگے جز غوث اعظم کوئی　　کہ سر دفتر اولیا ہو وہی
ہے دنیا میں نایاب اوسکا عدیل　　وہ یکتائے عالم ہیں بے قال و قیل
وہ ہیں بُلبلِ گلشن مصطفیٰ　　وہ ہیں سروِ بستاں آلِ عبا
وہ ہیں نور چشم حسن دوستاں　　حسین ابن حیدر کے آرام جاں
گدا اونکے کوچے کا ہے ہر ولی　　کہ ہیں وہ شہنشاہ ابن علی
توسل بن اونکے کوئی ذی کمال　　جو چاہے ہو واصل بحق کیا مجال
سعادت سمجھ سب نے اونکا قدم　　رکھا اپنی گردن پہ ملکر بہم

مگر ایک شیخ صفاهاں نے
که دی تھی دغا اوسکو شیطان نے

سو حق نے کیا اوسکا منصب تغیر
محقر هوا نزدِ برنا و پیر

رها اوسکے چهرے په مطلق نه نور
هر ایک اوسکو کهنے لگا دور دور

عزیزے که از در گهش سر بتافت
بهر در که شد هیچ عزت نیافت

(مدح مولانا فخرالدین)

پس از مدح سلطان کون و مکاں
شهنشاه جیلاں و قطب زماں

تو اے قاسم قادری باصفا
دل و جاں سے کر اوس ولي کي ثنا

که تها یار وه قبلهٔ راستیں
بلا شبه و شک فخر دنیا و دین

(مدح شاه عالم)

عجب هي با من و اماں هے یه عهد
تمامي خلائق هے آسوده مهد

نهو کیوں یه هے هند کا بادشاه
وه گردوں وقار و وه انجم سپاه

که هے آسماں جاه و کوه شکوه
فتوت دثار و مروت پژوه

مهین معدن جود و کان سخا
بهین منبع فیض و بذل و عطا

طرازندهٔ تخت ظل اللهي
فرازندهٔ تاج شاهنشهي

علم کهکشاں تخت نیلي فلک
سدا کوه زر بخش بے شبه و شک

که بذل هے سعدونحس اسکو ایک
که هے وه شهنشاه خود سعدونیک

مربع نشین و مثلث نشاں
نه تربیع و تثلیث گوهر فشاں ؟

مربي شرع و هوا خواه دیں
مددگار ارکان دین متیں

دل اهل درد و سرِ اهل شوق
جگر بند معنے صد شوق و ذوق

خدیو جواں بخت و فرخنده راے
شهنشاه گیتي و گیهاں خداي

خدا ترس و هشیار و والا نژاد
خوش آئین و خوش دین و خوش اعتقاد

موحد بجاں احمدي حیدري
حنیفي بدل اشعري قادری

حلیم و گنه بخش و مخلص نواز
دلیر و عدو مال و دشمن گداز

سر ربع مسکون و صاحب خبر
شه عالم و شاه عالي گهر

جہاں بان دوران و عالي جناب | بچرخ شہي رشک مہ آفتاب
نجوم سعادت سے باہم ملے | یہ خورشید رخشندہ یارب رہے
چھٹے کفر کا اس سے جلدي کسوف | بحق نبي اے رحیم و رؤف
رہے اس کے سائے کے نیچے سدا | خوشی خورم آسودہ خلق خدا
روا کر سدا اوسکي حاجات تو | رہے تیری رحمت سے یہ خندہ رو
برومند دارش درخت امید | سرش سبز وورویش برحمت سپید

اس مقالے کے ماخذ حسب ذیل کتابیں ہیں - تذکرۂ شعرائے ہند مولفہ منشي عبدالکریم دہلوي - تذکرۂ گلشن بیخار نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ - تذکرۂ مہر حسن - تذکرۂ آبحیات محمد حسین آزاد دہلوي - تذکرۂ گل رعنا مولوی سید عبدالحي صاحب - تذکرۂ قاسم بي عبارت کے لئے میں پروفیسر شیراني لاہور اور اونکے شاگرد مولوي عبداللطیف صاحب تپش کی عنایت کا ممنون ہوں - تذکرۂ خمخانہ جاوید لالہ سري رام ایم اے دہلوي - دیباچہ دیوان حافظ زکریا خاں زکي دہلوي -

دھلي میں اردو شاعری کا آغاز

از سید محی‌الدین قادري ایم - اے - پي - اچ ڈی (لندن)
پروفیسر اُردو جامعۂ عثمانیۂ حیدرآباد دکن

شمالي ھند اور خاصکر دوآبۂ گنگ و جمن جو ھمیشہ تہذیب و تمدن اور علم و فن کا سر چشمہ رہا ھے اُردو کے لئے صدیوں تک بنجر ثابت ھوتا رھا - اس کے اسباب نہایت دلچسپ اور اھم ھیں - ھم نے اپني مطبوعہ انگریزي کتاب "ھندوستاني صوتیات" میں اس پر کچھ بحث کي ھے مگر دھلي میں اُردو شاعري کے آغاز پر گفتگو کرتے وقت ضروري معلوم ھوتا ھے کہ اِن اسباب و علل کا ذرا وضاحت کے ساتھہ ذکر کر دیا جاے جنھوں نے شمالي ھند اور خاصکر دھلي کو اُردو شعر و شاعري اور تصنیف و تالیف سے عرصہ دراز تک محروم رکھا -

اُردو زبان کے آغاز کي نسبت یہ نظریہ اب روز روشن کي طرح عیاں ھوتا جاتا ھے کہ شمال مغربي سرحد سے جو مسلمان ھندوستان میں داخل ھوے وہ پہلے پہل پنجاب میں آکر ٹھہرے - وھاں کے باشندوں کے میل جول سے جو نئي مشترکہ ھندو مسلم زبان پیدا ھوتي رھی اُسي کو لیکر وہ دوآبہ میں اُترے اور اُسی کو بولتے ھوے گجرات اور دکن میں بھي داخل ھوے -

فتح دھلی سے قبل مسلمان پنجاب میں قریب دو سو سال تک رھے اور یہ عرصہ ایک نئي زبان کے آغاز کے لئے نا کافي نہیں ھے - وھاں جو زبان تیار ھوئی تھي اُس میں لاھور کے ایک درباري فارسي شاعر مسعود سعد سلمان نے طبع آزمائي بھي کي تھي مگر افسوس ھے کہ اس کا کلام آج ناپید ھے - اور اس کے متعلق سواے عوفي اور خسرو کے

بیانات کے کوئی اور معلومات حاصل نہیں - اگر قدیم دکنی اور گجراتی کتابوں کی طرح مسعود کا یہ دیوان ہندوی بھی آج دستیاب ہوجائے تو اُردو کی آغازی تشکیل کی نسبت بہت کم گتھیاں باقی رہجائیں -

جب مسلمانوں نے سنہ ۱۱۹۲ھ میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کرلی تو وہ اُسی زبان کو لیکر راجدھانی میں داخل ہوے اور دہلی اور اس کے مشرقی علاقہ یعنی سر زمین برج میں آباد ہوگئے جو پنجاب میں بن رہی تھی اور ابھی خام حالت میں تھی - فاتحین کے ساتھہ ہریانی یا بانگرو (مشرقی پنجاب) علاقہ کے سیکڑوں باشندے بھی غالباً ملازمین اور بھیروبنگاہ کی حیثیت سے چلے آئے - جس کی بنا پر آج اُردو زبان میں مشرقی پنجابی یا ہریانی عنصر جگہ جگہ نظر آتا ہے -

برج کے علاقہ میں اس عہد میں جو زبان بولی جاتی تھی اُسے برج بھاشا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - اسی زبان میں امیر خسرو نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا جو مسعود کے ہندوی دیوان کی طرح آج ناپید ہے - مگر خسرو کا کچھہ ہندوی کلام سینہ بسینہ محفوظ چلا آیا جس میں اگرچہ بعد کے زمانوں میں لفظی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکے گا کہ وہ خسرو ہی کی یادگار ہے -

سر زمین برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی تھی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں پڑ سکا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رخ کیا اور ان کا ایک بڑا سیلاب محمد تغلق کے ساتھہ دہلی سے اُٹھا اور دکن میں جاکر رک گیا - یہ فاتحین اپنے ساتھہ جو زبان دکن میں لیتے گئے وہ وہاں آزاد نشوونما حاصل کرنے لگی اور چونکہ برج بھاشا کی سرحد سے دور جاپڑی تھی اس لئے اُس میں برج کا صرف

وهي اثر باقي رها جو سر زمين برج سے نکلنے سے پہلے اس پر مستولي هوچکا تها۔

جو مسلمان دوآبه هي ميں رهگئے اُن کی وه خام‌هندوي جو مشرقي پنجابي اور هند ايراني عناصر سے مرکب تهي رفته رفته برج سے متاثر هوتي گئي اور آخرکار اِس رنگ ميں اتني رنگي گئي که دو تين صديوں هي ميں بول چال کے لئے برج بهاشا کي جانشين بن گئي – اور برج کو ايک تحريري اور ادبي شان حاصل هوگئي –

اِس سلسله ميں اس واقعه کا اظهار دلچسپی سے خالی نه هوگا که دوآبه ميں زبانوں کا ارتقا عجيب و غريب مگر باضابطه رها هے – ابتدا ميں ويدی زبان آرياؤں کي عام بول چال کي زبان تهي چنانچه اُسي ميں مذهبی مقدس کتابيں مرتب هوئيں – مگر ايک عرصه کے بعد يه زبان عام طور پر مستعمل نهيں رهي – اسوقت سنسکرت رائج هوگئي – سنسکرت ميں بهي مذهبي اور ادبی تصنيفات مرتب هوئيں چنانچه دو تين سو سال کے بعد وه بهي عام گفتگو کي زبان باقي نه رهي – کيونکه عوام هميشه اپني زبان ميں اپني ضرورتوں اور نئے نئے حالات کے ماتحت صوتي اورمعنوي تغير کرتے رهتے هيں – چنانچه اسوقت عوام کي زبان کو پراکرت کها گيا اور سنسکرت جو اب ادبي يا علمي زبان تهي محض برهمنوں اور عالموں تک محدود رهي –

پراکرتيں بهي چار پانچ سو سال تک رائج رهيں اور اِن ميں بهي گيت اور نظميں لکهي گئيں مگر جب مرور ايام کے ساتهه ان ميں تبديلياں هونے لگيں تو اس تغير يافته عام گفت و شنيد کي زبان کو بهاشا کها گيا چنانچه علاقهٔ برج ميں جو بهاشا بولي جاتي تهي وه برج بهاشا کهلائی –

برج بهاشا پهلے يعني مسلمانوں کے اوائل عهد ميں عام بول چال کي زبان تهي مگر مسلمانوں کي حکومت کے قيام کے سو ڈيڑه سو سال بعد

اُن کی لائي هوئي زبان کے ساتھہ مل جل کر وہ بھی متاثر هونے لگي اور آخرکار دهلي اور سر زمین برج کے باشندوں میں خواہ وہ مسلمان هوں که هندو جو زبان عام طور پر بول چال اور کاروبار کے لئے مستعمل هوگي وہ بھی هندوستانی هے جس کو آج هم اُردو کہتے هیں - مگر اورنگ زیب سے پہلے تک هندوستان خاص کي تحریري اور علمي اگر کوئي زبان تھی تو وہ برج بھاشا هی تھي - " هندستاني " عوام کي بازاري زبان تھي اور اس میں لکھنا پڑھنا معیوب تھا - چنانچہ اس زمانہ میں هندستان خاص میں اگر کسي مسلمان نے هندوي زبان میں لکھنا بھي چاها تو اس نے برج هي میں لکھا جو اُس عہد کے هندوؤں کي علمي و ادبي زبان تھي -

اسکے مقابلہ میں دکن کي حالت پر غور کیجئے تو معلوم هوگا که وهاں برج بھاشا کي طرح کوئي دیسي زبان ایسي نه تھي جو وهاں کے هندوؤں اور مسلمانوں کي مشترکه علمي یا ادبي زبان قرار دیجاسکتي - دکن میں یا تو دراویڈي زبانیں تھیں یا مرهٹي - اور یہ زبانیں اُس هندستاني زبان کو کوئي اصولي یا اهم فائدہ نهیں پہنچا سکتي تھیں جو مسلمانوں کے ساتھہ دکن میں گئی اور آزاد نشوونما حاصل کررهي تھي - اِسکے علاوہ یہ دیسی زبانیں برج بھاشا کي طرح دکن کے هندوؤں کی اعلے ادبی اور علمی زبانیں بھي نهیں تھیں - اُسکا نتیجه یہ هوا که دکن کے مسلمان یا تو فارسي میں لکھتے یا اپني اُس هندستاني میں جو اُن کے همراہ آئي تھی اور ان کي حکومت کے ساتھہ ساتھہ ترقي کرتی جارهي تھي -

دهلي میں اُردو شاعري کے مقابلۃً دیر میں شروع هونے کي یہ سب سے بڑي وجہ تھي - مگر اس کے سوا دو چار سیاسي اسباب بھی هیں جنھوں نے ایک طرف تو دکن میں هندستاني کو تصنیف و تالیف

کے لئے مقبول بنا دیا اور دوسري طرف هندستان خاص کو اس نعمت سے بري طرح محروم کردیا -

دکن کي سلطنتوں کے باني، شمالي حکمران سلسلوں کے بانیوں کي طرح نووارد ترکي یا افغانی نہیں تھے - دهلي میں قطب‌الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک جتنے شاهي خاندان گذرے سب یکے بعد دیگرے اُن شمال مغربی حملہ آوروں میں سے تھے جن کي زبانیں هندستان کے لئے اجنبي تھیں - دکني سلطنتوں کے بانی وهي تھے جو دکن یا هندستان میں ایک مدت سے مقیم تھے هندستاني زبان و طرز معاشرت سے مانوس تھے - دکن کي پہلي سلطنت بہمنیہ کے بانی حسن کي نسبت تو هر شخص جانتا هے کہ وہ ایک برهمن کا غلام تھا - اُسکا هندستاني نہ جاننا اُسی طرح تعجب خیز هے جس طرح تیمور کا هندستاني سے واقف هونا -

بہمنیہ کے زوال کے بعد جب دکن میں جدا جدا حکومتیں قایم هوئیں تو اُن کے بانی بھی اکثر وهي تھے جو بہمنیہ دربار میں بچپن سے پرورش پاچکے تھے اور جنکا هندستاني سے ناواقف رهنا محال تھا - سلطنت احمد نگر کا بانی تو خود ایک نو مسلم تھا - قدیم فارسی تاریخیں شاهد هیں کہ وہ کنڑی اور هندوی (یعنی اُس عہد کي اُردو) کا اچھا ماهر تھا - عادل شاهي خاندان کي پہلي ملکہ ایک طاقتور مرهٹہ امیر مکند راؤ کی لڑکی تھي - اس کے بطن سے یوسف عادل شاہ کے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا هوا - لڑکا اسمعیل عادل شاہ تھا جو باپ کے بعد بادشاہ هوا اور جسکی اولاد نے آخر تک بیجا پور پر بادشاهت کي - تینوں لڑکیوں میں سے هر ایک کسی نہ کسی دکنی بادشاہ سے بیاهی گئي مثلاً مریم سلطان، برهان نظام شاہ والي احمد نگر سے؛ خدیجہ سلطان، علاؤالدین عماد شاہ والي برابر سے، اور بی بی ستی سلطان، محمود شاہ بہمنی کے لڑکے سے بیاهي گئي -

مکت راؤ کي لڑکی پوجی خانم کے علاوہ عادل شاهي خاندان میں اور بھي هندو رانیاں جلوبی هندو ریاستوں سے حاصل کی گئي تهیں - ان میں رنبها رانی کا نام خاص طور پر قابل ذکر هے جس نے محمد عادل شاہ جیسے جلیل‌القدر حکمران کا دل موہ لیا تھا اور جسکي خاطر بادشاہ نے اپنے مشهور و معروف آثار محل میں جو نقش و نگار تیار کرائے تهے - وہ آج تک بیجاپوری ذوق فنون لطیفه کي یاد تازہ کر رهے هیں -

حکمران سلسلوں کے بانیوں کے علاوہ شمال کے بالعموم تمام بادشاهوں کي زبان فارسي یا کوئي اور بیروني زبان تهي محمد تغلق سے محمد شاہ تک دهلي کے کسي بادشاہ نے هندستاني میں نہ نثر لکهي نہ نظم-اس کے خلاف دکن میں کئي بادشاہ مثلاً قطب شاهیوں میں محمد قلي ، محمد، عبدالله اور ابوالحسن ، اور عادلشاهیوں میں ابراهیم ثاني ، علي ثاني اور سکندر ایسے گذرے هیں جن کي هندستاني نظم و نثر اِس وقت بهي موجود هے-

بادشاهوں کي بے توجهي کے علاوہ شمالي سلطنت کے امرا اور علما و فضلا بهي هندستاني زبان کے ذوق سے عاري تهي - انپر همیشه فارسي اثر غالب رها - اس کي وجه یه تهي که جب کبهي ترکستان ، ایران ، یا افغانستان میں کوئي سیاسي انقلاب هوتا یا تباهي آتي تو وهاں کے باشندے پناہ لینے کے لئے یا تلاش معاش کي خاطر هندستان هي کا رخ کرتے - چنانچه آئے دن ان کي ٹکڑیاں هندستان میں داخل هوتي رهتي تهیں اور چونکه دهلي کے امیروں اور قدر دانوں کے دسترخوانوں کي وسعت میں اسوقت تک کوئي کمي نہیں هوئي تهي اس لئے سب کے سب وهیں جم جاتے اور چونکه یہاں رهنے والے اِن نوواردوں کے مقابله میں بالخصوص جهانتک زبان و محاورہ کا تعلق هے اپنے تئیں کم درجه سمجهتے تهے اِس لئے یه اُنکا احساس پستي (Inferiority Complex) نوواردوں کو سرکار و دربار میں بڑے بڑے رتبے حاصل کرلینے کا موقع پیدا کردیتا -

اِن خانگی در آمدوں کے علاوہ شمال مغرب کی جانب سے اکثر حملے بھی ہوا کرتے تھے جن کا سلسلہ احمد شاہ درانی کے پانچویں حملے (۱۱۷۵ھ) تک برابر جاری رہا - یہہ تمام حملہ آور غیر زبانیں بولتے تھے -

سیاسی مداخلتوں کے سوا علمی و ادبی فضا میں بھی ہروقت ایرانی اثر غالب رہتا تھا - شاہی درباروں سے محمد شاہ کے زمانہ تک بالعموم تہمت ایرانی شاعر اور عالم گراں بہا صلے حاصل کرتے رہتے تھے - پردیسی شعرا کی قدر و منزلت میر و سودا کے زمانہ تک جاری تھی - فارسی گو امیروں اور عالموں کی اِس آۓ دن کی درآمد اور اقتدار و اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں فارسی دانی عام اور لازمی ہوگئی - اگرکبھی مہلت پاکر فارسیت کا پیدا کیا ہوا زخم مندمل بھی ہونے پاتا تو پھر فارسی زبان بولنے والوں کا ایک ایسا حملہ ہوتا کہ وہ زخم از سر نو ہرا ہو جاتا - اِس طرح سے شمال کے شاعر ہندستانی میں شعر وشاعری کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوسکے -

دکن؟ فارسی گو ممالک سے نسبتہً دور تھا - یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں ایرانی نہیں گئے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں بادشاہ اور اُمرا بھی دیسی یعنی ہندستانی زبان استعمال کرتے ہیں تو انہوں نے بھی اس کے استعمال کو اپنے لئے باعث ننگ و عار نہیں سمجھا-اسکے علاوہ تاریخیں ثابت کرتی ہیں کہ دکن کے علما زیادہ تردیسی ہی ہوتے تھے اور جو دیسی نہوتے وہ دیسیوں کی تفہیم کی خاطر دیسی زبان ہی میں لکھنے کی کوشش کرتے - اس کی واضح مثالیں حضرت خواجہ بندہ نواز اور میراں جی شمس العشاق کی بزرگ ہستیوں کے علاوہ عبدل؟ مصنف ابراھیم نامہ کی شخصیت بھی ہے جو دراصل دہلی کا رہنے والا تھا اور اُردو شعر و سخن کی قدرو منزلت کی شہرت سنکر بیجا پور پہنچ گیا تھا -

غرض جیسا کہ اس مضمون میں پہلے بھی بیان کردیا گیا ھے شمال پرفارسي کا رنگ گہرا چڑھتا گیا اور نہ صرف مسلمان بلکہ ھندو بھي اسي میں تصنیف و تالیف کرنے لگے - اگر کبھي مسلمان چاھتے بھی کہ ھندؤں سے قربت حاصل کریں اور اُن کی زبان میں لکھیں تو وہ برج بھاشا میں لکھتے تھے جیسا کہ اکبر اعظم کے عہد میں عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ نے کیا تھا - کیونکہ وھی وھاں کی دیسي علمي اور ادبي زبان سمجھي جاتي تھي-اور ''ھندستانی'' بول چال کي ایک عام مشترکہ زبان تھي- اس سے ھندؤں کو اتناھي تعلق تھا جتنا مسلمانوں کو تھا نہ اس میں ھندو لکھنا پسند کرتے تھے اور نہ مسلمان، اسکے مقابلہ میں دکن میں اگر مسلمان، دیسیوں کي زبان میں لکھنا چاھتے تو یہ اُن کے لئے دشوار امر تھا اور جیسا کہ بیاں کیا جا چکا ھے وھاں رعایا کي کوئي ایک معین علمي و ادبي زبان برج بھاشا کي طرح موجود نہیں تھي ان کے لئے صرف ایک ھي چارۂ کار تھا - یعلي ھندستاني میں لکھنا - چنانچہ یہي وہ زبان ھے جوآج بھی نہ صرف دکن کے ھندوؤں اور مسلمانوں بلکہ وھاں کے جدا جدا زبانیں بولنے والے افراد کا مشترک ذریعۂ گفتگو قراردیجاسکتي ھے -

نتیجہ یہ نکلا کہ اُدھر دکن مجبور تھا اُردو زبان میں لکھنے کے لئے - اور اِدھر ھندستان خاص اُردو کو حقیر سمجھنے اور اس میں تصنیف و تالیف کرنے کو معیوب قرار دینے کے لئے - یہي وجہ ھے کہ آج ھمیں دکن کے بیسیوں بلند مرتبہ شاعروں کے قدیم اور قابل وقعت شہ کارے دستیاب ھوگئے ھیں اور آئے دن ھوتے جارھے ھیں حالانکہ شمال میں اورنگ زیب سے پہلے باضابطہ اُردو تصنیف وتالیف کا پتہ تک نہیں چلتا -

کچھہ دنوں سے یہ خیال پیدا ھوچلا ھے کہ شمالي ھند کے بھي قدیم اُردو کے نمونوں کا پتہ لگایا جاے - مگر اب تک کم کامیابي ھوئي ھے -

اس سلسلہ میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی اُن تحقیقات کا ذکر نہ کرنا خون انصاف کرنا ہے جو اوریئنٹل کالج میگزین میں شمالی ہند کی قدیم اُردو پر شایع ہورہی ہیں - مگر ان کا مطالعہ بھی اسی خیال کو ثابت کرتا جارہا ہے کہ دکن کی طرح شمال کو اس زبان کی علمی و ادبی سرپرستی کرنے کے موقعے حاصل نہیں ہوے - یہ اور بات ہے کہ وہاں یہ زبان عام طور پر رائج تھی اور عوام کے علاوہ بعض بادشاہ اور امرا و فضلا بھی اس سے واقف تھے - چنانچہ اُن کے متعدد اُردو جملے اور الفاظ فارسی کتابوں میں نظر سے گذرتے ہیں -

عہد اورنگ زیب سے پہلے کے جن شمالی شاعروں کی نسبت اس وقت تک علم حاصل ہوا ہے وہ سعدی اور نوری ہیں - پہلے شاعر کی صرف ایک غزل دستیاب ہوئی ہے اور دوسرے کا محض ایک شعر - ان کے متعلق تفصیلی اور یقینی معلومات بھی اس وقت تک حاصل نہیں ہوے - دونوں غالباً اکبر اعظم کے ہم عصر ہیں - اول الذکر کو بعض بزرگوں نے سعدی شیرازی سمجھہ لیا ہے حالانکہ وہ ایک ہندستانی شاعر تھا - اس کی مشہور و معروف غزل کی زبان ظاہر کرتی ہے کہ وہ شمالی ہند میں لکھی گئی ہے اس پر ایک طرف تو برج بھاشا کا مخصوص اثر ہے اور دوسری طرف فارسی کا۔اس عہد کی دکنی تصنیفات کی زبان؟ اس قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے- چنانچہ سعدی کی غزل کے تین شعر اور اس کے ایک ہمعصر گولکنڈہ کے شاعر وجہی کی غزل کے تین شعر یہاں تقابلی مطالعہ کے لئے نقل کئے جاتے ہیں - سعدی کے شعر ہیں :—

قشقہ چودیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے
گفتا کہ در رے باورے اس ملک کی یہ ریت ہے

ہملا تسہن کوں دل دیا تم دل لیا اور دکھہ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلا کیا پیت ہے

سعدی بگفتا ریختہ، در ریختہ دُر ریختہ
شیر و شکر آمیختہ، ہم ریختہ ہم گیت ہے

اس عہد کے دکن کے اُردو شعر یہ ہیں :—

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آیل رے پیا
تجھہ بن مجھے جینا بہت ہوتا ہے مشکل رے پیا
ملجہ تُئیں تیش جانے تُہیں، ملجہ تہارجیو لانے تُہیں
مُلج دل مند ہر میانے تہیں، کیتا ہے منزل رے پیا
تو جیومیوا میں سو دل، تجہ سات رہنا کیوں نہ مل
دن رات میں مَیں ایک تل، نہیں تجھہ تے غافل رے پیا

نوری کا صرف ایک شعر فی الحال دستیاب ہوا ہے - اس کا اسلوب بھي سعدی سے ملتا جلتا ہے :—

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بے چارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

اس شاعر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دہلی کے ملک الشعرا فیضی کا دوست اور قاضي اعظم پور کا لڑکا تھا - بعض مصنفین کا خیال ہے کہ عبدل؟ مصنف ابراہیم نامہ کي طرح، نوری بھی ابراہیم عادل شاہ کي معارف پروری کي شہرت سنکر بیجاپور گیا تھا-چنانچہ وہاں کی اُردو مرثیہ نگاری کي اُس نے قابل ذکر خدمت کي ہے - مگر یہ بیان ابھي تحقیق طلب ہے -

ان دو شاعروں کے بعد، اورنگ زیب کے معاصر، شمالي اُردو شاعروں، افضل اور جعفر، کا تذکرہ بھي ضروري ہے -یہ عجیب بات ہے کہ ان کي زبان کی خصوصیات بھي متذکرہ شاعروں کي خصوصیتوں کے مشابہ ہیں -

محمد افضل، میرٹھہ کے قریب جھنجھانہ میں پیدا ہوئے - اور ۱۱۰۰ ھ کے لگ بھگ برج بھاشا کي نظموں کے اسلوب میں ایک

هندستاني بارہ ماسه لکھا جو بکٹ کہاني کے نام سے مشہور هے - اس کي زبان، دکن کي هندستانی سے خاص طور پر مختلف هے - هم یہاں اس کے اور اس کے ایک معاصر گولکنڈہ کے اُردو شاعر، طبعي کے اشعار زبان و نہج زبان کے مطالعه کے لیے پیش کرتے هیں - افضل لکھتا هے -......،

سکھي رے چیت رُت آئي نواهي
اجھوں امید میري بر نیاهي

بعالم پھولهاں پھلواریاں سب
کرے سیراں پیا سنگ ناریاں سب

سکھي یه رت مجھ ناگن دست هے
پھروں بَوري تمامي، جگ هست هے

اري میں عشق سوں ڈرتي پروں تھي
نصیحت میں اپن سوں یوں کروں تھي

که پلچھي سوں لگن هرگز نه کیجے
ارے دل دے هزاراں غم نه لیجے

جلهوں نے دل مسافر سوں لگایا
انھوں نے سبه جلم روتے گلوایا

به بیں حالم صبا بھر خدا ري
پیا کوں جاسدا باتے هماري

اگر باشد خطا هم بخش دیجو
خبر میري سویرا آئے لیجو

دکن کے اُردو شاعر طبعي نے بهرام کے سوال اور گل‌اندام کے جواب میں اِسي زمانه میں یه شعر لکھے هیں :-

هوا مجلوں برہ تے سدہ گلوا میں
اتھا دانا سو دیوانه هوا میں

تجھے دل میں چھپایا ہوں اپس کے
خرابے میں لگایا ہوں دیوا میں
اُچایا ہوں ترے غم کے پہاڑاں
عجب ہے نہیں سیلہ پھٹکر موا میں
مجھے کیا دیکھتی ازما گل اندام
پرانا ہوں نہیں عاشق نوا میں

گل اندام کا جواب :—

تجھے حاصل نہیں ہے مجھ تے بن غم
نکو کر غم میں اپنا پانو محکم
ترا دل ہو گیا پھوڑا دکھوں تے
نہیں اس زخم کا مجھ پاس مرہم
مرا پانوں پہ سر تیرا نہ اپڑے
کرے کھن کی نمن گر تو کمر خم
نپاکا اِس چمن میں تے تو میوہ
ہوا کوتہ سخن واللہ اعلم

افضل کے بعد میر جعفر علی کا نام قابل ذکر ہے - یہ شاعر کئی سال شہزادہ کام بخش کے ساتھہ' دکن میں رہ چکا ہے - چنانچہ اس کے مجموعۂ کلام میں شمالی اور دکنی دونوں رنگ کی نظمیں موجود ہیں - حسب ذیل نظم میں وہی ریختہ پن ہے جو سعدی' نوری اور افضل کے کلام میں جھلک رہا ہے - جعفر' اورنگ زیب کی مدح میں لکھتا ہے :—

زہے دھاک اورنگ شاہ ولی
در اقلیم دکھن پڑی کھل بلی
دریں پیر سال و ضعیف بدن
مچائی دھما چوکری در دکن

زھے شاہ شاھاں کہ گاہ وغائے

نہ ھلا نہ تلا نہ جنبد زجائے

کمر بستہ ھشیار میدان پر

شب و روز طیار کھمسان پر

اس کے مقابلہ میں جعفر علي کے حسب ذیل شعر ملاحظہ کیجئے تو معلوم ھوگا کہ اس پر دکن کے قیام اور وھاں کے اُردو شاعروں کے مطالعہ کا کچھہ نہ کچھہ اثر ضرور ھوا تھا ۔ اس کي ایک مثنوي سلوک سے چند شعر نقل کئے جاتے ھیں ۔

ارے من باورے اب سو ونا کیا

رسیلے نینوں بن دن کھونا کیا

بوڑھاپا آگیا جوبن گیا بھاگ

اندھیري رین میں لٹکن لگے ناگ

نہ تو رھیگي نہ یہ پنجرا رھیگا

بولا کر لال تجھہ سے کیا کہے گا

جو پوچھے بات تجھہ کون لال پیارا

کہ پنجرے بیچ تُمیں کیا کیا سنوارا

بھیانی رات تجھہ کو سووتي ھے

بھیاناں دن تجھے دکھہ رووتي ھے

سجن سے آج توں رلیاں منا لے

رنگیلے سیج پر کلیاں بچھا لے

وگر نہ کیا بھروسہ اس پون کا

یکا یک آئے پہنچے دن مرن کا

اندھیري گور میں دیا نہ باتي

یکایک چل بسے سنکھي سنگاتي

بیا جعفر توکل پر قدم رکھہ

خدا کی یاد دل میں دم بدم رکھہ

جعفر، پہلا شمالی شاعر ھے جو دکن کے اُردو کار ناموں سے متاثر ھوا تھا اور جس کے کلام میں فارسی اور برج کی بے تناسب آمیزش نہیں پائی جاتی - مگر چونکہ اس کا زیادہ تر وقت، زٹل اور ھزل گوئی میں صرف ھوتا تھا، وہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کے نمونے اپنی یادگار چھوڑ نہ سکا۔

مگر اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد، شمال اور دکن میں ملاپ ھو جانے کی وجہ سے، شمال کے لوگ دکن اور دکن کے شمال، آنے جانے لگے۔ اس اختلاط نے ان دونوں میں اپنی زبانوں کے اختلاف کا احساس پیدا کیا - چونکہ دکن کے اھل قلم نے اپنے اسلوب میں بہت کچھہ ادبی کام کیا تھا شمال کے شاعروں نے معلوم کیا کہ ھم بہت پیچھے رہ گئے ھیں - اور اپنی گفتگو کی زبان کی علمی سر پرستی کی طرف، بالکل توجہ نہیں کی - جعفر علی کا کلام تو خیر اِسی دور اِختلاط اور اسی اثر کا نتیجہ تھا مگر اس کے علاوہ اور دو تین شاعروں کے جو نمونے ھم نے ابھی پیش کئے ھیں انھیں قدیم اُردو تذکرہ نویس، سنجیدہ اور صحیح اُردو شاعری نہیں سمجھتے - ان کا خیال ھے کہ تفنّن کے طور پر شاعری کی گئی تھی -

مرزا معزّ موسوی خاں فطرت ؟ عہد اورنگ زیب کے ایک فارسی شاعر ھیں ان کا یہ اُردو شعر تذکروں میں ملتا ھے -

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ھے

در خانۂ آئینہ گھٹا جوم پڑی ھے

مرزا معز کے ساتھہ ایک اور شاعر، قزلباش خاں امید، کے بھی اردو شعر ملتے ھیں جن کا ایک نمونہ یہ ھے -

بامن کی بھٹی آج مری آنکھہ موں پڑی

غصہ کیا و گالی دیا اور دکر لڑی

اس طرح کے فارسي شاعروں میں، جنھوں نے دو چار شعر اردو میں بھي لکھے ھیں، شاہ سعد اللّٰہ، گلشن اور عبدالقادر، بیدل کے نام بھي گنائے جا سکتے ھیں - یہ اور ان کے بعد کے دوسرے فارسي شاعروں نے جب دیکھا کہ دکن میں اردو شعر گوئي کا ذوق ترقي کر چکا ھے اور وھاں بڑي بڑي کتابیں لکھي گئي ھیں تو وہ شوق سے دکنی ادب کي طرف بڑھنے لگے اور چونکہ اس اثنا میں فارسي شاعري سے اُکتا گئے تھے، ایک غیر ملک کي زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے، انھیں کافی محنتیں کرنی پڑتي تھیں اور اس کے بعد بھی وہ ایراني شاعروں کے مقابلہ میں اپنے تئیں کمزور پاتے تھے - فارسی اب اُن کی اپني زبان نہ رھي تھي - وہ اپني طرف سے ادائے خیال کے نئے نئے طریقے اختیار کرنے سے قاصر تھے چنانچہ وہ ایسا کرتے بھي تو اھل زبان معترض رھتے تھے -

دوسري وجہ یہ ھے کہ فارسي کي قدر کرنے والي سلطنتیں کمزور ھوتي جا رھی تھیں - حکمرانوں میں اس کا پہلا سا ذوق باقي نہ رھا تھا - اس کے علاوہ چونکہ فارسي میں ھندستاني شاعروں کے لیے خیالات ادا کرنے کے نئے نئے طریقے مسدود تھے اور وہ اپني مقامي خصوصیات، اپنے فارسي کلام میں بےدھڑک نہیں ظاھر کر سکتے تھے، اسلئے جب انھوں نے دکنی اُردو کا مطالعہ کیا جو ان کے لیے فارسي سے زیادہ قریب تھي اور جس کے ذریعہ سے ان کے فطری رجحانات ظاھر ھو سکتے تھے تو انھوں نے فارسی کو ترک کرنا شروع کیا - یہ بیزاري اس حد تک پہنچی کہ جب سودا یا میر جیسا کوئی بڑا شاعر، فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے کہ وہ اپنے رتبہ سے اتر کر یہ کام کر رھا ھے -

شمالی ھند میں اُردو شاعری کی ابتدا اور فارسي کے ترک کرنے کا سبب؟ میر نے شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ھے -

خو گر نہیں کچھہ یونہی، ھم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا؟ باشندہ دکن کا تھا

اس زمانہ میں دکن کے جو اُردو شاعر، شمال گئے ان کی تعداد میں (جیسے جیسے اُردو کے تذکرے دستیاب ہوتے جا رہے ہیں) اضافہ ہوتا جاتا ہے - ایک مصحفی ہی کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ، اُردو شاعر، دہلی گئے تھے جہاں انہوں نے قدر و مقبولیت حاصل کی - تذکرہ اعظم الدولہ، سرور سے بھی اس بارے میں اچھا مواد حاصل ہوتا ہے -

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں شمال کے تیس کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جو دکن گئے تھے -

یہ تو شاعروں کا ذکر تھا - اس زمانہ میں دکن کی بہت سی اُردو کتابیں بھی شمال پہنچیں - چنانچہ شاہان اودہ کے کتب خانوں میں دکن کی معتدبہ اُردو قلمی کتابیں جمع ہوگئی تھیں - "اسپر نگر" کا کتلاگ ان کے تذکروں سے معمور ہے - یہ واقعہ اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ دکن کے اُردو ادب نے، شمال میں کس درجہ مقبولیت حاصل کرلی تھی - اس کی شہادت اس طرح سے بھی ملتی ہے کہ یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکھنی مخطوطے، محفوظ کرلیے گئے ہیں اُن میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب، شمالی ہند کے باشندے تھے اور جنھوں نے محمد شاہ کے اوائل عہد میں دکن کی ان اُردو کتابوں کو نقل کیا تھا -

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی مجلسوں میں دکن کے اُردو اشعار، دلچسپی سے سنے جاتے تھے اور دکنی شاعروں کی آوبھگت ہوتی تھی - ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دہلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نہیں بھرا - ایک غزل میں لکھتے ہیں-

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین

جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دهلي کے شاعر، ولي کي غزلوں کي تقلید میں غزلیں لکھتے اور انھي کے شعروں سے اپنے مشاعروں کے لئے مصرع طرح حاصل کرتے تھے - اگرچہ اب تک شمال کے اس زمانہ کے اُردو شاعروں کے کلام، عام طور پر دستیاب نہیں ہوے ہیں، تاہم دیوان زادہ حاتم سے اس کے ثبوت ملتے ہیں - دیوان زادہ اس عہد کي تنہا محفوظ یادگار ہے - اس کا نفیس اصلي نسخہ، انڈیا آفس میں موجود ہے - چنانچہ راقم نے اس کو مرتب کرکے شایع کرنے کا سامان مہیا کردیا ہے -

دیوان زادہ کے دیباچہ میں حاتم نے ولی کي استادی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں انھي کي طرز میں لکھتا ہوں - اس کے علاوہ اپنی غزلوں میں ولی کي استادي کا ذکر کرتے ہیں - ان کے اِس مختصر انتخاب کلام میں بھي تیرہ غزلیں ایسي ہیں جن پر صراحت کردی ہے کہ یہ ولي کي زمین اور تقلید میں لکھی گئي ہیں - بعض شعروں میں وہ ولي سے مخاطب بھي ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ولي کي موجودگي هي میں لکھے گئے ہیں - اس ضمن میں مزید معلومات ، میرے اس مضمون میں درج ہیں جو شاہ حاتم پر ہندستاني کے گذشتہ نمبر میں شایع ہوچکا ہے -

تذکرۂ قاسم میں ولی کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانہ کے ایک شاعر کا مصرعہ اپنے خیالات کي شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے - لکھا ہے "پیر خاں کمترین، کہ خدایش بیامرزد، بسیار بموقعہ و بجا گفتہ کہ

ولي پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں "

اس زمانہ کي ایک اور تصنیف "تذکرۂ بے جگر" میں ، جس کا خود مصنف کا لکھا ہوا مخطوطہ، انڈیا آفس میں موجود ہے ، ولي کي نسبت لکھا ہے :—

"در حقیقت کسے کہ اسپ در میدانِ ہندی دوانید آن بود، و فی الواقع شخصے کہ آبِ رفتہ، باز در جوے ایں زبانِ ہندی رسانید، ہمان بود - چوں در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی، دیوانِ او بدہلی رسید، موزوں طبعانِ بلند فکر و عالی تلا شانِ ہم عصر، مثل حاتم وآبرو و فغاں وغیرہ بہ تتبع زبانش پیرو و ہمزبان شدند"

ایک اور تذکرۂ طبقات سخن میں آبرو کے ذکر میں لکھا ہے کہ :—

"چوں دیوانِ ہندئی شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بدہلی رسید، تتبع آں شد"

مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندوی میں حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے دہلی میں اُردو شاعری کے آغاز پر روشنی پڑتی ہے - حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں :—

"روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ درسنہ دویم فردوس آرام گاہ، دیوان ولی در شاہجہان آباد آمدہ، و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ - بادو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد، بنائے شعر ہندی را بایہام گوئی نہادہ، دادِ معنی یابی و تلاشِ مضامین تازہ میداد یم"

ولی کے علاوہ، دکن کے جن اُردو شاعروں کے کلام نے دہلی میں شہرت حاصل کی، ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی بھی شامل ہیں - میر حسن، اپنے تذکرہ کے آغاز میں یہ لکھنے کے بعد کہ "باید دانست کہ ریختہ اول از زبان دکنی است" فقیر اللہ آزاد کا حال لکھتے ہیں اور پھر اُس کی شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں :—

"همراه فراقي دکني در شاهجهان آباد آمده بود، طبع

درد مندے داشت و بسيار بصفا حرف مي زند -

خدايش بيامرزد -"

غرض ان اسباب اور حالات کے نتيجه کے طور پر دهلي ميں اُردو شاعري کا آغاز هوا - اور فارسي کا اثر کم هونے لگا - چونکه دکن کے اُردو کلام کے اثر سے ابتدا هوئي تهي اس لئے اول اول دکني طرز کي پيروي کي گئي - اس کے خلاف لکهنے والے کي شاعري غلط سمجهي جاتي تهي - چنانچه اس آغازي دور کے ایک مشهور شاعر، شاه مبارک آبرو نے اس کے متعلق جو نصيحت کي تهي اس کو حاتم نے اپنے ديوان زاده کے ديباچه ميں نقل کيا هے :—

وقت جن کا ريخته کي شاعري ميں صرف هے

ان ستے کهتا هوں بوجهو حرف ميرا ژرف هے

جو کہ لائے ريخته ميں فارسي کے فعل و حرف

لغو هيں گے فعل، اُس کے ريخته ميں حرف هے

ليکن شعرائے دهلي کا يه اسلوب عرصه تک قايم نهيں رهسکا - دکني طرز کي پيروي، ان کے لئے غير فطري تهي - اس ميں بهي خيال ادا کرنے کے لئے، انهيں تکلف اور تصنع سے کام ليلا پڑتا تها - اب انهوں نے اس بات کی کوشش کي که اپني روزمره کی زبان ميں فارسي اجزا کی آميزش کر کے شعر لکهيں - اگرچه پهلے پهل بعض شعرا نے اس کي مخالفت بهي کی مگر يه تحريک، کامياب هوگئی - اور بهت جلد اُردوئے معلے کی زبان ميں شعر و شاعري هونے لگي - اس رجحان کا آغاز، مرزا مظهر جان جاناں نے کيا اور اس کي ترقی عهد ناسخ تک جاري رهي - حاتم نے اس تبديلي کا ذکر، اپنے ديوان زاده کے ديباچه ميں کيا هے اور چونکه وه دهلی ميں اُردو شاعری کے آغازی

اور اصلاحي دونوں رجحانوں کي ترویج وارتقا کے وقت زندہ تھے اس لئے ان کا بیان اس بارے میں زیادہ دلچسپ اور مستند ھے - وہ کہتے ھیں :—

" دریں ولا، ایں تربیت طلب از دہ دوازدہ سال ' اکثر الفاظ را از نظر انداختہ ' لسان عربي و فارسي کہ قریب‌الفہم و کثیرالاستعمال باشد ' و روزمرۂ دھلي کہ میرزایانِ ھند و فصیح گویانِ رند در محاورہ دارند ' منظور دانستہ ' سوائے آن، زبان ھر دیار ' تا بھندوي ' کہ آں را بھاکا گویند ' موقوف نمودہ فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند بودہ ' اختیار کردہ "

پھر قدیم و جدید لفظوں کي فہرست لکھنے کے بعد کہتے ھیں " دیوان زادہ میں قدیم یعنی دکنی طرز کے اشعار، میں نے نہیں درج کئے ھیں - اگر کوئی ملجائیں تو مجھے معاف کیجئے " - لیکن اب تذکروں سے حاتم کي قدیم طرز کي نظمیں بھي دستیاب ھوگئي ھیں - حمد و نعمت پر اُن کی ایک نظم تذکرۂ گلشن گفتار میں منقول ھے - اس کے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ھیں تاکہ یہ ظاھر ھوسکے کہ دھلي کی آغازی اُردو شاعري، کس رنگ کي تھي - اور اس کے ساتھہ ھی دیوان زادہ کي ایک نظم کے چند شعر بھي پیش کئے جاتے ھیں جو ثابت کریں گے کہ لسانی تبدیلي کے رجحان نے دھلي کي آغازي شاعري کے اسلوب کو کس قدر بدل دیا - حاتم کی ابتدائي شاعری کا نمونہ یہ ھے :-

الھي داغ سیں دل کو جلادے
بِرہ کي آگ مجھہ تن میں لگادے
جلا جیوں پھلجھڑي اس ناتواں کوں
شرر لبریز کر ھر استخواں کوں

فنا کر عشق میں یہ جانِ بے تاب

کہ جیوں آتش میں گھٹ جاتا ہے سیماب

کہ ہو ست آپ سیں یکبار جاؤں

پیمبر کی صفت کرنے کو دھاؤں

رکھے ہیں جس کے دروازے پہ موسیٰ

سعادت جان ' دربانی کا عاصا

مسیحا ناک گھس تیغ؛ آستاں پر

دماغ اپنا چڑھایا آسماں پر

اوتر سدرہ ستے ھر پیر جبریل

کیا علم حقیقت خوب تحصیل

نبی کی آل پر سے وار جانا

اسی بارہ پلے میں پار جانا

حاتم کی یہ وہ طرز شاعری تھی جو اُن کے آخری عہد میں متروک ہوگئی تھی اور جس کا انتخاب انھوں نے دیوان زادہ میں نہیں کیا - یہاں ہم دیوان زادہ کی ایک نظم سے چند شعر نقل کرتے ہیں :—

کیا بیاں کیجئے نیرنگئی اوضاع جہاں

کہ پلک چشم زدن ہوگیا عالم ویراں

جن کے ھاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پانو

پھریں ہیں جوتے کو محتاج ' پڑے سر گرداں

نعمتیں جنکو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت

روز پھرتے ہیں یہاں قوت کو اپنے حیراں

چونکہ یہ نظم' ہمارے مضمون کے سلسلہ میں ' ہندستانی کے گذشتہ نمبر میں چھپ چکی ہے اس لئے یہاں اس کے اتنے ہی شعر کافی ہیں -

جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس لسانی تبدیلی کو ابتدا میں بعض حضرات نے پسند نہیں کیا - تذکرۂ مخزن نکات میں قائم نے اس کے متعلق اپنے خیالات اس طرح ظاہر کئے ہیں :--

"برشناسائے سلوک سخن، مخفی و محتجب نیست کہ از عہد عبداللّٰہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانہ بہادر شاہ اول، کسانے کہ شعر ریختہ گفتہ اند، نسقِ کلام این ہا، بسیار مربوط و معقول است - ہر چند اکثر الفاظ، غیر مانوسِ گوشِ ما مردم مستعمل ایشان است ؟ لیکن چونکہ موافق زبان دکن، راست و درست است، پیش ہمہ کس راہ بدو دارد - "

قایم کے اس بیان کے سلسلہ میں ان کا یہ اُردو شعر غالباً دلچسپی سے سنا جائے گا کہ

قایم، مَیں غزل طور کیا ریختہ، ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

طبقۂ سوم یعنی میر، سودا، اور سوز وغیرہ کے ذکر سے پہلے، قایم لکھتے ہیں :—

"مخفی و محتجب نماند کہ انچہ الحال اشعار و احوال شعرائے متاخرین نوشتہ می آید - طرز کلام این ہا، مانا بروَیہ شعر فارسی است - چنانچہ جمیع صنایع شعری قرار دادۂ اساتذۂ اسلاف است، بکار می برند و اکثرے از ترکیبات ُ فرس کہ موافق محاورۂ اُردوے معلی، مانوسِ گوش می نمایند، جوازالبیان می دانند - الا ترجمۂ زبان مغل بہ ریختہ کردن مقبوح است - چہ درین صورت صحت زبان یکے از ہر دو نمی ماند - "

مگر قایم اور ان کے هم خیالوں کے اعتراض کے باوجود ' دهلي نے اُردو شاعري' فارسی سے متاثر هوتی گئي ' یه رجحان اس لئے بھي کامیاب هوگیا که اس کے علمبردار مظهر جانجاناں ' میر و سودا ' اور قایم و سوز جیسے بلند مرتبه شاعر تھے - اب رهي یه بحث که اُردو شاعري نے ان شعرا کے زیر اثر کس طرح وه قالب اختیار کیا جو آج تک بدل نه سکا ' اس مضمون کے موضوع سے باهر هے - اس کا تعلق در اصل همارے اس مقالے سے هے جو دهلي میں اُردو شاعري کے ارتقا پر زیرِ تحریر هے - دهلي کے ابتدائي مشاعروں ' شعر و سخن کے سرپرستوں' اور شاعروں کی آپس کي نوک جهونک اور مختلف شاعروں کے موجوده کلام کے اوقات و سنین پر گفتگو کرنا بھي اُسي مضمون سے متعلق هوگا -

---

مثنوی زادالمسافرین

از سید حسن برنی بی اے ال ال بی ایڈوکیٹ ' بلند شہر

سنہ ۴۵۳ ھ میں زادالمسافرین کے نام سے حکیم ناصر خسرو نے ایک کتاب فارسی نثر میں لکھی تھی جو چند سال ہوے برلن کے مطبع شرکت کاویانی سے شایع ہوچکی ھے -

ھمارے پیش نظر اِس وقت اِس نام کی ایک فارسی مثنوی ھے ' جس کا مصنف میر حسینی ھے - مسٹر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں اس شاعر کا تذکرہ نہیں لکھا ' نہ اس مثنوی کا کوئی ذکر کیا ھے ' لیکن وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا شاعر تھا ' اور یہ مثنوی' فارسی زبان کے بہترین آثار میں شمار کئے جانے کے قابل ھے -

میر حسینی ' فارسی زبان کے اُس دور سے تعلق رکھتا ھے ' جس نے سعدی ' خسرو ' عراقی اور حسن پیدا کئے تھے - اُس کی شاعری' بے تصنع ' اُس کے خیالات' دقیق ' اُس کے جذبات' عالی اور اُس کی زبان' سادہ ھے -

اُس کے حالات ' دولت شاہ سمر قندی نے اپنے تذکرۂ شعرا میں طبقۂ رابع میں بیان کئے ھیں جس میں شیخ عطار اور مولانا رومی بھی شریک ھیں (دیکھو صفحہ ۱۴۶ - ۱۴۸ تذکرۃالشعرا مطبوعہ لاھور سنہ ۱۹۲۴ع)

اُس کا نام حسین ' باپ کا نام عالم اور دادا کا نام حسن تھا ' وہ غور کے حسینی سادات میں سے تھا - ھرات میں رھتا تھا ' لیکن اکثر اوقات سیاحت میں گذارتا تھا - برسوں درویشی میں گذار دئے اور اکثر

بڑے بڑے بزرگوں سے صحبت رہي ـ عراقي اور اوحدي اور حسیني
تینوں شیخ شہاب الدین سہر وردي کےمرید تھے - ایک سال کرمان میں
اوحدی کی خانقاہ میں' تینوں' خلوت میں جمع ہوگئے ' اور اسي
عالم میں اوحدی نے ایک ترجیع ' عراقی نے لمعات اور سید حسیني
نے زادالمسافرین تصنیف کر کے اپنے شیخ کي خدمت میں پیش کیں -
شیخ نے اُنھیں پڑھکر فرمایا " عجب تین یگانہ گوھر ' حقیقت کی
کان سے نکالکر لائے ہو لیکن تم میں سے جو زادالمسافرین لایا ھے وہ منازل
عرفان کا سہاج ھے "

میر حسیني نے نظم و نثر میں تیس کتابیں جواني میں لکھی
تھیں ' اور کنزالرموز ' نزھت‌الارواح ' زادالمسافرین ' صراط مستقیم '
اور طرب‌المجالس پیری کے زمانہ میں لکھی تھیں - ایک اور کتاب
" علقائے مغرب " جس میں معارف و حقایق بیان کئے گئے تھے'
میر حسیني کي تصنیف بتائي جاتي تھي ' لیکن دولت شاہ نے
اُس کتاب کو خود نہیں دیکھا تھا -

عوام میں مشہور تھا کہ ھرات میں لوگوں نے شورش کر کے
میر حسیني کو شہید کر دیا ' لیکن اس روایت کو دولت شاہ نے صحیح
نہیں مانا ھے -

اس کي وفات ' دولت شاہ نے بمقام شہر ھرات سنہ ۷۱۹ھ میں بیان
کي ھے ' لیکن یہ غلط ھے - زادالمسافرین سنہ ۷۲۹ھ کي تصنیف
ھے ' اور اس وجہ سے اس کی وفات کا زمانہ اس کے بعد کا قرار
پاتا ھے -

اُس کي قبر' شہر ھرات میں گنبد سیدالسادات کے باھر بني ہوئی
تھي - یہ ھیں کل حالات میر حسیني کے - جو دولت شاہ نے بیان کئے
ھیں اب رھي کتاب زادالمسافرین - معلوم ھوتا ھے کہ وہ تصرف کي

ممتاز تصانیف میں شمار ہوتی تھی ؟ اور یہ لحاظ رکھتے ہوئے کہ
ہمارا نسخہ تیرھویں صدی ہجری کے اخیر کا لکھا ہوا ہے ، وہ ضرور
بعد کے زمانہ تک متداول رہی - تعجب ہے کہ ایسی عمدہ کتاب
کس طرح اب تک ادبیات ایران کے شایقین سے پوشیدہ رہ گئی -

کیا مہر حسینی کے پیش نظر حکیم ناصر خسرو کی لکھی ہوئی
کتاب بھی تھی ؟ عجب نہیں کہ ایسا ہو - لیکن دونوں مصنفوں اور
اُن کی کتابوں میں زمین آسمان کا فرق ہے -

حکیم ناصر خسرو ، باطنی تھا ؛ اور مہر حسینی ، صوفی - دونوں
کے خیالات و نقطہاے نظر میں بعض بنیادی اختلافات ہیں -

مہر حسینی بھی انسان کو مسافر سمجھتا ہے اور ناصر خسرو
بھی - دونوں کے خیال میں اس مسافر کی ایک منزل مقصود ہے ، جو
خدائےتعالیٰ ہے - اس منزل تک پہونچنے کے لئے زاد راہ درکار ہے
ناصر خسرو کی نظر میں وہ زادراہ عقل ہے ، جس کے ذریعہ سے
انسان خدائےتعالیٰ کی شناخت اور حکمت حاصل کرتا ہے - اور
مہر حسینی کی نظر میں وہ زاد راہ، عشق ہے ، جس کے ذریعہ سے انسان
خدائےتعالیٰ تک رسائی پاتا ہے - عقل نہ خدائےتعالیٰ کی شناخت
کرسکتی ہے ، نہ انسان کی ہستی کو بتا سکتی ہے ، نہ اس کائنات
کے کسی معمے کو حل کرسکتی ہے - ناصر خسرو کا مذہب ، اسلامی
معتقدات کی تاویلات پر مبنی ہے - ہر ظاہر کا ایک باطن ہے ، اور
ہر مذہبی تعلیم کی ایک عقلی تاویل - مہر حسینی کی نظر میں
مختلف مذاہب، ایک ہی حقیقت کے جویا ہیں ، اور اُن کے ظاہری
اختلافات و مراسم، سب ہیچ ہیں - عشق حقیقی، صرف ایک ایسی
پاکیزہ روح میں رہتا ہے جو دنیا کے نیک و بد سے بالا ہوچکی ہو
جو خدا کو صرف خدا کے لئے چاہتی ہو ، اور کسی عوض کی خواستگار

نہ ہو ۔ ایسا انسان' دنیا اور دنیا کے لوگوں میں رہتا اور اُن کے ساتھ بہترین و خوشگوار معیشت کے ساتھہ گذارتا ہے لیکن اُس کی زندگی باہمہ ہوکر بھی بے ہمہ ہوتی ہے ' اور اصلی تعلق' صرف ذات واحد سے رہتا ہے۔

ناصر خسرو کے مذہب میں اس مسافر کی رہبری کے لئے امام وصی اور ناطق پیدا کئے گئے ہیں ' جو اپنے اپنے زمانوں میں مذہب کی عقلی تاویلات کرتے ہیں ۔ میر حسینی کے نزدیک' رسم و رواج کی پابندی حقیقی توحید کے منافی ہے ' اور تقلیدی مذہب' لا مذہبی کا ہمپایہ ۔ البتہ طریقت میں ہدایت پانے کے لئے ایک بہترین پیر کی ضرورت ہے جس میں کامل عشق الٰہی موجود ہو ' اور ایک طرح انسان کامل کا پرتو ہو ۔

(۲)

مثنوی زادالمسافرین قلمی اور یکشنبہ ۱۰ صفر ۱۲۷۵ھ کی لکھی ہوئی ہے ' اس میں ۱۱۲ صفحات ہیں ' ہر صفحہ میں تیرہ اشعار درج ہیں ' اور اشعار کی مجموعی تعداد ' سوا (یا) تیرہ ہزار سے زیادہ نہیں ۔

مصنف' اس کتاب کو " گلبن یقین " بتاتا اور " توشۂ زادالمسافرین " بتاتا ہے ۔ کل مثنوی آٹھہ مقالوں پر مشتمل ہے ' اور ۷۲۹ ھ میں ختم ہوئی ہے

در ہفتصد و بیست و نہ زہجرت
گشت آخر ایں کتاب ' تست ،،

حسب معمول' کتاب حمد سے شروع ہوتی ہے ۔ مصنف کے خیال میں ذات باری تعالیٰ کا بیان ' الفاظ کے ذریعہ سے نا ممکن ہے ۔

،، اے برتر از ان ہمہ کہ گفتند
آنانکہ پسدید یا نہفتند ،

اُس کی ابتدا ' شروعات سے باهر هے ' اور اُس کے متعلق پیغمبر بھي سر گرداں هیں -

اے اول تو ورائے اول
حیران تو انبیا و مرسل

اول و آخر اشارے هیں اور وہ اشاروں سے بالا هے -

'' هست اول و آخر از اشارات
اے بر تر ازیں همه اشارات

فراز و بالا سے باهر هے ' اور اس کا وجود بلا همارے بیان کئے ' قائم -

'' بیروں زهمه فراز و پستي
هستي ' نه بگفت ما تو هستي ''

بیروں و اندروں ' انساني الفاظ هیں اور پست و فراز ' انسانی حدوف -

بیروں و دروں حکایت ما ست
بالا و نشیب غایت ما ست

اُس کي هستي بیان میں نهیں آسکتی ' نه انسان کی عقل میں -

" هستئي تو بے همه بیاں هست
در دانش ما نیاید آں هست "

عقل اس راز سے ایسي هي بیخبر هے ' جیسا که ذرہ ' آفتاب پر نور سے -

عقل از سر ایں سخن چناں دور
کاں ذرہ از آفتاب پر نور

آدم ' جنهیں دنیا کا خلیفه بناکر بھیجا گیا تھا ' خود سرگشته رهے ' اولاد آدم بھلا اُس کي معرفت کیا بتاسکتي هے -

آدم که خلیفۂ معلے است
سر گشتۂ " ربّنا ظلمنا " ست

ذریست او کہ ذرہ زوینند
در معرفت تو خود چہ گویند ؟؟

خود محمد صلعم، جو خلاصہ وجود تھے "لا أحصي" کہکر سر بسجود تھے -

احمد کہ خلاصۂ وجود است
لاأحصي گوئے در سجود است

ہر قوم اس راز سے بیخبر ہے ، اور اس میدان میں سر گشتہ -

ہر طایفۂ بگفت و گوے
واقف نہ شدہ ز تار موے
قومے کہ دریں طواف گاھند
سر گشتہ دلان لا آلہ اند

مسجد و خانقاہ و محراب میں سب أسي کے فکر میں لگے ہوئے ہیں ، خرقہ پوش اور بادہ نوش ، مناجات و خرابات میں أسي کی طلب میں مصروف ہیں ، مغ - آتش پرستي میں ، جہود ، کنشت میں، ترسا، ناقوس و دیر و کلیسا میں ، ہندو، بت پرستي میں ، سب أسي کے تیر غم کے شکار ہیں -

ہندو کہ ہمیشہ بت پرستند
ہر صبح دعات مي فرستند
جز یاد تو نیست بر زبانش
زناروفا ست برمیانش

کائنات کي تمام چیزیں أس کي ہستی پر شاہد ہیں ، مگر تعجب ہے کہ أس کی حقیقت سے بیخبر ہیں -

في الجملہ ترا ہمہ طلبگار
وا نکہ ز تو کس نہ شد خبردار

هر شخص ایک ترانہ گاتا ہے اور اپنی داستان الگ سناتا ہے -

هر کس بترانۂ دریں کوے
دستان تو می زند بهر سوے

لیکن خیال کی رسائی معلوم ' اُس کے سوا حقیقت سے کون آگاہ ہے - جو اس فکر میں پڑتا ہے حیران ہوکر رہ جاتا ہے بلکہ وہاں غور و فکر لاحاصل ہیں -

اندیشہ بتو چہ ماند آخر
یا جز تو ، تراچہ داند آخر
آنکس کہ دریں تفکر افتاد
در دائرۂ تحیر افتاد
آنجا کہ حریم بے نیازیست
اندیشۂ ما خیال و بازیست

توحید کے بارے میں بطور تقلید ' جو کچھہ کہا جاتا ہے وہ صرف دل کا بہلانا ہے ' ورنہ الفاظ میں وہ کہاں سما سکتا ہے -

حرفے کہ رود زراہ تقلید
خرسندی طبع داں بتوحید
ایں نکتہ بحرف در نگنجد
و اندر صفت بشر نگنجد

هر شخص اپنے خیال کے مطابق اُس کا خیال باندہ کر نام اور صفت بیان کردیتا ہے -

بر تختہ از و خیال هر کس
اسم و صفتے رقم زد و بس

لوگ فی الواقع آئینہ میں اپنا هی عکس دیکھتے ہیں ، اور اُسے اپنی ذات کے صفات سے موصوف کر دیتے ہیں - بے معرفتی کا نام

معرفت رکھ چھوڑا ھے - جتنی صفات چاھو اُس کی طرف منسوب کر لو ' مگر اُس کی صنت ' یگانگی مطلق ھے :—

قومے کہ ز جملہ بیش دیدند
در آئینہ عکس خویش دیدند
ذاتش بصفات خویش موصوف
تا معرفت تو بودہ معروف
کامل بکمال قدرت خویش
پیش از صفت تو بے کم و بیش
اورا بہمہ صفات می خواں
لیکن صفتش ھمہ یکے داں
تعبیر صفاتش از من و تست
تا عقل شد آروے کند چست
اوراست یگانگی مطلق
با ھر صفتے کہ دارد الحق

" مروجہ توحید " شرک ھے :-

" پندار خود از میانہ بردار
توحید تو شرکت است ؟ ھشیار !
زنہار بحجت قیاسی
غرہ نشوی بحق شناسی "

---

(۳)

حمد کے بعد ' پہلا مقالہ ھے جس میں " ریاضت و مجاھدہ " کی دعوت دی گئی ھے -

انسان' اپنے محبوب سے جدا ھوکر رہ گیا ھے' اور اسی ماتم میں لگا ھوا ھے :-

مستغرق زدهٔ فراق یاری
از بے خبری خبرنداری
ماتم زدهٔ خموش بنشیں
بے چشم و زبان و گوش بنشیں

وہ اپنے آپ میں مبتلا ہوکر رہ گیا ہے، لیکن معاملہ سخت دشوار اور راستہ نہایت باریک ہے :—

مشکل سخنے عجب شمارے
باریک رہے و طرفہ کارے

ذرہ، آفتاب کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے-آدمی اپنے خیال میں الجھا رہتا ہے، اور فکر و اوہام کے جال میں پھنسا ہوا ہے، اور اُس کا نام ہی نام معلوم!

اے ذرہ چہ مرد آفتابی
نزدیک مشو کہ برنتابی
تاکے ز خیال پیچ در پیچ
بنشیں پس کار خود ہمہ ہیچ
چندیں تگ و پوے فکر و اوہام
معلوم نہ شد ازو بجز نام
در آئینہ، حسن او نظر کرد
عشق آمد و حیلہ را خبر کرد

اپنے عشق میں اُسے ہر شخص جداگانہ نظر سے دیکھتا ہے :-

ہر یک باشارتے دویدند
کردند بیاں چنانکہ دیدند

لیکن اہل نظر، نام و نشان سے بھی بیخبر ہیں :-

آں طایفۂ کہ اہل کارند
از نام و نشاں خبر ندارند

بیروں شدہ از صفات اسما
وز اسم ندیدہ جز مسمّا

وہ واجب‌الذات ' تصور و خیالات سے بالا ہے اور چوں و چرا سے برتر :-

اول همه اوست واجب‌الذات
بیروں ز تصور و خیالات
از چون و چگونه بے علایق
برتر ز تصور خلایق

اس برتر از عقل ' بالا از وهم اور ورائے این و آں هستی کو ' نہ کوئی جانتا ہے نہ پہچانتا ؟ نہ کسی کو اُس کا نشان ہے ' هر شخص درد فراق میں مبتلا ہے اور بجز بیہوشی' کوئی چارۂ کار نہیں :-

اے برتر از آنکہ عقل گوید
بالا تر از آنکہ وهم جوید
اے آنکہ ورائے این و آنی
کیفیت خویش را تو دانی
کس واقف تو بہ هیچ رو نیست
آنکس کہ ترا شناخت او نیست
اینجا نہ تواں بہوش بودن
مارا چہ بہ از خموش بودن
کس را ز تو ذرۂ نشاں نے
جز درد فراق در میاں نے

پھر انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ " اے غمزدہ مسافر ! تیرے راستے کے تمام فرسنگ ' تیرے هی اندر موجود هیں :-

در راہ تو اے فریب دلتنگ
بیروں ز تو نیست هیچ فرسنگ

بیگانه ز آشنائي ماست
پیوستن او جدائي ماست

انسان ' خود اپني هستي کو نهیں جانتا که کیا چیز هے اور دنیا میں اُس کا آنا اور یہاں سے جانا کس لئے هے :—

از خویشتنم خبر نیامد
جز یکدم سرد بر نیامد
کس را بحقیقتش خبر نیست
وز رفتن و آمدن خبر نیست
نا یافته را کسے چه جوید
گُم گشته ز یافتن چه گوید

انسان کي تگ و دو کا ماحصل اس سے زیادہ نہیں هے که وہ هر چیز میں اپنا پرتو دیکھتا هے اور اُس کو حقیقت سمجھ بیٹھتا هے :—

چون ذرہ بسے بسر دویدم
جز سایۂ خویشتن ندیدم
در پردہ خیال خویش دیدم
گفتم بحقیقتے رسیدم

———

(۴)

دوسرا مقالہ ' انسان کي فضیلت و شرف میں هے :—

مہر حسیني لکھتا هے که انسان ' اپنے شرف و فضیلت سے خود بیخبر هے حالانکه تمام کائنات اُس سے حیراں هے :—

اے هم تو ز چشم خود نہاني
نادان شدۂ و مي نداني

عالم ز حضور تست حیراں
اما چو تو غافلی ' چه درماں

انسان' فضاے قاب قوسین کا شہباز ہے؟ اپنی ناسپاسی سے اپنی قدر نہیں جانتا۔ انسان کو اس منزل پست سے بلندی کی طرف پرواز کرنا چاہئے :-

دانی که تراچه خواند کونین
شهباز فضاے قاب قوسین
کافر شدهٔ بناسپاسی
خاصیت خود نمی شناسی
مرغ‌ائی بحر لایزالی
لیکن چه کنم که در خیالی !
بر پر ! که نه منزل قرار است
ایں آب و هوا نه سازگار است

انسان ' علم و عقل سے حقیقت کی جویائی کرنا چاہتا ہے ؟ حالانکہ یہ دونوں' حجاب اعظم ہیں :—

گفتی که بعلم و عقل جویم
نادیده کسی ترا چه گویم
جائے که مجال آدم آمد
ایں هر دو حجاب اعظم آمد

انسان کے تمام کاروبار' اپنے ہی سبب سے درہم وبرہم رہتے ہیں :—

کارے تو همیشه درهم از تست
از خود گله کن که ایں غم از تست
صاحب نظراں که خود شنا سند
از بودن خویش در هرا سند

انسان کے اندر سب کچھہ موجود ہے ' سب فرقے انسان ہی بنا لیتا ہے ' تمام کائنات اُس کے اندر جلوہ افگن ہے :—

پیدا و نہاں و بود و نا بود
در لوح تو هست جمله موجود
هفتاد و سه فرقهٔ معیّن
در آب و گل تو هست روشن
گر دیدهٔ خویش بر کشائی
در خود همه را بخود نمائی
دانی و بهبنی از چپ و راست
که این هژده هزار عالم ایلهاست
داری تو زمین و آسمانے
گر یافته بده نشانے

انسان، اگر اپنی هستی کا طالب هوجاے-تو اُسے معلوم هوجاے، که رہ کیا هے :-

از غفلت خویش در گمانی
گر طالب خود شوی بدانی
تا در قفس وجود خویشی
مشغول زیان و سود خویشی

انسان کو بلند پروازی سے کام لینا چاهئے - کوته نظری اور کم همتی، انسان کو مبتلائے تهمت رکھتی هے :—

پرهیز که مُرغ خلوتی تو
آخر نه همائے وحدتی تو
کوته نظر خسیس همت
باشد همه عمر اسیر تهمت

---

(۵)

تیسرے مقاله میں، طریقت اور طریق حق کی کیفیت سلوک بیان کی گئی هے - وه کہتا هے " که انسان، جو که اس دنیا میں ایک

مسافر کی حیثیت رکھتا ہے' اُسے ہر در پر سر گشتہ نہ رہنا چاہئے :—

اے مرد مسافر از کجائی
سر گشتۂ هر درے چرائی

انسان ' ایک سیمرغ ہے ' اور اُسے کوہ قاف کی بلندیوں پر پہونچنا چاہئے :—

سیمرغ تُوئی چو پر فشانی
تاکے پس کوہ قاف مانی

امید و بیم اور پس و پیش نے انسان کو ناکارہ کر رکھا ہے :—

تا در نظرت امید و بیم است
راہت نہ صراط مستقیم است
اے گُم شدہ پیش و پس چہ گِردے
ایلک رہ تو ؟ بِرو بمردی

انسان کو اپنا افسانہ کوتاہ کرکے اپنے اندر ہی سفر کرنا چاہئے :-

افسانۂ خویش مختصر کن
بنشین و درون خود سفر کن

امید کو اپنا تکیہ بنانا چاہئے :-

از کار خود اے گدائے مسکین
بر تکیہ گہِ اُمید بنشین

جب تک کہ اِنسان رسم و عادت کا مُرید ہے، اور اِرادت سے خالی' وہ درویش نہیں ہے :-

اے گشتہ مُرید رسم و عادت
یک ذرہ نہ بہلست اِرادت
تا رہبر تست عادت خویش
شیطان منافقی' نہ درویش

درویش کو بے برگ و نوا ہونا ضروری ہے :-

چوں بے ہمہ، برگ خود برانداز
بي برگي را نواے خود ساز

مردان خدا، موت سے قبل هي مرجاتے هيں :-

مرداں که رہ خدا سپردند
در عالم زندگي بمردند
فاني شو ازیں صفت بمردی
تا زندۂ لایموت گردي

اصل دین، تصدیق دلي هے اور یقین سے نور یقین هے :-

تصدیق دل تو اصل دین است
از نور یقین تو یقین است
تاکے نقش از گماں بر آري
ایماں بدلت و دل نداري

توحید، صاف دل اور پاک جان میں رهتي هے :-

توحید، نه کار آب وخاک است
ایں در دل صاف و جان پاکست

خدائےتعالیٰ کو رسمي طور پر یاد کر لینا، اور نمایشی آنسو بہالینا، یا دنیا کے دکھانے کیلئے غسل کرکے نماز پڑھ لینا عبث هے ـ اصلی کام، معرفت کے سمندر میں گھس جانا هے :-

اے خوانده خدائے را بعادت
دوري ز حقیقت شهادت
تاکے بزبان، خود پرستي
ایں است مگر هوا پرستي

تاکے زدو قطرۂ آب دیدہ
چوں قطرہ کہ او سراب دیدہ
اے از پئے شہرت زمانہ
غُسلے زدۂ بہر دوگانہ
بادے کہ زتو پدید گردد
آں پاکئے تو پلید گردد
اے آب ترا فساد بادے
برکار تو نیست اعتمادے
یکبار مجرد از صفت شو
در بحر محیط معرفت شو

جب انسان، نیست ہوکر رہ جاتا ہے تو اُسے اناالحق کہنے کا حق ہوجاتا ہے :-

چوں نیستئي تو شُد محقّق
آید ہمہ نعرۂ اناالحق

یہي طریقت کي حد ہے، یہي طریقت کا خلاصہ ہے :-

اینجا است نہایت طریقت
اینست خلاصۂ طریقت

درویش کو سرگرداني بیکار ہے، اگرچہ اُس کي راہ بہیماک ہے، لیکن خدا، ساتھہ ہے۔ مسجد و خانقاہ کي تلاش اور طواف حرم و حج، بیکار ہے :-

تاچند بہرزہ راہ رفتن
در مسجد و خانقاہ رفتن
کہ گردِ حرم طواف کردن
حجّے زسر گزاف کردن

خودي سے بیخودي میں؟ تن سے نفس میں؟ نفس سےدل میں؟ دل سے جان میں؟ آنا چاهئیے؟ وهیں سے جہانِ آشنائي میں اور حریم کبریائي میں رسائي هوگي :-

ازخود بخود آ و بیخودي جوے
بے زحمت پا ؤ سر همي پوئے
از تن به حریم نفس بشتاب
مُلک ملکوتِ خویش دریاب
از نفس' بدل - زدل' بجاں رو
منزل چه طلب کني دواں رو
از جان به جهاں آشنائي
و انگه بحریم کبریائي
اے خواجه' دمي قلندرے شو
از محنت جسم و جاں برے شو

انسان کے نیک و بد سے بے نیاز هیں؟ البته اس کا سوز درکار هے :-

از نیک و بد تو بے نیازند   مي سوز چو شمع' تا بسازند

انسان کو' فکر میں مصروف رهنا چاهئیے :-

از فکر بفکر مي تواں رفت
آنکس که برفت بے نشاں رفت

لیکن اس کارگاہ آب و گل میں مبتلا رهکر فکر تک رسائی مشکل هے بلکه یہاں شیطان کي کمیں گاہ هے:—

از آب و گلت که تکیه گاہ است
تا وهم هزار ساله راہ است
شیطان که بتو رہ است اورا
این رخنه کمیں که است اورا

انسان ، جب تمام خداوندگان مجازي سے رهائی پا لیتا هے تب حقیقي آزادي پاتا هے :—

چوں بگذري از همه خدایاں
آب و گل تو رسد بپایاں

ورنه ، بالعموم لوگ اپنے هي سرمایه میں مبتلا ، اپنی تاریکي میں مثل سایه گرفتار ، اپني چارہ سازي میں در ماندہ ، اپني خیال بازي میں مشغول اور اپنے شعار میں پس پردہ محو اور هیچ کاریوں میں مصروف هے :—

هر یک بحجاب مایه ماندہ
در ظلمت خود چو سایه ماندہ
درماندہ بکار سازي خویش
مغرور خیال‌بازي خویش
هر یک پس پردہ در شعارے
مشغول شدہ بهیچ کارے

لیکن جو لوگ که کچھه بھی شناخت رکھتے هیں وہ بیقرار هیں اور پرکار کی طرح هر وقت دائرۂ فنا میں ، خط حیرت پر سر رکھے هوے هیں - اپني خود فراموشي میں ، دریا کی طرح جوش میں هیں -

آنانکه دمي شناخت دارند
تاظن نه بري که برقرارند
در دائرۂ فنا چو پرکار
سر بر خط حیرت اند هموار
در خود شدۂ و ز خود فراموش
دریا صفت اند جوش در جوش

(۹)

چوتھے مقالہ میں، سالک طریقت کی صفت بیان کی ہے :—

وہ کہتا ہے کہ تصوف کے پیرو، ہر وقت عشق میں مصروف رہتے ہیں :-

از آتش عشق، وقت شاں خوش

اور دنیا میں رہ کر دنیا سے بے تعلق ہیں :—

چوں آب روند بے علایق

آمیختہ با ہمہ خلایق

اُنھیں نہ دوزخ کا غم ہے نہ بہشت کا، وہ بے نوا، گویا و خموش، اور مست و ہوشیار ہیں - خلق خدا کے ساتھہ اُن کا برتاوا خوشگوار ہے، علم و عمل کے ساتھہ صادق‌القول اور میزان کی طرح بے کم و کاست ہیں - کم و بیش کا اندیشہ نہیں رکھتے نہ جور زمانہ کا غم - اپنی ہستی میں مشغول ہیں اور خلق کے قبول و رد سے فارغ ہیں :—

نے در غم دوزخ و بہشتند

ایں طایفہ را چنیں سرشتند

ایں راہ روانِ بےخر وبار

گویا و خموش و مست و ہشیار

با خلق خدائے خوشتر از مشک

لیکن نہ چو نافہ، مغز شاں خشک

با علم و عمل، زبانِ شاں راست

میزاں صفت اند بے کم و کاست

اندیشۂ بیش و کم ندارند

وز جور زمانہ غم ندارند

در بحر و جود خویش غرق اند

فارغ ز قبول و رد خلق اند

جو شخص که مبتلائے رنگ و بو ھے وہ درویش نہیں بلکہ گدا ھے :—

آں را که ھوائے رنگ و بوی است
درویش مخواں ، گدای کوی است

اُس کی شناخت یہ ھے کہ دل پُردرد رکھتا ھے ، اپنے وجود سے روشن اور عالم و آدم سے فارغ ھے :—

از بحر وجود خود چراغ است
کز عالم و آدمش فراغ است
ملک دوجہاں بود طفیلش
لیکن نبود بھر دو میلش
خنداں شدہ بادلے پر از درد
اینست نشان آں جوانمرد

کاموں میں سبک دل و گرانسنگ اور جسم میں گراں دل و سبک سنگ ھے - خلق کے ساتھہ تکاپو میں مصروف ھے ، بیگانہ دل ھے اور آشنا رو :

در کار سبک دل و گراں سنگ
در جسم ، گراں دل و سبک سنگ
با خلق ھمیشہ در تگ و پوے
بیگانہ دل است و آشنا رو

لیکن یہ راہ ، خرقہ و گلیم سے نہیں ھے ، بلکہ اُس کا اول قدم ، قلب سلیم ھے :—

ایں رہ نہ بخرقہ و گلیم است
اول قدمش دلے سلیم است

انھیں نیک و بد سے کچھہ تعلق نہیں ، بلکہ دریا کی طرح آسودہ ھیں :—

آنجا کہ نشان بے نشانی است
جانرا ز وجود خود گرانی است

این عالم بیدلانِ شیداست
بے نام و نشاں لاأُوبالیست
اینست کمال حال مرداں
شیرانِ مبارزانِ میداں
آنانکہ حدیث خود ندارند
اندیشۂ نیک و بد ندارند
دانستہ و دیدہ و رسیدہ
دریا صفت اند آرمیدہ

اور سب کی برائیاں سہلنے کو تیار :—

در زحمت این و آں نکو شند
زہرِ ہمہ را چو شہد نوشند

مسیح علیہ‌السلام ' جفا پر اپنے دشمن کو دعا دیتے تھے :—

ہر جا کہ یکے جفاش می گفت
او خود بہ لبے دعاش می گفت

اس پر کسی نے پوچھا کہ یہ عجیب بات ہے ' آپ نے فرمایا کہ ہر شخص وہی دیتا ہے جو اُس کے پاس ہے :—

ہر کس ز ہماں دہد کہ ہستش

اسی طرح صاحب نظرانِ پاکدامن' آفرین ودشنام سے بالا رہتے ہیں :—

بر خاطر شاں ز خاص و از عام
یکساں شدہ آفرین ودشنام

دنیا کا اختتام ' فنا ہے - ازل و ابد کا ملک' خدا کے لئے ہے - دیوانہ ہے جو اس دو روزہ ملک پر مغرور اور اُس کے نیک و بد میں گرفتار ہے :-

چوں عاقبت جہاں فنا راست
ملک ازل و ابد خدا راست

دیوانہ توئي کہ بہر بیشی
مغرور دو روزہ ملک خویشی
دل در بد و نیک او نہ بستم
در کنج خرابہ زاں نشستم

اس راحت چندروزہ کو ' مت دیکھہ -

ایں راحت چندروزہ منگر
قسمت ز سعد و نحس اختر

ایک مرتبہ ' سکندر اپني فوج کے ساتھہ ' ایک خرابہ میں ایک دیوانۂ خدا دوست پر گذرتا ھے - وہ اُس کي تعظیم نہیں کرتا ' سکندر بہت پوچھتا ھے تو وہ کہتا ھے کہ تو میري برابري کس طرح کر سکتا ھے جبکہ تو حرص و آز کا بندہ ھے جو درویش کے غلام ھیں :—

با من چہ برابری کني تو
چوں بندۂ بندۂ منی تو
دو بندۂ من کہ حرص و آزند
با تو ھمہ عمر سرفرازند

سکندر نے متحیر ھوکر اپنی کلاہ ' زمین پر پھینکدی :—

حیراں شد ازیں سخن ' سکندر
بفگند کلاہ شاھي از سر

پاکباز ' غیر خدا سے بے نیاز ھیں :—

اینک وہ آنکہ پاکباز است
از غیر خدائے بے نیاز است

اور نیک و بد زمانہ سے آزاد ھیں اور خدا کے سوا' سب سے بے فکر :—

" از نیک و بد زمانہ رستند
جز حق ' ھمہ را وداع کردند "

بغیر عشق کے، یہ راستہ طے نہیں ہوتا :—

بے عشق بسر نمی شود راہ

اور عشق ہی اس راہ میں سالار کارواں ہے :—

صد قافلہ دم بدم رواں است
عشق است کہ مہر کارواں است

عاشق، ایک سیمرغ بے نشان ہے، اور اس کا آشیانہ، روح کا سر چشمہ ہے :—

سیمرغ نشان بے نشاں است
سر چشمہ روحش آشیانست

وہ، ہزار خرمنوں کو جلا دینے والا ہے کسی معین قبلہ کی طرف اُس کا رخ نہیں، نہ بیگانہ ہے نہ آشنا، نہ تعلق رکھتا ہے نہ خدا ہے -

سوزندۂ صد ہزار خرمن
رویش نہ بقبلۂ معین
بیگانہ نہ گشت و آشنا نیست
پیوند ندارد و خدا نیست

وہی شخص، یہاں پہونچ سکتا ہے جو کفر و دین سے آزاد ہوچکا ہے :—

اینجا بحقیقتی رسد مرد
کز محنت کفر و دیں شود فرد

اس کے بعد، نہ خیال زیان وسود ہے، اور ایک قبلہ اور ایک ہی سجود ہے !

آنکہ نہ زیاں نہ سود باشد
یک قبلہ و یک سجود باشد

ہر ذرہ، اپنے مرکز کی طرف کھنچتا ہے :—

ہرذرہ کہ بینی ازکم و بیش

دارد کششے بہ مرکز خویش

اسی طرح، جو میل خاطر کہ نہایت کی طرف جاتا ہے، وہی عشق ہے۔

میلے کہ کشد سوئے نہایت

عشق است ولے چو شدبہ‌غایت

اس کے علاوہ، جو میل ہے اور جس کا مقصود کوئی غرض ہے وہ عشق نہیں ہے :-

ہرجا کہ بمیل طبع رانی

نیکو نبود کہ عشق خوانی

میل تو نصیب خویش جوید

در عشق کس این سخن نہ گوید

عشق سے، کائنات کا کوئی ذرہ، خالی نہیں ہے :-

از عشق نہ ہیچ ذرہ خالی است

تسبیح و نماز و روزہ بھی، ایک کام ہے؟ لیکن عشق، اِن سب سے بالا ہے :-

تسبیح و نماز و روزہ کاریست

اندیشۂ عشق خود شعاریست

عشق میں، علم و عمل کو دخل نہیں :-

علم و عمل اندر این ورق نیست

این شیوہ عاشقانِ حق نیست

وہاں نماز، بے رکوع ہے اور اصول و فروع کا ذکر نہیں :-

آنجا کہ نماز بی رکوع است

چہ جائے اصول یا فروع است

عاشقوں کا قبلہ' اس جہاں سے باهر هے ؟ بلکہ کائنات سے بهي پرے :-

آں قبلہ' بروں ازیں جهانست
آں کعبہ ورائے کائنات است

عشق میں' نہ شک هے نہ یقین نہ رجا' :-

در عشق' نہ شک و نے یقین است
نے خوف و رجا' نہ کفر و دین است

علم سے اُسے واسطہ نہیں' علم تعمیر چاهتا هے اور وہ تخریب :-

از علم درو نشاں نیابي
کہ ایں خواست عمارت او خرابی

عشق' ایک جدا هستي رکهتا هے' خود هي متکلم هے اور خود هي مخاطب :-

بشلو بسرِ حقیقت عشق
با خویشتن است نسبت عشق
با خویش همہ بود خطابش
خود گوید و خود دهد جوابش

جو لوگ' عشق کے نور سے مست هیں وہ خدا کو خدا کے واسطے پوجتے هیں :-

آنا نکہ بنور عشق مستند
حق را ز برائے حق پرستند

مزدور' عاشق نہیں :-

مزدو نہ عاشق است بشناس

خدا کو' امید و بیم سے پکارنے والا عاشق نہیں :-

حق را بامید و بیم خواني
هیهات! بعاشقاں چہ ماني

اے بہشت و حور کا سودا رکھنے والے ! :-

اے بیخبر ! ایں غرور تاکے
سودائے بہشت و حور تاکے

حق تعالیٰ کو جوئے بہشت و قعر دوزخ میں تلاش کرنا چاہئے :-

حق را طلب اے فسردہ چوں یخ
در جوئے بہشت و قعر دوزخ

بغیر اُسکے، بہشت بیکار ہے اور اُس کے ساتھہ جہنم کا کیا خوف ہے :-

بی او چہ کنی بہشت خورم
با او چہ خوری غم جہنم

---

(۷)

انسان کو اپنی ہستی جاننا چاہئے کہ وہ مخلوقات میں کیا
پایہ رکھتا ہے وہ عالم میں، بادشاہ کا مرتبہ رکھتا ہے :-

گیرم کہ بہ صورت گیاهي
در عالم خویش بادشا هي

حتی کہ وہ زندگی کا خلاصہ ہے :-

" وصفت چکنم کہ چوں نباتی
حقا کہ حقیقت حیاتي "

انسان باوجود خاکی سرشت ہونے کے اصل پاکیزہ رکھتا ہے-

" با آنکہ سرشت خاک داری
نسبت با اصل پاک داري "

دست قدرت نے جس وقت انسان کو حکمت کے آب و خاک سے گوندھا تو اُسے بہت سے فتوحات کے قابل بنایا اور اُسے ایک پردے سے دوسرے پردے میں پہنچا کر اُس کے وجود کو مرتب کیا :-

بنیاد ترا چو دست قدرت
بسرشت بآب و خاک حکمت
منشور چہل صبوح گشتی
شایستۂ صد فتوح گشتی
می برد رقیب مہربانت
از پردہ بپردہ ہر زمانت
تا در حرم مشیمہ بردت
آنگاہ بہ نامیہ سپردت

نفس انسانی ، جس وقت بدن میں داخل ہوگیا ، اور خاک میں مقید - تو اُسے خلافت دیگر دنیا میں بھیجا گیا :—

نفسے کہ حیات زوست حاصل
چوں در بدن تو ساخت منزل
از روضۂ وصل و صفۂ یار
در خطۂ خاک شد گرفتار

انسان، یہاں آکر کھانے پینے اور سونے کے خیال میں ایسا محو ہوا اور اپنی خودی میں ایسا مغرور کہ وہ یہاں آکر اپنے عہد قدیم کو فراموش کر گیا :—

بربود خیال خواب و خوردش
سرمست غرور خویش کردش
در صحبت آب و آتش و باد
آں عہد قدیم رفتش از یاد

دنیائے خاکی کے مسایل سے گذر کر ، وہ آسمانوں کے حل و عقد میں لگ گیا جس کی وجہ سے اس کے راستےمیں سیکڑوں حجاب پیدا

ہوگئے - اُس کا علم ہی سب سے بڑا حجاب ہو گیا :—

زیں پنج و چہار در نقابش
ہفتاد ہزار شد حجابش

پھر تو انسان کے دل میں عجیب عجیب اُلجھنیں بڑھتی چلی گئیں :—

از ہر صفتے بپردۂ دل
پیدا شد صد ہزار مشکل
ہر مشکل باہزار معنی
ہرمعنی را ہزار دعویٰ
ہر دعویٰ را ہزار حیرت
ہر حیرت را ہزار غیرت
ہر غیرت را ہزار پستی
ہر پستی را ہزار مستی
ہر مستی را ہزار منصور
آشفتہ تر از حسین منصور

اس طرح روح کے چہرہ پر نقاب پڑتا رہا اور ہر گروہ کو حجاب ' :—

بر چہرۂ روح ازو نقابے است
ہر طایفہ را ازو حجابے است

اور کسی کو حقیقت معلوم نہیں :—

در ہیچ سرشت زو گذر نہ
کس را ز سرشت او خبر نہ

ایک خواب ہے جس کی ہزار طرح کی تعبیر ہے ' ایک حرف ہے جس کی ہزار گونہ تفسیر ہے :—

یک خواب و هزار گونه تعبیر
یک حرف و هزار گونه تقریر

لیکن نفس کي حقیقت سے کوئي واقف نہیں :—

پیدائي نفس بس نہاں است
آنکس که بدید هم ندانست

صرف جس نے پیدا کیا ہے وهي جانتا ہے :—

آنکس داند که آفریدش

رسم و عادت کا صرف وهي شخص پابند ہے جو شقی ہے ' رسم کے آگے آدمی ' اسم کو فراموش کر جاتا ہے اور فرع کے مقابلے میں اصل کو :—

آنجا که شقاوتست ارادت
میلے شودش برسم و عادت
از رسم باسم فارغ آمد
فرعش ز اصول بالغ آمد

سمجھدار لوگ اپنے نفس کي پاسباني کرتے ھیں ' اور اُسے حجاب راہ دیکر اُس کے نیک و بد سے کنارہ کش ہوتے ھیں :—

آنانکہ که مدار این جہانند
بر نفس همیشه پاسبانند
اورا چو حجابِ راہ دیدند
نیک و بد او گناہ دیدند

اور دنیا کو رہ فنا سمجھتے ھیں :—

دنیا که بقاش را وفانیست
دانست که جز رہِ فنا نیست

جان' دل پر اور دل' عشق پر نازاں ھیں اور تینوں میں عشق ہے :—

جان از دل و دل ز عشق نازان
بایکدگر ایں سه عشق بازاں
جاں کرد مقام قرب حاصل
دل گشت بنور روح واصل

انسان اپني طبیعت اور خواهشوں میں گرفتار هے اور اسي وجه سے اپني حقیقت سے بیخبر ' :—

محبوس طبائع و حواسی
خود را تو ازاں نمي شناسی

اور اگر غور کرے تو اپنی حقیقت معلوم هو جاے :—

گر بگذري از طریق دعوی
در خود سفرے کنی بمعنی

یه طرفه لطیفه هے که دل حق کا جویا هے اور نفس باطل کا :—

ایں عربده ایست سخت مشکل
دل حق طلبید و نفس باطل

انسان کو چاهئے که دیکھے اور کچھه نه پوچھے اور جانے اور کچھه نه کهے :—

مي بیں و مپرس تابداني
می داں و مگوے تاتواني

بلکه بے نام و نشان هوکر نشان پیدا کرے اور بیکام و زبان هوکر' بیان :—

بے نام و نشاں شو و نشاں کن
بے کام و زباں شو و بیاں کن

انسان جام جهاں نما هے :—

تو جام جهاں نمائے خویشي

حق کو تیرے دل سے کام ہے اور اس سے یار کا دیدار ممکن !

حق را بدروں تست کارے
بیروں نگر از دریچہ بارے

طالب حق کو چاہئے کہ اپنی کشتی سمندر کی موجوں میں ڈالدے اور نوح کی طرح اُسے سلامت نکال لیجائے :—

اے طالب صادق سبکروح
در بحر فگن سفینہ چوں نوح
طوفاں ز تیود تست در جوش
نوح دگری مباش خاموش

انسانی کشتی بھی عجیب کشتی ہے ' جس کا دونوں جہاں میں نشان ہے :—

کشتی تو بس عجب جہانیست
از ہر دو جہاں درو نشا نیست

چپ رہنے کا وقت نہیں بلکہ کشتی کے چلانے کا وقت ہے :—

فارغ منشیں بداں کہ وقت است
ملاح توئی براں کہ وقت است

دین تقلید' اہل توحید کی نظر میں کفر ہے !

تحقیق بود کہ دین تقلید
کفر است بہ نزدِ اہل توحید

دین کا راستہ اُسی راہبر کو مل سکتا ہے جو آزادی کا تہیہ رکھتا ہو :—

رہرو چو ز خود پیادہ گردد
آنکہ رہ دیں کشادہ گردد

علم کے ساتھہ بے عملي کي وجہ سے اسلام خود بد نام ھے :—

علمت ز عمل چو بے نصیب است

اسلام بشہر تو غریب است

اصلي دین خاکساري ھے اور خودي سے آزادي اور بندگي :—

دین نیست مگر فگندہ بودن

آزاد ز خویش و بندہ بودن

دین صرف خدا پرستي کا نام ھے اور خدا پرستي مہري ھے :—

دین نیست مگر خدا پرستي

چوں بندۂ حق شوي برستي

یہي راہ مستقیم ھے :—

گر عقل صحیح و دل سلیم است

داند کہ صراط مستقیم است

تمام انبیاء اور رسولوں کا دین' ھمیشہ سے ایک ھي ھے باقي تمام بحثیں فروع ھیں :-

راہے ھمہ انبیاء و مرسل

دیں بود ز آخرو ز اول

در اصل بحکم یک شروع است

ایں گفتگوے در فروع است

شروع میں کچھہ نہ تھا سواے اللہ کے :-

اول کہ نشاں بے نشاں بود

نے اول و آخر و میاں بود

نے جوہر و جسم را شمارے

بے صورت مادہ قرارے

نہ عربدۂ خیال در وہم
نے وسوسۂ قیاس در فہم
نے مایہ خوب و زشت حاصل
نے دوزخ و نے بہشت منزل
نے در شش و پنج گفت گوئے
نے در سہ چہار جست و جوے
نے ہفت و نہ ہشت بود و نے نہ
یعنی کہ نبود ماسوی اللہ

نہ اول و آخر تھا نہ وسط تھا ' نہ جوہر تھا نہ جسم تھا -' مادہ بھی بغیر صورت کے تھا ' نہ وہم و خیال تھے نہ وسوسہ و قیاس - نہ نیکی بدی تھی نہ دوزخ و بہشت - نہ شمار تھے ' نہ کچھہ بجز خدا کے اور' اس کے بعد دنیا پیدا ہوئی اصل و نسل و آدم پیدا ہوئے :—

القصہ پدید گشت عالم
موجود شد اصل و نسل آدم

بعد ازاں خدا نے اپنی طرف رہنمائی فرمائی :—

پس کرد بخویش رہنمونی
ایں جملہ چۂ وا عہدونی

بلا شبہہ سب دین ایک ہی کے قایل ہیں :—

نزد ہمہ دین بجز یکے نیست
حقّا کہ دریں سخن شکے نیست

صرف نظروں کا فرق ہے :—

لیکن بہ تفاوت نظر ہا
شد قصد مخالف از خبر ہا

جاهلوں کے مناسب طبع، اصلیت سے مختلف، هر ایک مذهب نے جدا راسته بنا دیا :-

هر یک خبرے مخالف حال
دادند بقدر طبع جهال

لیکن فی‌الواقع قدم سب کا ایک هے اور گو کهنے والے هزار هیں لیکن سانس ایک هے :-

اما همه را قدم یکے بود
گو بنده هزار و دم یکے بود

آنحضرت کی نبوت سے دین مکمل هوگیا :-

چوں ماه محمدی بر آمد
ابلهس همه بسر در آمد
دور قمرش چویافت حالے
دیں یافت به عهد او کمالے

وه دنیا سے رحمت و حلم کی راه سے طلب علم کے لئے هدایت فرماتے تھے، دین خدا میں سب یک راے هیں :-

در دین خدا همه بیک راے
محراب نشین و منبر آرائے

لیکن یه صحرا نهایت دشوار هے اور وه لوگ رهبرانِ قافله هیں :-

ایں بادیه هست بس پریشاں
در قافله رهبرند ایشاں

هر مقام پاک، محراب هے ' اور یار کا اشاره، قبله :-

هر جا که مقام پاک سازند
محراب ز آب و خاک سازند
چوں قبلهٔ تُست اشارتِ یار
هر سو که بگفت سر فرود آر

(۸)

اس راستہ میں انسان کو اپنی وجہ سے دشواری ھے :-

حقّا کہ ترا دریں رہ تنگ
از صحبتِ تُست پاے در سنگ

سب سے پہلا کام راستہ کی جویائی ھے :-

اول بطلب رہ طلب را
آں گاہ شرائط ادب را

راہ سعادت میں ، سب سے پہلے طلب ھے اور پھر ارادہ :-

بشتاب کہ در رہ سعادت
اول طلبست پس ارادت

اس سفر میں توشہ و رھبر کی ضرورت ھے :-

زیرا کہ سفر دریں مراحل
بے توشہ و رھبر است مشکل

بغیر رھبر کے راستہ بھٹک جانے کا ڈر ھے :-

بے رھبرے گر بروں نہی گام
در بادیہ گم شوی سر انجام

اس لئے ایک پیر کی تلاش ضروری ھے :-

چوں طالب رہ شدی بہ تدبیر
دریاب نخست صحبت پیر

علم و عمل پر مغرور نہیں ھونا چاھئے :-

از علم و عمل مباش مغرور
میداں ھمہ را "ھباء منثور"

علم محض فریب ھے :-

علمت رخصت است و حیلہ

پندار عمل بھی توڑے جانے کے قابل ھے :-

پندار عمل به تست' بشکن
بنیاد غرور آن بیفگن

پھر پیر کیسا ھونا چاھئے :-

پیرے که جہان پاک بیند
پیرے که نه مبتلاے جاہ است
آن پیر که مقتداے راہ است

ایسا پیر که جو فروعات میں مشغول نه ھو بلکه اصول دین جانے :-

پیرے که نه در فروع ماند
پیرے که اصول دین داند

ایسا پیر جو که نور عشق سے مست ھو :-

پیرے که همچو سایه پست است
پیرے که ز نور عشق مست است

ایسا پیر جو که محقق بھي ھو اور و اصل حق بھي :-

پیرے که محقق است و کامل
پیرے که مقرب است و واصل

ایسے پیر کی خدمت میں مرید' عشق کي خلوت میں محد
ھو سکیگا :-

از نعمت پیر برخورد زود
سرمایۂ محنتش دھد سود
در خلوت عشق محرم آید
با اھل حضور ھمدم آید

ایسے پیر بہت کمیاب ہیں لیکن جو ہیں وہ حضرت کبریائي کے نقیب ہیں :-

این طائفہ در جہان غریب اند
در حضرت کبریا نقیب آمد

" نفس و تن و طبع را رها کن
یعني که خودي زخود جدا کن "

---

(۹)

یہہ ہے اس مثنوي کے مضامین و مباحث کا خلاصہ - اس کے خیالات سے اتفاق و اختلاف دونوں ممکن ہیں لیکن ان کی وسعت، جراءت، گہرائی اور آزادي سے انکار کرنا نا ممکن ہے جس قوت اور صفائي سے خدا تعالیٰ کي ذات و صفات کا ادراک، علم و حکمت کے ذریعہ سے ناممکن ہونا اُس نے بیان کیا ہے، انسان کا علوئے مرتبت، جس شان کے ساتھہ اُس نے دکھایا ہے، مذھبي رسم و رواج کي کورانہ تقلید کي، جن کھلے الفاظ میں اُس نے مخالفت کي ہے، اور تمام مذاھب کا ایک ھي مقصد ہونا ظاھر کیا ہے یا عشق کی ستایش، بے نفسي کا فلسفہ، اور رھبر کے کمالات، جس خوبي سے ادا کئے ہیں، وہ سب اور بہت سي دوسري خوبیاں، اس مثنوی کو فارسي ادب کا ایک بیش بہا شاہ کار بنادیتي ہیں اور اُس کے مصنف کي وسیع مشربی پر گواھي دیتي ہیں -

عزلت گزیني کا فلسفہ، ممکن ہے، موجودہ زمانے کے لوگوں کو اتنا خوش آئند معلوم نہ ہو - لیکن اُس کا بھي کچھہ اطلاق، ہر زمانے اور ہر شخص کیلئے ممکن ہے، زندگي کي کُچھہ پر سکون ساعتیں، ہر شخص

چاهتا هے ، جب دنیا کے بکھیڑوں سے الگ هوکر سوچ بچار' یا خدا کے دهیان، یا کسي بڑے یا اچھے کام کے خیال میں گذار سکے -

زندگی کي کشمکش میں' ایسي گھڑیاں مشکل سے هاتھه آتی هیں - لیکن جب هاتھه آجاتي هیں تو اُس کشمکش کي زندگي میں عجب لطف دیتي هیں -

اس لئے یه نهیں کها جا سکتا که گوشه نشیني کا فلسفه' زندگي میں بالکل بیکار هے -

البته وه صحیح استعمال چاهتا هے جس میں افراط و تفریط شامل نه هوں -

---

طنزیات اُردو

(از مسٹر رشید احمد صدیقی، ایم اے، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)

طنزیات ومضحکات کے سلسلہ میں اودھ پنچ کا تذکرہ' ضروری بھی ہے اور دلچسپ بھی - غالب کے عہد تک طنز اور ظرافت کا جو سرمایہ' اُردو میں ملتا ہے وہ "پنچانہ" رنگ سے گو بے نیاز نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس دور تک پنچ کو صحافتی درجہ حاصل نہیں تھا-اس بارہ خاص میں اودھ پنچ کو امتیاز تقدم حاصل ہے-اودھ پنچ کے بعد' ہندوستان کے دیگر حصص میں پنچ کی حیثیت سے مختلف جرائد شائع ہوئے اور اب بھی شائع ہو رہے ہیں لیکن خود اودھ پنچ کے رنگ کو اُنمیں سے ایک بھی نہیں پہنچ سکا -

منشی محمد سجاد حسین صاحب مرحوم نے سنہ ۱۸۷۸ ع میں اودھ پنچ کا اجرا کیا - اسوقت سیاسی مسائل' نسبتاً کچھہ زیادہ جاذب توجہ نہ تھے' اگر تھے بھی تو ایسے نہیں کہ انکی اصلاح یا انکا احتساب مقصود بالذات ہوتا - انپر اظہار خیال کیا بھی جاتا تو محض سرسری طور پر' وہ بھی تفریحاً - جو مسائل اسوقت منشی صاحب مرحوم اور انکے رفقائے کار کے پیش نظر تھے وہ بڑی حد تک معاشری یا مقامی تھے - مولوی سید محمد آزاد' یا اکبر حسین صاحب' اکبر کی طنز اور ظرافت کی آماجگاہ' حکومت اور سیاست نہیں بلکہ مغرب اور مغربیت تھی -

یہ یعنی منشی سجاد حسین مرحوم فالج میں مبتلا ہوئے لیکن یہ کلفت جسمانی اُنکی ہمت مردانہ اور شگفتگی طبع کو مضمحل نہ کرسکی - اودھ پنچ نکلتا رہا' فالج کا دوسرا دورہ ہوا ، قلمی معاونین کی صف بھی

اب کہیں کہیں سے خالي ہونے لگي تھي، کچھہ جان بحق ہوچکے تھے - بقیہ حق بخشوا رہے تھے - بچي کھچی' صرف سجاد مرحوم کي وضعداري رہگئي تھي جو بالاخر انکي زندگی اور انکي تمام ملک و معشیت کےساتھہ ختم ہوگئی اور اسطرح سنہ ۱۹۱۳ ع میں اودھ پنچ بند ہوگیا -

دو سال بعد سنہ ۱۹۱۵ع میں حکیم شیخ محمد ممتاز حسین صاحب نے (جنکے والد لکھنؤ کے تعلقہ داروں میں سے تھے) اودھ پنچ کو دوبارہ زندہ کرنے کا عزم کیا - حکیم صاحب موصوف' ریڈ کرشچین کالج میں اُردو شارٹ ہینڈ (مختصر نویسي) کے پروفیسر تھے اور اب اودھ پنچ کے ایڈیٹر ہیں - مولانا جسٹس کرامت حسین صاحب مرحوم کے مشورہ سے ممتاز حسین صاحب نے سنہ ۱۹۱۶ ع میں اودھ پنچ کو نئے سر سے شایع کیا اور اب تک ملک، ملت اور زبان کیخدمت میں مصروف و منہمک ہیں-

موجودہ عہد میں اودھ پنچ کا رویّہ' بحیثیت مجموعي' حسب ذیل مقاصد کا ترجمان ہے :-

۱ - بداخلاق اور بد مذاق کے سوانح ذاتیہ سے قطع نظر' عام بد اخلاقی اور بد مذاقي کي ہجو کیجائے -

۲ - آزادئي ملک - لیکن لب و لہجہ اشتعال انگیز ہونے کے بجائے ظرافت خیز ہو -

۳ - صحت اور سلاست زبان -

۴ - علمی اور فلسفیانہ مضامین کو بھي فروغ دیا جائے - بشرطیکہ شگفتگي اور ظرافت کا عنصر نمایاں طور پر غالب ہو -

۵ - مضحک تصاویر (کارٹون) سے طنز اور ظرافت کا اظہار اور اس کي اشاعت -

اودھ پنچ کے دور اول کے مشہور ترین مضحک نگار سرشار' اکبر اور آزاد تھے - موجودہ عہد میں سید مقبول حسین صاحب' ظریف اس

کے بہترین علمبر دار ہیں - اودھ پنچ کے دوسرے مضمون نگار اپنے نام کی اشاعت گوارا نہیں کرتے - ممکن ہے یہ طریقۂ کار بر بنائے مصلحت مناسب یا ضروری ہو لیکن اردو کی تاریخ مرتب کرنے والے نیز اُردو کے آیندہ انشاپردازوں کیلئے یہ "مصلحت" غیر مفید اور تکلیف دہ ثابت ہوگی - اسکی تلافی کی اگر کوئی ممکن اور معقول صورت ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ اودھ پنچ کے منتخب اور ٹکسالی مضامین کا مجموعہ کتابی شکل میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتا رہے -

اودھ پنچ کی سب سے نمایاں خصوصیت کارٹون کا شایع کرنا ہے - طنز اور ظرافت کا یہ پہلو اُردو میں کمیاب بلکہ نایاب تھا - اودھ پنچ کے بعض کارٹون اپنی ندرت اور جامعیت کے اعتبار سے یوروپین صحائف کے بعض بہترین کارٹونوں سے لگا کھاتے ہیں -

بعضوں کا خیال ہے کہ "پنچانہ ظرافت" اکثر ذوق سلیم پر بار ہوتی ہے - پنچ میں لکھنے والے اکثر حد اعتدال سے گذر جاتے ہیں - انکا مقصد طنز اور ظرافت کے بجائے تھکا فضیحت" ہوتا ہے اور اسطور پر پنچ کے ذریعہ سے سوقیانہ ظرافت اور بازاری پھکڑ کو بے جا فروغ حاصل ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ -

ممکن ہے یہ فرد جرم اودھ پنچ یا کسی اور پانچ پر کامیابی کے ساتھ لگائی جاسکے لیکن یہ کہنا کلیۃً صحیح نہیں ہے کہ پنچ اس قسم کے پھکّڑ یا فحاشی کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے - پنچ کا وسیلہ پھکڑ یا فحاشی ہوسکتا ہے - مقصد ہرگز نہیں ہوتا - پنچ کا مقصد عالمانہ اور فلسفیانہ ظرافت کی نشر و اشاعت نہیں ہوتا - اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ تبسم نہیں صرف قہقہہ کا قائل ہوتا ہے - اور اسمیں بھی شک نہیں کہ وہ تبسم سے زیادہ قہقہہ کا قائل ہوتا ہے - اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ قہقہہ پھکڑ یا فحاشی کا محتاج ہوتا ہے یا کوئی

سنجیدہ ظرافت بھي اسکي محرّک یا معین هوسکتي هے تو اس سے کون انکار کر سکتا هے کہ في الحقیقت متبسم هونے یا قہقہہ لگانے کا انحصار، نفس ظرافت پر اتنا نہیں هے جتنا خود متبسم هونے یا قہقہہ لگانے والے کي افتاد طبع پر - یہ بھي ممکن هے کہ اسکا تعلق نفس ظرافت سے هو بنابر آں خود ظرافت کو معقول اور مہذب هونا چاهئے - یہ اور بات هے کہ اسپر کوئي قہقہہ لگائے یا متبسم هو -

لیکن یہاں سوال یہ پیدا هوتا هے کہ "معقول" اور "مہذب" کا معیار کیا هے اور آیا پنچ اسکا پابند هے یا نہیں - سرسری طور پر اسکا جواب یہ هوسکتا هے کہ معقول اور مہذب کا معیار وهي هے جو معقول اور مہذب لوگوں کا شعار هو - لیکن سوال کا دوسرا حصہ یعني آیا پنچ کو اسکا پابند هونا چاهئے یا نہیں، کسیقدر پیچیدہ هے - بظاهر یہ جواب دیا جا سکتا هے کہ پنچ کو یقیناً اسکا پابند هونا چاهئے -

یہاں اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پنچ کا مفہوم خود "عام پسندی" سے وابستہ هے - لیکن خرابی یہ هے کہ یہی "عام پسندی" اکثر گر کر "عوام پسندی" کے حدود تک پہنچ جاتی هے-ظاهر هے جس تحریک کا مقصد "عام پسندي" هوگا وہ "عوام پسندي" پر ختم هوگا-پنچ بالعموم اپنا مخاطب عوام کو سمجھتاهے - ممکن هے پنچ کو اس سے انکار هو لیکن خود عوام اس سے کبھی انکار نہ کرینگے - یہاں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پنچ بعض پیچیدہ نکتے، دقیق مسائل، اور پر لطف اشارات کو اکثر ایسے انداز سے پیش کرتا هے کہ عوام اُسکو سمجھ سکیں یا نہیں لیکن اسپر سر دھننے کیلئے آمادہ هوجاتے هیں - تاهم یہ فن یا طریقۂ کار اپنے مقاصد کے اعتبار سے کتناهی مستحسن کیوں نہ هو، حد درجہ نازک اور خطرناک هے - اکثر ایسا هوتا هے کہ اس کوشش میں قطعاً ناکامیابي هوتي هے اور پنچ کي ظرافت، سرتاسر عامیانہ اور بازاري هوجاتی هے -

"عام پسند" یا "خاص پسند" کا مسئلہ نازک اور مشکل ہے۔ سیاسی اور معاشری مسائل کی اہمیت، ممکن ہے "عام پسندی" سے وابستہ ہو لیکن جہاں تک اسکا تعلق، طنز و ظرافت کے فن یا مذاق سلیم سے ہے یہ کہنے میں تامل نہیں کیا جاسکتا کہ طنز اور ظرافت کو ہر حال میں ٹکسالی ہونا چاہئے۔ عوام کے مذاق کو بھی "خواص" کی سطح پر لانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس کوشش کا سب سے پہلا اور سب سے قوی اثر یہ ہوگا کہ ظرافت کی سطح، مائل بہ پستی ہونے کی بجائے ہمیشہ مائل بہ عروج رہیگی۔ یہ چیز نہایت ضروری ہے اور ظاہر ہے اس مقصد کی کامیابی میں پنچ کی خدمات سے ہمیشہ رجوع کرنا پڑے گا۔

پست اور سستے قسم کی ظرافت کی اشاعت کا جرم، اودھ پنچ پر عائد ہوتا ہو یا نہ ہو، پنچ پر یہ پورے طور پر عائد ہوتا ہے اور یہاں بقول ہمارے ایک دوست کے، پنچ کے " شامل میں " وہ تمام اخبارات اور رسائل آجاتے ہیں جو اکثر پتلکی کاغذ پر شائع ہوتے ہیں اور جن کا سر ورق، اڈیٹر اور اڈیٹوریل اسٹاف کی " قلمی تصاویر " سے مزین ہوتا ہے۔ پنچ کے نام و نسبت سے بہار، ممالک متحدہ، دکن وغیرہ میں اکثر صحائف شائع ہوتے ہیں۔ ان سب کے مخاطب عوام ہوتے ہیں اور ان کی ظرافت بھی بازاری ہوتی ہے۔ یہ سب اپنی ابتدا اور ارتقا کے اعتبار سے اودھ پنچ کے تابعین اور تبع تابعین میں سے ہیں لیکن ان کو اپنے مورث یا مرشد سے وہی نسبت ہے جو آج کل کے پیر پیشواؤں کو قدیم اکابر دین سے ہے۔ حسن و عشق کو جتنا طوائفوں اور شاعروں نے بدنام کیا ہے اس سے کچھہ سوا ہی طنز اور ظرافت کو پنچ اور...... (یہ الفاظ اصل مسودہ میں صاف پڑھے نہیں گئے! رشید) نے رسوا کیا ہے۔"

اودھ پنچ کی روایات کی ابتدا منشی سجاد حسین کی بیباک صداقت اور بے لاگ ظرافت سے ہوئی اور اب اس کی تکمیل کی ذمہ‌داری حکیم شیخ ممتاز حسین صاحب کے سپرد ہے اور یہ اودھ پنچ کی انتہائی خوش نصیبی ہے - حکیم صاحب کی علمی قابلیت اور ہمہ دانی مسلم ہے - راقم‌السطور نے ان کو قدیم وضعداری اور جدید روشن خیالی کا ایک متوازن پیکر پایا - لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ اس کی بھی قسم نہیں کھائی جاسکتی کہ وہ طنز اور ظرافت کے فلسفہ اخلاق کے بھی ماہر ہیں - اودھ پنچ میں اکثر مضامین ایسے بھی پائے گئے جن کو شائع نہ کرنا بہتر تھا جن کی ظرافت ؟ مشتبہ اور دل آزارانہ تنقید ؟ مسلم تھی - اودھ پنچ کو کسی مخصوص جماعت کے مسلک و مشرب کے خلاف ؟ اپنی طنز یا ظرافت کی خواہ مخواہ یا مسلسل اشاعت نہ کرنی چاہئے - طنز یا ظرافت کا شمار ؟ دنیا کے بعض مہلک ترین اسلحہ میں ہوتا ہے - اُس کے استعمال کا منصب ہر وقت ہر سپاہی یا پیادہ کو نہ ہونا چاہئے بلکہ سپہ‌سالار کی خاص اجازت پر اور اُس کی براہ راست نگرانی میں اس کو استعمال میں لانا چاہئے -

اگر اکبر ؟ سرشار اور آزاد ؟ قدیم اودھ پنچ کے آوردوں میں سے تھہ تو اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سید مقبول حسین ؟ ظریف ؟ جدید اودھ پنچ کے چشم و چراغ ہیں - جہاں تک معلوم ہو سکا ہے سید صاحب ؟ ظریف شاعر ہیں - راقم‌السطور کی نظر سے ظریف صاحب کا کوئی ایسا مضمون نہیں گذرا جو نثر میں ہو - ممکن ہے ظریف صاحب نے نثر میں بھی ظرافت نگاری کی ہو لیکن اس کو قبول عام نصیب نہیں ہوا - ظریف صاحب کی ظرافت

بالعموم "زبان" اور "بیان" سے وابستہ ہوتی ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ واقعات اور حالات پر ان کی نظر نہیں ہوتی - کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کی زبان اور ان کا بیان، اس درجہ بے ساختہ اور لطیف ہوتا ہے کہ سننے اور پڑھنے والا بے اختیار ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے - موجودہ دور میں ظرافت نگار شاعر کی حیثیت سے ظریف صاحب کا پایہ اپنے معاصرین سے بہت بلند ہے -

راقم‌السطور کا خیال ہے کہ ظریف صاحب کو تمثیل نگاری (ڈرامہ) کی طرف توجہ کرنا چاہئے - اس میں شک نہیں کہ تمثیل نگار کے لئے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ظریف صاحب میں غالباً بدرجہ اتم موجود نہیں یعنی وہ انسانی فطرت اور معاشرت کی نزاکت اور حقائق سے پورے طور پر آشنا نہیں معلوم ہوتے تاہم اس سلسلہ میں جہاں تک زور بیان یا لطف بیان کا تعلق ہے (اور یہ عنصر بھی کچھ کم وقیع نہیں) وہ اس فن کے امام ہیں -

سلطان حیدر جوش (علیگ) کی طنز میں، فلسفیانہ ظرافت اور ظرافت میں فلسفیانہ طنز کا دلنشین عنصر، بہت نمایاں ہے- اس قسم کی ظرافت اور طنز کی ابتداء اُردو ادب میں کسی نہ کسی حد تک، سلطان حیدر صاحب ہی کی جدت طبع کا نتیجہ ہے - جوش غالباً پہلے لکھنے والے ہیں جنھوں نے اُردو طنزیات اور مضحکات میں مغربی آب و رنگ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی- انکی تحریر میں اسپکٹیٹر کی نشتریت بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہے گو اسپکٹیٹر کی رعنائی خیال، پاکیزگی بیان، ژرف نگاہی، ایجاز و اختصار اور بے ساختگی کا فقدان بھی ہے - سلطان حیدر، کہنہ مشق انشا پرداز ہی نہیں بلکہ پختہ کار شخص بھی ہیں- انکے

خیالات میں بے ساختگی اور برجستگی کی کمی کو انکا عمیق تجربہ اور عمیق تر احساس ذمہ داری پورا کردیتا ہے ۔ اُنکی تحریر میں غیر ذمہ دارانہ فقرے بہت کم نظر آئیں گے-یہ اُنکی انشاپردازی؟ کا ممکن ہے؟ کمزور پہلو ہو لیکن انکی شخصیت کا طرۂ امتیاز یقیناً ہے؟ -

شوکت تھانوی اور ملا رموزی کا انداز تحریر تقریباً ملتا جلتا ہے - یہاں ملا رموزی کے اس رنگ سے بحث نہیں ہے جو اُنہوں نے ابتدا میں "گلابی اُردو" کے تحت میں اختیار کر رکھا تھا - گلابی اُردو کی تشریح ' نازش ' رضوی صاحب نے یوں کی ہے :-

"گلابی اُردو میں ملا رموزی صاحب نے مشہور فارسی عربی ضرب الامثال ' اشعار اور مقولوں کے اُردو ترجمہ میں اپنے اجتہاد و تصرف سے جو ندرت و شفتگی پیدا کی ہے وہ ادبیات اُردو میں زعفران زار کی حیثیت حاصل کر چکی ہے" -

ملا رموزی نے وہ رنگ اب تقریباً ترک کردیا ہے - اِن کا موجودہ انداز تحریر اور موضوع ایک حد تک عام پسند اور عوام پسند دونوں ہے - شوکت تھانوی کے مضامین کا اُٹھان اور لب و لہجہ بھی ملا رموزی کی طرح قطعاً بازاری تو نہیں لیکن "روز مرّہ" ضرور ہے - جزئیات کے دونوں امام ہیں - خوب سوجھتی ہے لیکن کہنے کا انداز' بسا اوقات ضرورت سے زیادہ صاف اور بے جھجک ہوتا ہے - ملا رموزی کی اُردو میں شگفتگی اور برجستگی بھی ہے' شوکت تھانوی کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح اُردو لکھہ ضرور لیتے ہیں - لیکن ایسا کرنے میں اُن کو کوشش بھی کرنی پڑتی ہے - یوں سمجھہ لیجئے کہ رموزی' لکھتے ہیں اور چھپوا دیتے ہیں - تھانوی ' سوچتے ہیں ؟ لکھتے ہیں ' مسودہ صاف کرتے ہیں اِس کے بعد چھپواتے ہیں -

شوکت میں "شگفتگی" ضرور ہے لیکن ابھی " شگفتہ نگاری " پر پوری قدرت حاصل نہیں ہوئی ہے اِس کا سبب ' ممکن ہے؟ یہہ ہو کہ اُنہوں نے مطالعہ پر کافی وقت نہیں صرف کیا ہے - لکھنا بغیر پڑھنے کے نہیں آتا اور پڑھنا بغیر لکھنے کے بے کار ہے - ملا رموزی کی تحریر میں اتنی پختگی ہے کہ آیندہ اُس میں اصلاح یا ترقی کی گنجایش نہیں معلوم ہوتی - شوکت میں ابھی ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں - یہی نہیں اگر وہ ترقی کی کوشش نہیں کرینگے تو بہت ممکن ہے اُن کی شخصیت اور انشا پردازی دونوں خطرہ میں پڑ جائیں - اُن کو ابھی سے خرمن جمع کرنے کی فکر دامنگیر معلوم ہوتی ہے حالانکہ ابھی اُن کی کھیتی لہلہانی بھی شروع نہیں ہوئی ہے -

مرزا عظیم بیگ چغتائی بحیثیت ایک ظرافت نگار کے اُردو ادب میں " نوخیز " ہیں - یہاں اُن کے مصنف ہونے کی حیثیت ' معرض بحث میں نہیں ہے - اِس کا اعتراف نہایت بلند آہنگی کے ساتھہ ' انہوں نے خود کیا ہے جس کی داد نہ دینا کم ظرفی بھی ہے اور بد مذاقی بھی ' مثلاً فرماتے ہیں -

" میں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور مصنف ہونا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں - جب نویں جماعت میں تھا تو "قصر صحرا" لکھی - جب انٹرنس میں گیا تو "قصر صحرا" کا حصہ دوم لکھا اور جب بی اے میں آیا تو موجودہ پردہ کی بدعت کے خلاف' پبلک کے سامنے " قرآن اور پردہ " کو پیش کیا...... مجھے کچھہ اپنی طرز تحریر اور زبان کے بارے میں بھی کہنا ہے - میرے تمام افسانے اوریجنل ہیں' واقعات سے پر' بحمداللہ میرے تمام افسانوں کے ہیرو بقید حیات ہیں' تمام تر افسانوں کے پلاٹ میں نے واقعات اور اپنی معاشرت سے لئے ہیں اور کسی افسانہ میں افسوس، کہ میں مشہور یورپین یا امریکن افسانہ سے کچھہ بھی نہیں لے سکا . "

مرزا چغتائی نے مزاحیہ مضامین لکھنا نسبتاً حال ھی میں شروع کیا ھے اور یہ کہنے میں بمشکل کسی کو تامل ھوگا کہ اپنے انداز میں وہ قطعاً منفرد اور قطعاً کامیاب ھیں ۔ انکا یہ ادعا کہ "تمامتر افسانوں کے پلاٹ ، میں نے واقعات اور اپنی معاشرت سے لئے ھیں" جتنا صحیح ھے اتناھی مبارک اور مستحسن ھے ، اور یہی سبب ھے کہ اُن کی تحریر میں ان کی شخصیت اور انفرادیت بدرجہ اتم نمایاں ھے ۔ "واقعات" اور "معاشرت" کا سہل ، سادہ اور دلچسپ رنگ ، ان کی تحریر اور طرز تحریر ، دونوں پر چھایا ھوا ھے ان کی تحریر سادہ ھے لیکن "سپاٹ" یا بے رنگ نہیں ۔ یہ ان کے خلوص اور ہمدردی ، کا ثبوت ھے اور ثبوت ھی نہیں بلکہ فیضان بھی ۔ ان کی تحریر میں کہیں زھرناکی یا کھلنگی نہیں پائی جاتی ، ھمیشہ نہیں تو کبھی کبھی یہی زھر ناکی اور کھلنگی ، کمینگی یا کم ظرفی میں تبدیل ھو جاتی ھے ، طنز یا ظرافت بڑی خطرناک سر زمین ھے ذرا لغزش ھوئی اور لکھنے والا کہیں کا نہ رھا ۔

مرزا چغتائی کی رگ و پے میں مشرق اور مشرقیت سرایت کئے ھوئے ھے ۔ ان کو اردو لکھنے پر کافی قدرت ھے ۔ اپنی ان دونوں حیثیتوں پر وہ کبھی ظلم نہیں کرتے اور یہی سبب ھے کہ ان کے الفاظ اور مفہوم ، دونوں میں بے ساختگی اور شگفتگی ھوتی ھے ۔ اس بےساختگی اور شگفتگی میں ایک خفیف سی جھلک "قلندرانہ پن" کی بھی ھے (جسکو حسن یا قبح دونوں سے تعبیر کر سکتے ھیں) لیکن امید ھے کہ سن و سال کا بار ، حشو و زوائد کو زائل کردے گا اور یہ دیوار قہقہہ کبھی نہ کبھی تاج محل بنکر رھیگی ۔ بشرطیکہ آیندہ وہ خود اپنی تصانیف کا مقدمہ نہ لکھا کریں

جسکا حوالہ ابتدا میں دیا گیا ہے !! امید ہے کہ رسالوں کے مختلف اور بے شمار اڈیٹر صاحبان بھی ان پر رحم‌فرمائیں گے' کیونکہ مرزا صاحب کی مروت ' ان کو " بسیار نویسی " پر مجبور کرتی ہے اور بسیار نویسی کا دوسرا نام کم سے کم صحیفۂ ظرافت میں " لغویت " بھی ہے !!

' پطرس ' (اے ایس بخاری)

پطرس اور " پطرس کے مضامین " دونوں کا تعارف کتاب کے دیباچہ سے ہو جاتا ہے :—

" اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھپر احسان کیا ہے ' اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں ' اگر اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھکر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں -

ان مضامین کے افراد' سب خیالی ہیں حتی کہ جن کے لئے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی "ہر چلد کہیں کہ ہیں نہیں ہیں" - آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی - ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے -

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کریں "

یہ دیباچہ نہیں ' غزل ہے اور جو شخص ایسی غزل لکھ سکتا ہے اس کے سارے قصور معاف کئے جا سکتے ہیں خواہ وہ غلط اردو ہی لکھتا کیوں نہ ہو !

پطرس بالعموم غلط اُردو نہیں لکھتے' خاص خاص مقامات پر ان کو متشابہ ضرور لگتا ہے جہاں وہ اُردو کو مقامی رنگ دے جاتے ہیں - ان کی اُردو اکتسابی ضرور ہے لیکن ظرافت قطعاً وہبی ہے - پنجاب میں اچھی اور صحیح اُردو لکھنے والے سر عبدالقادر' سر اقبال اور ظفر علی خاں ہیں - پطرس اچھی اُردو اب بھی لکھہ لیتے ہیں اور یقین ہے کہ سر بننے یا جیلخانہ جانے سے پہلے وہ صحیح اُردو بھی لکھنے لگیں گے!

پطرس کی ظرافت کا آرٹ' الفاظ میں نہیں' واقعات میں ہوتا ہے - ان کی تحریر فضا پیدا کرتی ہے نہ کہ نغمہ ؟ پھر یہ بھی ہے -

نغمہ اندر تست اندر نغمۂ داؤد نے

پطرس کی ظرافت "مغربی اکتسابات" میں پھلی پھولی معلوم ہوتی ہے لیکن اُردو کی فضا میں پہونچکر رنگینی اور رعنائی کے اعتبار سے دو آتشہ ہو گئی ہے !

پطرس اگر برابر لکھتے رہے اور مرزا عظیم بیگ چغتائی اور فرحت اللہ بیگ نے لکھنا کم کردیا تو یقین ہے کہ اُردو ادب میں ظرافت کا عنصر بغایت وقیع ' بغایت دلکش اور بغایت مہتم بالشان ہوجائے گا اور شاید ایسا کہ ایشیا کی کسی زبان میں اس کی مثال نہ مل سکے !

بااینہمہ جہانتک طنز یا ظرافت کا تعلق ہے "مضامین پطرس" ارض پنجاب میں دیوان غالب کی نہیں تو "مرقع چغتائی" کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں !

بعض نمونے حسب ذیل ہیں '

کتے :—

"...................کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گد گدائی تو اُس نے

باهر سڑک پر، طرح کا ایک مصرعہ دے دیا - ایک آدھ ملٹ کے بعد سامنے کے بنگلہ میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کردیا - پھر تو جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا، ایک حلوائي کے چولہے میں سے باهر لپکے اور بھنّا کے پوري غزل مقطع تک کہہ گئے - اس پر شمال مشرق کي طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دي - اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھہ نہ پوچھئے، کمبخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھہ لائے تھے - کئي ایک نے في البدیہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے، وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا - ہم نے کھڑکي میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر - آرڈر" پکارا لیکن ایسے موقعہ پر پردھاں کي کوئي نہیں سنتا..........."

"........چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لئے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھي اتفاق نہیں ہوا - یعني کسي کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا - اگر ایسا سانحہ کبھي پیش آیا ہوتا تو اس سر گذشت کي بجائے، آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا - تاریخي مصرعہ دعائیہ ہوتا " کہ اس کتے کی مٹي سے بھي کتا گھاس پیدا ہو " لیکن،

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بري بلا ہے

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایکبار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مُصر ہیں سمجھہ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں - اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھہ نرالے ہیں یعني ایک تو متعدي مرض ہے اور پھر بچوں بوڑھوں سبھي کو لا حق ہے - اگر کوئي بھاري بھرکم اسفندیار کتا کبھي کبھي اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے بھونک لے

تو ہم بھي چار و ناچار کہدیں کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہئے) لیکن یہ کمبخت دوروزہ سہ روزہ دو دو تہن تین تو لے کے پلے بھي تو بھونکنے سے باز نہیں آتے - باریک آواز ، اتنا سا پھیپھڑا ، اس پر بھي اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کي لرزش ، دُم تک پہنچتی ہے............کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کي آواز ، سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کردیتی ہے - خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ ، باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کردے تو آپ ھي کہئے ؟ ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں ؟ - ہر ایک کي طرف باري باري متوجہ ہونا پڑتا ہے - کچھہ انکا شور ، کچھہ ہماري صدائے احتجاج (زیر لب) ، بے ڈھنگي حرکات و سکنات (حرکات ان کي ، سکنات ہماري ،) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے ؟ ....پہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کي نا انصافي ، میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفریں رہي ہے - اگر ان کا ایک نمائندہ ، شرافت کے ساتھہ ہم سے کہدے کہ ""عالي جناب ! سڑک بند ہے"" تو خدا کی قسم ! ہم بغیر چوں و چرا کئے ہوئے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئي نئي بات نہیں - ہم نے کتوں کی درخواست پر کئي راتیں سڑک ناپنے میں گذار دی ہیں-لیکن پوري مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر، سینہ زوري کرنا ایک کمینہ حرکت ہے (قارئین کرام کي خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئي عزیز و محترم کتا، کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جاے - مجھے کسي کي دلشکنی مطلوب نہیں) ""

""خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں - کتے اس کلیّے سے مستثنیٰ نہیں - آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں - جب

چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے، گویا بار گناہ کا احساس آنکھ
اٹھانے نہیں دیتا - دُم پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے - سڑک کے
بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کرلیتا ہے ؟
شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے -
کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا - گاڑی کے مختلف حصوں کو
کھٹکھٹایا - لوگوں سے کہلوایا - خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں تو
اپنے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا، صورت حالات کو
ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں - کسی نے ایک
چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز
پرے جا لیٹے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر
شروع کر دیا - کسی بائسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے ہی لیٹے
سمجھ گئے کہ بائسکل ہے، ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے وہ رستہ چھوڑ
دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں -

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دم کو تا بحد امکان
سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے اِس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی
آزمایش مقصود ہوتی ہے - جہاں آپنے غلطی سے اُس پر پاؤں رکھدیا -
انھوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کردی "بچا !
فقیروں کو چھیڑتا ہے، نظر نہیں آتا، ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں"
بس اس فقیر کی بد دعا سے اُسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے، بعد
میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے
ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے - آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں
چار پائی کی ادوائن میں پھنسے ہوتے ہیں -

اگر خدا مجھے کچھ عرصہ کے لئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی
طاقت عطا فرمائے تو جنون انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے - رفتہ

رفتہ سب کتے، علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں.........انگریزی میں ایک مثل ہے کہ ''بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے'' یہہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھوکنا بند کردے اور کاٹنا شروع کردے''

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب - بی - اے (ملیگ) یوں تو حال ہی میں اس حمام (ظرافت) میں برہنہ ہوئے ہیں لیکن تیور اور دم خم دیکھکر علیگڈہ والوں کی زبان اور مفہوم میں اُن پر ''بڑا پرانا'' ہونے کا فقرہ پورے طور پر چسپاں ہوتا ہے اور پرانا بھی ایسا کہ ''نا'' کا تلفظ اسطور پر کیجئے یا کرتے جائے کہ آپ کا سانس اُس وقت توٹے جب زندگی خطرہ میں پڑنے لگے !

جہاں تک راقم‌السطور کی یاد رفاقت کرتی ہے مرزا صاحب کا پہلا مضمون ''اُردو'' میں ''سنہ ۱۹۱۲ء کا ایک تاریخی مشاعرہ'' کے عنوان سے شایع ہوا تھا - ''پہلا مضمون'' سے ایسا مضمون مراد ہے جسکو خالصاً ظریفانہ نہیں تو اُس کا مقدمہ ضرور کہہ سکتے ہیں-اِس کے بعد'' پھول والوں کی سیر'' اور مولانا نذیر احمد مرحوم کی سیرت اور دیگر مضامین شائع ہوئے - بہر حال یہہ تو مرزا صاحب کی ''عمر ظرافت'' یا ''ظریفانہ عمر'' کی ''کھٹیونی'' ہوئی جس سے ناظرین کو تو کیا ''فاعتبروا یا اولی‌الابصار'' کو زیادہ فائدہ حاصل ہوگا -

ہاں تو کہنا یہہ تھا کہ مرزا صاحب، حال ہی میں اس حمام میں برہنہ ہوئے ہیں لیکن اِس میں شک نہیں وہ ''باتھہ روم'' میں نہیں بلکہ ''حمام'' ہی میں برہنہ ہوئے ہیں اور حمام کی برہنگی کا مشرقی مفہوم تہبند ہے جس کو مرزا صاحب نے ترک نہیں کیا ہے اور خوب کیا ہے - باتھہ روم کا غسل اور وہاں کی برہنگی، آرٹ اور حفظان صحت کے اصول پر، ممکن ہے، صحیح ہو لیکن مشرق اور مشرقیت ابھی

اِس سے ہم آہنگ نہیں ہو سکي ھے اور شاید ہو بھي نہیں سکتي - مرزا صاحب کا تہبند بھي وھي دداجان کي "گاڑھے کي تہمد" ھے جس میں ستر ظرافت چھپي ہوتي ھے ' - اُن کي نہیں اُن کے آرٹ کي!

فرحت اللہ بیگ صاحب کو عہد مغلیہ کے آخري دور کي معاشرت اور تمدن کا صحیح اور دلکش تریں مرقع کھینچنے پر بڑي قدرت حاصل ھے - ایسي قدرت جو بعض ناگزیر کوتاھیوں کے ساتھہ آپکو مولانا راشدالخیري اور حکیم ناصر نذیر ' فراق کي تحریروں میں بھي نظر آسکتي ھے اور اُس کا سب سے بڑا سبب یہہ ھے کہ اُنھوں نے دلي ھي میں آنکھہ کھولي اور دلي والوں کي آنکھیں بھی دیکھیں - اِس لئے وہ یا آغا حیدر حسن صاحب (بقول علیگڈہ والوں کے "ددا سوبھا") دلي کے سلسلہ میں جو کچھہ کہہ سن جائیں گے وہ باھر والوں یا والیوں کو کہاں نصیب! - فرحت صاحب کي ظرافت میں انتہائي سادگي کے ساتھہ ' زبان اور بیان کا چٹخارہ بھی ہوتا ھے لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ یہ بھي کہنا پڑتا ھے کہ بعض اوقات وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر محاورہ یا زبان یا ضرب‌الامثال‌کي بے محل نمائش بھي کر جاتے ھیں اور مضمون کا اتنا حصہ قدرتاً مصنوعی معلوم ہونے لگتا ھے - چغتائي اور فرحت صاحبان کي انداز تحریر کا امتیاز خصوصي یہي ھے کہ چغتائی ' الفاظ ' "محاورہ" زبان یا ضرب‌الامثال کي کبھی نمائش نہیں کرتے لیکن فرحت صاحب کو چغتائي پر اس اعتبار سے تفوق حاصل ھے کہ فرحت صاحب کي ظرافت ' بعض اھم اور سنجیدہ مقاصد کي ترجمان بھي ہوتي ھے - چغتائي صاحب کي مانند ' فرحت صاحب کو بھي جزئیات خوب سوجھتی ھیں اور یہي چیز صحیفۂ ظرافت میں "جان سخن" بھي ھے لیکن فرق یہ ھے کہ فرحت کي سوجھہ میں بوجھہ کو بھي دخل ہوتا ھے اور چغتائي کو صرف سوجھتی ھے-لیکن خوب سوجھتي ھے!

فرحت صاحب کے مضامین کے مطالعہ کے بعد، ہم بے اختیار کہہ پڑتے ہیں :—

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی !

چغتائی صاحب کے مضامین پڑھنے کے بعد :—

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے !

اس سلسلہ میں بے جا نہ ہوگا اگر یہاں مرزا صاحب کے مضمون کا ایک حصہ ناظرین کے ملاحظہ کے لئے پیش کردیا جائے -

"......محاوروں کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے ان کا جھگڑا ہوا کرتا تھا، میں ہمیشہ کہا کرتا تھا "مولوی صاحب! (ڈاکٹر نذیر احمد صاحب) آپ نے محاوروں کی کوئی فہرست تیار کرلی ہے اور کسی نہ کسی محاورہ کو آپ کسی نہ کسی جگہ پھنسا دینا چاہتے ہیں خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو - جناب والا! اہل زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ محاوروں پر حاوی ہے یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں، دہلی والے ہیں"......مجھکو مولوی صاحب کی طرز تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اول تو میرے لئے ابتدا ہی میں "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے..........محاوروں کے استعمال کا شوق، مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا، تحریر میں ہو یا تقریر میں، وہ محاوروں کی ٹھونسم ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کردیتے تھے اور بعض اوقات ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے - خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا، ایسے ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے........"

محاوروں کی "ٹھونسم ٹھانس" پر مرزا صاحب، اپنے استاد سے

کافی برهم نظر آتے هیں لیکن جیسا اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ھے شاگرد اور استاد' اس سلسله میں ایک هی تھیلي ۰۰۰۰ نہیں ۰۰۰۰۰ ایک هی تھیکرے ... لیکن لاحول ولاقوۃ ! یه مرض تو کچھه متعدي سا معلوم هوتا ھے !

مرزا صاحب کا یه مضمون "مرقع نگاري" کا بهترین نمونه ھے ۔ اس کا جواب اُردو ادب میں شاید معدوم ھے !!

سجاد علي انصاري مرحوم - بی اے' ال ال بی (علیگ) ۔

سجاد اور مهدي (افادي مرحوم) اُردوئے جدید کے رنگ و بو تھے ۔ ان کو اُردو کا نشاۃالثانیه کهنا روا ھے ۔ ذوق صحیح اور طنزیات جدید کا امام ' آہ دنیا سے ابھي اُٹھا ھے ۔ سجاد مرحوم اپنے معتقدات کے اعتبار سے کچھه ھي کیوں نه رھے هوں ان کے اُٹھه جانے سے' اُردو کي محفل میں ایسي جگه خالي هوئي ھے جس کا' مستقبل قریب میں پُر هونا آسان نہیں ھے ۔ وہ محتسب نہیں فصّاد تھے اور بے پناہ اور کامل الفن فصّاد ۔ انھوں نے "بد مذاقي" اور "بد توفیقی" کی رگ و پے پر خوب خوب نشتر زني کی ھے - انھوں نے فریب کو کبھي پلنپنے نه دیا - بعض طبائع کو ان سے ناگواري بھی پیدا هوئي لیکن بناء مخاصمت ' معتقدات تھے نه که ان کا آرٹ ! واقعه یه ھے که سجاد کو فریب سے دشمني تھی اور وہ بھي ازلی ' وہ هر فریب سے بیزار تھے خواہ اس کا اثر دوسروں پر پڑتا' یه اس کا مورد خود "فریبي" هوتا ۔ وہ مذهب نہیں "مذهبی" کے درپے تھے - اس میں شک نہیں وہ اصلاح کے قائل نه تھے ان کا ایمان صرف جهاد پر تھا - جهاد کامیاب هوا هو یا نه هو سجاد یقیناً کامیاب رھے !

سجاد مرحوم کا عقیدہ تھا که لطافت خیال هی خلاصه کائنات ھے اور لطافت خیال ' معتقدات کی کورانه پیروی سے بالاتر ھے - سجاد

کی خصوصیت انشا یہ تھی کہ وہ جو کچھہ کہنا چاھتے تھے جلد از جلد اور کم سے کم الفاظ میں کہدیا کرتے تھے ۔ طنزئیوں کا مسلک یہ ہونا چاھئے کہ دوسروں کے جذبات کا احترام کرنے کے قبل' واقعات کی ترجمانی کریں ۔ اگر یہ نہیں تو پھر اسے طنزیات نہیں سیاسیات قرار دینا چاھئے اسی وجہ سے طنزیات کی وادی نہایت پر خطر ہے ؛ یہاں مفاهمہ نہیں صرف مصادمہ ہے ۔ نظر براں اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انتہائی جرات ؛ صحت ذوق اور قدرت بیان کی ضرورت ہے ۔ سجاد مرحوم ان صفات کے مسولیلی تھے ؛ قوموں کی مانند ادبیات کی زندگی میں بھی ایک دور ایسا آتا ہے جب اس میں مصطفی کمال اور مسولیلی کا پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے ۔

سجاد مرحوم کے مضامین کا مجموعہ منتشر خیال ؛ کے نام سے شائع ہو چکا ہے ؛

مولانا نیاز فتحپوری نے ایک جگہ لکھا ہے :—

" مزاح نگار کی حیثیت سے اس وقت پطرس ؛ رموزی ؛ رشید اور عظیم چغتائی بہت مشہور ہیں.......... چغتائی صاحب کی مزاح نگاری اکثر و بیشتر منحصر ہوتی ہے صرف پلاٹ یا واقعات پر' یعنی وہ حالات ایسے پیش کرتے ہیں جو مشاهدے کے بعد یوں بھی ہر شخص کو ہنسا سکتے ہیں ۔ رموزی کی مزاح نگاری منحصر ہے اس امر پر کہ وہ الفاظ یا فقروں کا استعمال ' ان کے عام متبادر معنی سے ہٹ کر کرتے ہیں ۔ رشید صاحب کی مزاح نگاری کا دور اولین ' فلسفیانہ مزاح نگاری کا بہترین نمونہ تھا ۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ ' زیادہ تھک گیا ہے اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاھتے ہیں نہ کسی اور کو مبتلا کرنا چاھتے ہیں ' تا ہم کوئی

نہ کوئی سلجھیدہ نتیجہ ان کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے ۔ پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی رنگ کی ہے جس میں واقعہ و انداز بیان' دونوں سے مضحک کیفیات پیدا کی جاتی ہیں لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ہمارے لئے یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس میں واقعی کسی تلخ حقیقت (grim reality) کا مطالبہ پیش کیا گیا ہے ۔ حالانکہ ایک مزاح نگار کا حقیقی کمال یہی ہے ۔ شوکت کی مزاح نگاری بھی اِس خصوصیت سے معرا ہے اور وہ بھی سطحی طور پر اپنے موضوع سے گزرنا چاہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان کے یہاں زبان کا لطف ' مشاہدہ جزئیات ' اور لطافت خیال یہ سب اس قدر خوبی کے ساتھ ملے ہوئے ' نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی فضا خاص پیدا کرلیتے ہیں..... "

پطرس ' رموزی ' اور عظیم چغتائی کے بارے میں مولانا نیاز نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کی ذمہ‌داری خود ان پر یا پھر اس " تثلیث " یا بقول شخصے " تگڈم " پر عائد ہوتی ہے ۔ البتہ " رشید صاحب " سے متعلق جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس کا کم سے کم یہ فقرہ : —

" شاید ان کا دماغ زیادہ تھک گیا ہے "

قطعاً صحیح ہے بشرطیکہ دماغ کے ساتھ اب قلم بھی شامل کر لیا جائے ۔ چنانچہ بقیہ آیندہ اڈیشن میں !

---

* تثلیث کا مفہوم تگڈم سے ادا کرنا ' یاد نہیں آتا ' کسکی جدت طبع ہے ۔ ممکن ہے خود میری ہو ' ممکن ہے کسی اور "صدیقی" کی ہو ۔

حکیم سید ضامن علي جلال لکھنوي
اور ان کي شاعري

(از مولوي عبدالسلام ندوي ' صاحب شعرالهند)

دامن دولت سے وابستگي بھي عجیب چیز ھے ؟ دنیا میں سیکڑوں اشخاص نے اسکي بدولت ؟ اس سے زیادہ ناموري حاصل کي ھے ؟ جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے ؟ اور ھزاروں ناموروں نے اس کے ظل عاطفت سے محروم رہ کر گمنامي کي زندگي بسر کي ھے ' اور اگر تھوڑا بہت چمکے بھي ھیں ' تو ان کي یہ چمک' شب تار میں جگنو کي چمک' سے زیادہ دیرپا نہ تھي ' اس کي سب سے قریب تر مثال منشي امیر احمد لکھنوي ' نواب مرزا داغ دھلوي ' اور حکیم سید ضامن علي جلال لکھنوي کا نام و کلام ھے ' ان تینوں بزرگوں کي شاعری کا زمانہ ایک ھے ' تینوں کے تینوں ؟ صاحب دیوان ھیں ' تینوں نے رامپور میں مدتوں ایک ھي رئیس کے ظل عاطفت میں زندگي بسر کي ھے ' اور تینوں نے متعدد دیوانوں کے ساتھہ اپنے تلامذہ کي ایک بہت بڑي جماعت اپني یادگار میں چھوڑی ھے ' لیکن نواب کلب علي خاں کے شرف استادي نے امیر کو " امیرالشعراء " بنا دیا اور حضور نظام کي استادي سے داغ " بلبل ھندوستان " اور " فصیح الملک " ھو گئے ' لیکن غریب جلال' جو اس سے بھي زیادہ شاندار خطابات کا مستحق تھا ' کچھہ نہ ھوا ' اور لکھنؤ کے ایک دور افتادہ محلہ " منصور نگر " میں اپني زندگي کے

آخري دن، نہایت ضیق و گمنامي میں بسر کئے ، لیکن اگر ڈوبے ہوون کو نکالنا ، دبے ہوون کو ابھارنا ، اورزبجھے ہوؤں کو چمکانا ایک شریفانہ کام ھے ، تو اس شریفانہ جوہر کو حکیم سید ضامن علي، جلال کے چمکانے میں صرف کرنا، اردو شاعري کي تنقیدي تاریخ کے سلسلے میں ایک شریف آدمي کا سب سے بڑا علمي فرض ھے - اسي خیال سے میلے شعرالهند میں کسي قدر دبي زبان سے حکیم جلال کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کیا تھا ، لیکن میرے خیال میں وہ بالکل نا کافي ھے ، اور ان کي شاعری ایک مستقل ، اور مبسوط تنقید کي محتاج ھے ، اسلئے اب میں رسالہ هندوستاني کے ذریعہ سے اس بدر کامل کو مناسب اور منصفانہ طور پر نمایاں کر دینا چاهتا هوں تا کہ اس کو اس شکایت کا موقع نہ رھے -

اگر چہ بدر هیں پر خاک میں ملے هیں جلال
مٹے ہووں کا فروغ کمال کیا ہوگا

جو لوگ اردو شاعري سے واقف هیں ان کو معلوم ھے کہ ابتداهي سے لکھنؤ میں شاعري کے دو مختلف اسکول اور دو متضاد رنگ قائم ہو گئے تھے ، ایک اسکول یا ایک رنگ، شیخ نا سخ کا تھا جس کي نمایاں خصوصیتیں یہ تھیں :—

(۱) مضمون آفریني، لیکن اس مضمون آفرینی میں کوئی پیچیدگي نہ تھي بلکہ بعض اوقات وہ ایک مدلل منطق کي صورت اختیار کر لیتي تھي ، یعني شاعر کا کلام جس دعوی پر مشتمل ہوتا تھا وہ بجمیع اجزائه اس سے ثابت ہو جاتا تھا مثلاً -

* وصیات ناسخ

کہتے هیں سب ترے قد و عارض کو دیکھکر
بالائے سرو پھول کھلا ھے گلاب کا

قد کي تشبیہ' سرو سے اور عارض کي تشبیہ' گل سے ایک پامال تشبیہ ھے ' لیکن چونکہ عارض ؟ انساني جسم میں سب سے اوپر کا حصہ ھے ' اسلئے خود بخود یہ دعوي ثابت هو گیا کہ ۔

بالائے سرو پھول کھلا ھے ' گلاب کا

اِس مدلل منطق کي دوسري' عام اور متداول صورت' تمثیل ھے؟ جو صائب کی خاص چیز ھے ، اور ناسخ نے بھي اسکي تقلید کي ھے مثلاً

شوق هم دیوانوں کو بالا نشیلی کا نہیں

کیا تعلق خانۂ زنجیر کو ھے بام سے

لیکن یہ ایک بیمزہ منطق ھے ' شاعری نہیں ' اس لئے اس میں کوئي اثر نہیں پایا جاتا ، اسکي ایک صورت یہ ھے کہ جس چیز سے ممکن هو ایک مضمون پیدا کر لیا جاے مثلاً

استرہ ملھہ پہ جو پھرنے نہیں دیتا ۔ ھے بجا

محو' دیدار سے کیونکر خط قرآن هوتا

مجھکو سودائي بنایا ھے دکھا کر آنکھیں

تم دھتورے کا لیا کرتے هو بادام سے کام

مبتذل اور دور از کار تشبیہات بھی اسی سلسلے میں داخل هیں مثلاً

ھے دھن میں اسقدر خوشبو کہ اب رکھا ھے نام

عطر کي شیشی' تری بلور کي مُنھ ال کا

بن جائیں عطر دان نہ کیوں گوش سامعین

خوشبو نسیم خلد کي' تیرے سخن میں ھے

اُسکا ایک طریقہ یہ ھے کہ کسی چیز کا ایک مناسب اثر دکھا کر اُس سے ایک مضمون پیدا کرلیتے هیں

سوجھے مضمون بیاضِ رخِ جانان جو مجھے
هوگیا رنگ مرکب ' دمِ ارقام' سفید
(روشنائی)

لکھنٔو کی شاعری میں اس قسم کے مضامین کی بہتات ہے' مثلاً امیر فرماتے هیں :—

الله رے نزاکت جانان که شعر میں
مضمون بندھا کمر کا' تو درد کمر هوا

لیکن ان نکته آفرینیوں کا نتیجه یه هوا که شاعری کی تمام لطافتیں' فنا هوگئیں ، جذب و اثر کا نام و نشان نه رها زبان کی صفائی و رعنائی کا خاتمه هوگیا ، غزل ، غزل نهیں رهی ' بلکه اُس میں دنیا بھر کے مضامین شامل هوگئے مثلاً

جنکی همت هے بلند انکو تعجب کُچھه نهیں
پست فطرت جوکه هے قائل هو کیا معراج کا
کوئی دم فرصت جسے مل جائے' سمجھے مغتنم
رهگیا بس جس نے رکھا کام کل پر آج کا

اس قسم کے اشعار کو' جنکی بکثرت مثالیں ناسخ کے دیوان میں مل سکتی هیں ، غزل بلکه شاعری کی کسی صنف سے کوئی تعلق نهیں ' ان کو مذهبی یا اخلاقی شاعری کی حدود میں بظاهر داخل کیا جاسکتا هے' لیکن بهر حال مذهبی اور اخلاقی شاعری میں بھی شاعری کا کوئی نه کوئی جزو شامل هونا چاهئے ' اور اس میں سرے سے شاعری هی نهیں پائی جاتی ' اس لئے مولوی سید امداد امام ' اثر نے کاشف الحقائق میں بالکل سچ لکھا که :—

" وه خیالات شیخ کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھه احاطۂ غزل سرائی میں داخل هوگئے جو درحقیقت احاطۂ

غزل سرائي سے باهر هيں اس زرو آزمائی کا نتیجه
یه هوا که واردات و جذبات قلبیه اور دیگر امور
ذهلیه کے مضامین سے شیخ کي غزلیں معرا هوگئیں
اور غزل سرائي کا مطلب فوت هوکر ایک ایسي قسم
کي شاعري ایجاد هوگئي جس پر نه قصیدۂ گوئي
اور نه غزل سرائی دو میں سے کسی کي تعریف
صادق نهیں آتي هے ،،

اس همه گیري نے دریائے شاعري میں طغیاني کا عالم پیدا کردیا
اور نصاب غزل کي پابندي بالکل اتهه گئی ' هر قافیه اور هر مضمون کو
بے تکلف نظم کرنے لگے ' اس لئے دو غزله ' سه غزله اور چو غزله
کا رواج هوا اور یه پر گوئی ' زور طبع اور رواني طبع کا بڑا مظهر قرار
دي گئي ' چنانچه امیر ' و مدیر کے دیوانوں میں اس کي بکثرت
مثالیں مل سکتي هیں -

اس کے مقابله میں دوسرا رنگ خواجه آتش کا تها جس کي
نمایاں خصوصیت ' زبان کي صفائي ' بندش کی چستي ' اور سلاست
و رواني بتائی جاتي هے ' لیکن اگر غور سے دیکها جائے
تو یه رنگ کوئي مستقل رنگ نهیں هے ' بلکه مختلف
رنگوں کا مجموعه هے ' اور اس کے حسب ذیل اجزاء هیں '

خصوصیات آتش

(۱) ناسخ کا رنگ ' البته خواجه صاحب نے اس کي
ناگواریوں کو کسی قدر کم کیا هے '

(۲) سوز و گداز' جو میر و مصحفي سے لیا گیا هے '

(۳) فقر و تصوف ' اسي میں خاص خاص اخلاقي
اجزاء مثلاً زهد و قناعت' استغناء و بے نیازی وغیره
بهی شامل هیں ' اور یه روش میر ' خواجه میر درد

اور قائم وغیرہ سے اخذ کی گئي ھے ' البتہ خواجہ صاحب نے ان مضامین کو نہایت جوش و برجستگي سے ادا کیا ھے ۔

(۴) رندي و سرمستی ' خواجہ صاحب اس کے موجد ھیں ' شیخ ناسخ کا تو ' بقول مولوی محمد حسین آزاد' یہ حال ھے کہ :—

,, زاھد اور ناصح ' جو شعرائے اُردو و فارسی کے لئے ھر جگہ رونق محفل ھیں ' یہ ان سے بھی ھنس کر دل نہیں بہلاتے اور اگر اتفاقاً ھے تو ایسا ھے کہ وہ ھنسنا' زھر خندہ معلوم ھوتا ھے ،،

لیکن خواجہ آتش نے رندانہ مضامین میں وہ کیف و سرور پیدا کیا ھے جس کي نظیر سے قدما کي شاعري بالکل خالي ھے ' ممکن ھے کہ ان پر سودا و انشا کا کچھہ اثر پڑا ھو لیکن یہ جوش بیان ' سودا و انشاء کے یہاں بھي نہیں '

(۵) واردات قلبیہ اور امور ذھنیہ کي آمیزش ' یہ روش انھوں نے قدما بالخصوص مصحفي سے سیکھي ھے ' اور اس سلسلہ میں بہ کثرت اشعار ان کے قلم سے ایسے نکل گئے ھیں ' جو انکو لکھنؤ کي بزم ادب سے نکال کر دلی کي محفل ادب میں بٹھا دیتے ھیں ' یہاں تک کہ ان تیز نشتروں نے غالب کے دل میں بھی خراش پیدا کي ھے '

(۶) معاملہ بندي' اس میں ان کے پیشرو' جرأت ھیں '

(۷) تشبیہات کی جدت و لطافت ' اس راہ میں ان کي رھنمائي ' قدماء نے کي ھے اور اس میں ان کي سادگي طبع کو بھي دخل ھے ۔

(۸) غزلوں کا اختصار ' اگرچہ آتش کے یہاں بھي دو غزلہ اور سہ غزلہ موجود هے ' تاهم ایک محدود دائرے میں رهنے کي وجہ سے وہ اس میدان میں شیخ ناسخ کے ساتھہ نہیں دوڑ سکتے '

خواجہ آتش کے بعد ان کے تلامذہ نے ان کي روش کو اور ترقي دي اور اس ترقی کے میدان کو صاف کرنے کے لئے حسب ذیل اصلاحات کیں؟ -

شاگردان آتش کی ترقی مزید

(۱) عربی اور فارسی کے الفاظ کو بہت کم کردیا ' جس سے زبان بالکل خالص اور بے میل هوگئي ' اور وہ ثقیل و مکروہ الفاظ نکل گئے جن کي ' ناسخ کے کلام میں ' بڑي کثرت نظر آتي هے '

(۲) فارسي ترکیبیں جو قدماء کے کلام میں بہ کثرت پائي جاتي تھیں ان کو بہت کم استعمال کیا '

(۳) الفاظ هندی مصطلحہ اور مستعملۂ فصحا کو داخل کیا ؟ لیکن اسی سلسلے میں وہ بہت سے عامیانہ اور بازاري الفاظ بھي بول گئے مثلاً گھرا ' موگری ؟ مرنہ تھوتھانا ' کلتر ' تاپو ' مونڈ چرے وغیرہ -

(۴) محاورات و اصطلاحات کو اُصول فصاحت سے جانچ کر استعمال کیا جس سے اُن کو ادابندی اور معاملہ‌بندي کا موقع ملا ' بلکہ سچ تو یہ هے کہ معاملہ بندي اور ادابندي هي نے شاعري کو ان محاورات و اصطلاحات سے آشنا کیا -

(۵) خال و خط ' گل وبلبل اور سرو و قمري وغیرہ کا ذکر کم کیا یعني مادي اور خارجی مضامین کم لکھے اور کلام

میں درد ' اثر ' اور سوز و گداز پیدا کیا اور اس
حیثیت سے بالطبع میر کی روش اختیار کی ' چنانچہ
نواب سید محمد خاں رندفرماتے ہیں -

تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میر سے
عاشق ہیں رند ہم تواسی بول چال کے

شیخ ناسخ ؟ خواجہ آتش کے سوا بالفعل رند
شاعران ہند میں کہتے ہیں طرز میر ہم

(۶) استعارہ اور مبالغہ کے اقسام سے کم کام لیا ' چنانچہ
رند کہتے ہیں :—

بہتر جو استعارہ و اغراق سے نہیں
پھرکیوں پسند خلق مری سادہ گوئی ہے '

جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ناسخ کے رنگ کو چھوڑ کر
قدماء کی سادگی اختیار کی

(۷) لفظ غزل کے حقیقی معنی کا خیال رکھا یعنی غزل
میں تغزل کا رنگ پیدا کیا اور ناسخ نے غزل میں
ہر قسم کے جو خیالات بھر دئے تھے ان کو چھوڑ کر
صرف عشق و محبت کے جذبات و واردات سے کام لیا '
چنانچہ میر وزیر علی صبا ؟ فرماتے ہیں :—

مضمون پیچدار ہیں مکر وہ اے صبا
اشعار ہر زمین میں ہیں عاشقانہ فرض

(۸) و قوعی خیالات یعنی معاملہ بندی پر زور دیا '

(۹) رعایت لفظی جو اس دور میں لکھنو کی ایک عام
خصوصیت بنگئی تھی اس کی نسبت آتش کے بعض

شاگردوں کو محسوس ہوا کہ وہ ایک بے حقیقت
چیز ہے ' چنانچہ صبا کہتے ہیں :—

اے صبا آپ رعایت نہ کریں لفظوں کی
زرِ گل پالیا ' گلچیں نے تو کیا مال ہوا

اگرچہ یہ لوگ بھی اس سے کلیتاً نہ بچ سکے تاہم اسکا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ اس صنعت میں لطافت پیدا ہوگئی اور ناسخ نے اس میں جو ابتذال اور ثقل پیدا کردیا تھا وہ جاتا رہا - چنانچہ تذکرہ جلوۂ خضر میں لکھا ہے کہ " صنعت ایہام کو ' حسن کے ساتھہ' دوہی شاعروں نے برتا ناسخ کے شاگردوں میں وزیر نے' اور آتش کے شاگردوں میں صبا اور نسیم نے"

(۱۰) اِس دور میں آتش کے ایک شاگرد' آغا حجو' شرف - نے سب سے بڑی اصلاح یہ کی کہ فارسی شاعری کے اُن تمام متداول الفاظ کو متروک قرار دیا جنھوں نے فارسی اور اُردو شاعری کو رندی، ہوسناکی، بلکہ الحاد اور بیدینی تک کا مجموعہ بنا دیا تھا مثلاً انھوں نے بت، صنم، کلیسا، بتخانہ ، برہمن' ناقوس' زنار ، زاہد ' واعظ ، ناصح' شیخ ' پیر مغاں ، مغبچہ ' ساقی' رند ، جام ، ساغر ، شیشہ ، قلقل ، اور شراب ، وغیرہ کو یک لخت چھوڑ دیا ، اگرچہ اس دور کے اور شعراء' اسکے پابند نہ ہوسکے تاہم اسکا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ کلام میں متانت و سنجیدگی پیدا کرنے کا خیال' سب کے دلوں میں پیدا ہوگیا ۔

اس دور کے بعد متاخرین شعراء لکھنؤ کا دور شروع ہوا تو تاریخی حیثیت سے اونکے سامنے لکھنؤ کی عاشقانہ شاعری کا جو ذخیرہ تھا وہ چار حصوں میں منقسم تھا ۔

(۱) ایک تو شیخ ناسخ کا بے کیف و بے مزہ کلام' جسکي تقلید پوري
طور پر کسي نے نہیں کی ، یہاں تک کہ انکے تلامذۂ خاص
بھي اس روش پر قائم نہ رہ سکے ؛

(۲) دوسرا خواجہ آتش کا کلام' جسکا ایک حصہ میر، درد' مصحفي'
اور جرأت وغیرہ کے محاسن شعر کا مجموعہ تھا بلکہ لطف
زبان اور جوش بیان نے انکي خوبیوں کو اور بھي دوبالا کردیا
تھا -

(۳) تیسرا تلامذۂ آتش کا کلام ؛ جنھوں نے آتشکدہ آتش کے شراروں
کو اور بھي چمکا دیا تھا ؛ اور اب یہ مئے یک آتشہ ؛ دو آتشہ
ھوکر اور بھي تیز و تند ھوگئي تھي -

(۴) چوتھا تلامذۂ ناسخ کا کلام جو زبان کي ظاھري اصلاحات
میں تو تلامذۂ آتش کے شریک تھے ' لیکن اور اصلاحات
میں وہ ان کے دوش بدوش نہ چل سکے ' اور اگر
چلے بھي تو اس طرح کہ اردو غزلگوئي کو ابتذال
بلکہ ھزلیات و خرافات کا مجموعہ بنا دیا ' چنانچہ
میر علي اوسط' رشک کا کلام اسکي نمایاں مثال ھو سکتا ھے'

جلال کي شاعري کا پہلا دور

بد قسمتي سے متاخرین شعرائے لکھنؤ نے ' جن میں امیر '
و جلال سب سے زیادہ نامور ھوے ' انھی کے آغوش تربیت میں نشو
و نما پائی ' اسلئے اس باغ کے تمام خار و خس
ان کے دامن میں آگئے ' چنانچہ امیر کا پہلا دیوان
اسي خس و خاشاک کا گلدستہ ھے اور جلال کے پہلے دیوان میں
بھي اس قسم کے تنکے جا بجا ملتے ھیں مثلاً :—

سبز رنگوں کي محبت میں جو ھوتي تاثیر
کسي عاشق کا بھی طوطي کبھی بولا ھوتا

صید کرتے تھے جو دل مرغ نگہ کو تیرے
باز پھر اس کو نہ بلنا تھا ' ممولا ہوتا

کوچۂ یار میں میلا جو ہوا ' چرخ کو بھي
یہی حیرت تھی کہ میں کاش هنڈولا ہوتا

قہقہہ مارے عدو ؟ اسکي نہیں تاب اے یار
روک لیتے ہم اگر توپ کا گولا ہوتا

مبتذل اور عامیانہ الفاظ کا استعمال بھي جا بجا پایا جاتا هے ' اور صرف پہلے دیوان کي تخصیص نہیں بلکہ دوسرے دیوان میں بھي اس قسم کے الفاظ ملتے هیں مثلاً : —

کیا سخت صدا هے حرکات فلکي کي
ٹانٹھي هے جوانوں سے بھی اس پیر کي آواز

صحبت تھي غمکدے میں مري ؟ راگ رنگ کي
آیا نہ جب وہ شوخ تو کھٹراگ ہو گئي

بت پرستي سے نہ کي توبہ خدا کے آگے
حکم حاکم تھا مگر هم نے مچلکا نہ دیا

کھول ڈالي قتل کر کے همکو قاتل نے کمر
آج ترکش بھر گئے ' خالي تپنچا هو گیا

آبرو سے جو ملا ؟ اکسیر سمجھے هجر میں
خاک کا پھنکا بھي سونے کا نوالا هو گیا

هم سویرے حشر میں چل کر سمجھہ لیں یار سے
کون پھر سنتا ہے جب ہلڑ سوا ہو جائیگا

الفاظ سے مضمون پیدا کرنے کي ایجاد کا جو شرف، حسب بیان مولف جلوۂ خضر، خواجہ وزیر کو حاصل ہے اور جسکي صورت یہ ہے کہ ایک ذو معنیین لفظ کو ایک ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں جس سے مجازي معنی مراد ہوتے ہیں، لیکن حقیقي معني کی طرف بھي اشارہ ہو جاتا ہے اور اسطرح ایک خاص قسم کی رعایت لفظي پیدا ہو جاتي ہے اسکي مثالیں بھي جلال کے کلام میں ملتی ہیں، مثلاً -

نہ ہٹا سامنے سے اسکے دم آرایش
جم گیا آئینہ، رنگ مسي و پان کی طرح

لیکن اگر اس صنعت کا استعمال عمدہ طریقے پر کیا جاے تو شعر میں خاص لطافت پیدا ہوجاتي ہے، مثلاً جلال کے یہ اشعار اس صنعت کي نہایت عمدہ مثالیں ہیں -

تمہارے حلقہ بگوشوں میں ہم بھي داخل ہیں
پڑا رہے یہ سخن کان میں گُہر کي طرح

ٹیڑي سیدھی ہیں عجب حسن بتاں کی چالیں
مانگ بنکر کہیں نکلا کہیں گیسو ہوکر

ورنہ سخت ابتذال پیدا ہو جاتا ہے مثلاً امیر کا یہ شعر

آخر میں آدمي ہوں بادام کچھہ نہیں ہوں
بک بک کے مغز میرا کہدو نہ کھائے واعظ

جا بجا ناسخ کی بے اثر خیال بندی بھي پائي جاتی ہے ,مثلاً -

وہ دن کو آئینگے ثابت ہے خواب صبحگاہي سے
مگر شک پڑ گیا ہے دل میں جھوٹے کي گواہي سے

لگاتے ہو تم آنکھوں میں جب اپنی پھول جاتا ہے
بنا ہے کیا یہ کاجل بخت عاشق کی سیاہی سے
نہا کر تم نے دریا میں گلے کٹوادئے لاکھوں
لڑی بازو کی مچھلی کی نکہ ایک ایک ماہی سے
ہمیں منظور ہے اظہار کرنا دل کے چھالوں کا
لکھینگے یار کو خط پھوٹنے والی سیاہی سے

لیکن بعد کو انکے کلام میں تغیرات پیدا ہوئے اور ان تغیرات کی بنا پر انکے پہلے دیوان کو پیش نظر رکھر ایک تذکرہ نویس نے انکی شاعری کے متعلق یہ رائے قائم کی :-

"پیشتر سخن بروش اہل لکھنئو میگفت، الحال بہ طرز دہلی فکر نماید" لیکن یہ فیصلہ کرنا سخت مشکل ہے کہ انکے کلام میں یہ تغیر کب پیدا ہوا ؟ کیونکر پیدا ہوا ؟ اور کن اسباب و علل نے پیدا کیا ؟ منشی امیر احمد صاحب کے دو دیوان ہیں، اور دونوں کے رنگ الگ الگ ہیں - اسلئے وہ علانیہ دو زمانے کے کلام معلوم ہوتے ہیں - اور وہ خود اعتراف کرتے ہیں :-

پچھلا کلام بھی ہے جو اس میں شریک امیر
دیوان میں اب کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں

اسلئے انکے اگلے اور پچھلے کلام کے درمیان علانیہ ایک حد فاصل قائم کی جاسکتی ہے، لیکن جلال نے اس قسم کا کوئی اعتراف نہیں کیا ہے، صاحب تذکرہ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جلال کے پہلے دیوان سے یہہ اشعار نقل کئے ہیں، :--

چھپتے نہیں گواہ جو سوز نہاں کے ہیں،
چند اشک گرم اور کئی چھالے زباں کے ہیں،
نقش قدم پکارتے ہیں راہ عشق میں
مٹ جائے حوصلے جسے نام و نشاں کے ہیں،

حسرت اس بت کي دل ميں آئي ہے
ہم نے اک شے کسي کي پائي ہے'

ليکن اس ديوان سے پہلے جلالؔ کا کوئی ديوان نہيں کہ دونوں کے رنگ ميں امتياز پيدا کيا جائے' اور اس رنگ کے شعر انکے پہلے ديوان کي ہر غزل ميں مل سکتے ہيں' يہاں تک کہ جن غزلوں ميں لکھنئو کا رنگ علانيہ نماياں ہے' ان ميں بھي اس قسم کے اشعار ملتے ہيں' مثلاً يہ شعر

مسيحا ہے وہ بت خال لب لعليں بھي بول اٹھے
ہوئي ثابت نبوت سنگريزوں کي گواهي سے

خالص لکھنئو کے قديم رنگ ميں ہے' اور اس زمين ميں اس قسم کے اور بھی متعدد اشعار ہيں ليکن اسي زمين ميں دلی کے رنگ ميں بھی بہ کثرت اشعار ملتے ہيں مثلاً -

کئے ہيں ہوش بھي گم' عشق ميں گم کردہ راهي سے
کہ بربادي سے منزل پوچھتا ہوں - گھر' تباهي سے
جدھر بھٹا کے دل لايا وهيں تھی منزل مقصد
بہت سي راہيں پيدا ہو گئيں گم کردہ راهي سے
کسيکي جستجو ميں پھر رہے ہيں - صاف ظاہر ہے
نگاهوں کی پريشاني سے ' آهوں کي تباهی سے
کمی کسکي طرف سے پائي جاتي ہے محبت ميں
ہم اپنے دل سے پوچھيں آپ ' اپني کم نگاهی سے

غالب کا ايک شعر ہے '

اچھا ہے سر انگشت حنائي کا تصور
دل ميں نظر آئي تو ہے اک بوند لہو کي

جلال نے بھی اس کی طرف دست تصرف دراز کیا ھے ؛

اُس سر انگشت حنائي کا تصور' اے آنکھہ

دیکھہ ٹپکے نہ کوئي خون کا آنسو ھوکر ؛

ممکن ھے کہ غالب کے اندھے مقلد' جلال کے تغیر کلام کو غالب ھی کا پرتو فیض قرار دیں ، لیکن درحقیقت صرف ایک شعر سے اس قسم کا عام استدلال نہیں کیا جاسکتا ؛

اصل یہ ھے کہ ابتداء میں جلال کے رنگ کلام میں ' کسي قسم کا تغیر ھي نہیں ھوا بلکہ ' جیسا کہ ھم اوپر لکھہ آئے ھیں ' جس رنگ کو خواجہ آتش کا مخصوص رنگ کہتے ھیں وہ درحقیقت کوئي مستقل رنگ نہ تھا بلکہ مختلف رنگوں کا مجموعہ تھا اور اس میں سودا کي بلند خیالي ' درد کي ثقاهت و متانت ' میر کا سوز و گداز' جرأت کي معاملہ بلندي اور وقوعہ گوئي' سب کچھہ شامل تھي ' البتہ خواجہ صاحب نے ان سب پر لطف زبان اور جوش بیان کے چٹخارے کا اور اضافہ کردیا تھا ' خواجہ صاحب کے تلامذہ نے اس میں اور بھي زیادہ شوخي ' رعنائي اور دلاویزی پیداکردي تھي ' البتہ ان تمام خوبیوں کے ساتھہ ' اس رنگ میں بھي چند مبتذل مضامین اور مبتذل الفاظ کی آمیزش باقي رھي ' اس زمانہ میں بھي مخلوط رنگ ' عام طور پر مقبول تھا اور جلال نے بھي اسي رنگ کو اختیار کیا تھا ' چنانچہ ان کے پہلے دیوان کي ھر غزل میں اس مخلوط رنگ کے اشعار بکثرت ملتے ھیں ' [1]

ترتیب دیوان کے لحاظ سے یہ جلال کي شاعري کا پہلا دور ھے اور اس دور کے کلام میں

---

[1] - فاضل مضمون نگار نے اس مضمون میں بہت سے اشعار نقل کئے تھے جو بخیال طوالت حذف کر دئے گئے - ' مدیر '

(۱) لطف زبان کے ساتھہ جو بلند خیالي پائی جاتي ھے اس کي نظیر سے لکھنؤ کي قدیم و جدید شاعری خالي ھے ' خواجہ آتش کے تلامذہ نے اگرچہ زبان میں اس سے زیادہ سلاست و روانی پیدا کي تھی جس قدر جلال کے پہلے دیوان میں پائی جاتي ھے ' تاھم ان کے کلام میں یہ بلندي ' متانت اور سنجیدگي نہ تھی جو جلال کے اس دیوان کے صفحے صفحے میں نظر آتي ھے ' ان کي شاعری' شیخ ناسخ کي شاعری کا رد عمل تھي ' اس لئے شیخ ناسخ کے کلام میں جس قدر مضمون آفریني پائي جاتي تھي اسي قدر انھوں نے سادگي اختیار کي تھی ' لیکن جلال نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا ' اور صرف زبان کي سلاست و روانی میں ان کی تقلید کی - اور یہ تقلید بھی، صرف معاملہ بندي اور وقوعہ گوئي کے مضامین تک محدود رھي ' ورنہ جہاں تک رنگ تغزل کا تعلق ھے انھوں نے سودا اور مصحفي کي روش اختیار کي ھے ' بالخصوص درد و اثر اور سوز و گداز ' میر سے لیا ھے ' چنانچہ خود فرماتے ھیں :—

کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ھیں وھي طرز
لیکن سخن میر تقي میر کي کیا بات

(۲) اس میں مبتذل اور خارجی (یعني زلف و گیسو اور خط و خال کي توصیف کے) مضامین اس قدر کم ھیں ' جس قدر امیر کے پہلے دیوان میں اس قسم کے مضامین کي کثرت ھے '

(۳) اس دیوان میں اگرچہ وہ' اشعار کي تعداد کے لحاظ سے' نصاب غزل کے پابند نہیں ھیں ' تاھم دو غزلہ سے آگے

نہیں بڑھتے ' اور اس قسم کی غزلوں کی تعداد بھی
بہت کم ہے ' قدما کی یہی روش تھی ' اور اخیر میں
آتش اور آتش کے تلامذہ نے بھی یہی روش اختیار کی تھی '

اس دور کے بعد جلال کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا اور خاص
خاص تاریخی اسباب سے انہوں نے اپنی قدیم روش میں تبدیلی
جلال کی شاعری کا دوسرا دور
پیدا کی کیونکہ ناسخ ھی کے زمانے سے لکھنؤ اور دلی
کی شاعری میں فعل و انفعال کا سلسلہ شروع ہوگیا
تھا اور ایک کا اثر دوسرے پر پڑنے لگا تھا ' چنانچہ ذوق او شاہ نصیر کی شاعری
کا رنگ ' ناسخ کے رنگ سے کچھہ بہت زیادہ مختلف نہیں ھے '
اور مومن کے یہاں بھی اس رنگ کے بہ کثرت اشعار ملتے ھیں '
انور ' مجروح اور داغ کے کلام میں جو سادگی ' اور سلاست و روانی
پائی جاتی ھے ' غالباً وہ بھی آتش کے تلامذہ کا فیض ھے ' ورنہ
اس سے پہلے دلی میں یہ رنگ موجود نہ تھا ' رام پور میں آ کر
سب سے زیادہ داغ نے اس رنگ میں ناموری حاصل کی اور ان
کو اسقدر حسن قبول حاصل ہوا کہ دوسرے شعرا بھی اس رنگ
کے اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ' اور امیر و جلال نے خاص طور پر
اس آب رواں میں انکے ساتھہ شناوری کرنے کی کوشش کی" اور
تلامذۂ آتش کے کارناموں کے دوبارہ زندہ کرنے کا وقت آیا ' لیکن
احیائے موتی کی اس زندۂ جاوید کوشش میں امیر تو ناکامیاب
رھے ' البتہ جلال نے اپنی مسیحا نفسی سے اپنے اسلاف کی بوسیدہ
ھڈیوں میں تازہ روح پھونک کر تلامذہ آتش کی شاعری کے آب
و رنگ کو اور بھی زیادہ نمایاں کر دیا ' اگر چہ یہ افسوسناک
بات ہے کہ جو بلندی انکے پہلے دیوان میں پائی جاتی ھے اب
وہ مفقود ھو گئی ' تاھم آتش اور تلامذۂ آتش کی اور تمام خصوصیات

دوبارہ زندہ ہوگئیں ' مثلاً آتش اور تلامذۂ آتش کے کلام میں ایک خاص فقیرانہ اور آزدانہ شان پائي جاتي ہے ' اور جلال کے دوسرے دیوان سے بھي یہ شان علانیہ نمایاں ہوتی ہے ' مثلاً :-

اٹھانے والوں پہ منعم کي لاش بھاري ہے
مرے پر آپ یہ گٹھري بنا دوشالوں کا

نہ اپنے ہمسر و ساماں کے گھر کا پوچھہ پتا
جہاں پہ تلگئي کملي فقیر خانہ ہوا

قصر تعمیر کئے ' خاک نہ سمجھا منعم
عاقبت هي نہ بنائی تو بنایا پھر کیا

مقبرے بنائے ؟ فکر محل میں ہے کیا بشر
بھجا نہ اهتمام کرے سنگ و خشت کا

بستر فقر ہے مسند سے سوا مجکو جلال
اپنے اللہ پہ ہر وقت ہے تکیا میرا

زال دنیا سے جو ہیں طالب زر؟ مرد نہیں
مال عورت کا نہ لیتے جو حمیت ہوتي

جلال نے تلامذۂ آتش کے رنگ کو جس قدر ترقي دي اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صبا نے ایک خاص لفظی مناسبت سے ایک شعر لکھدیا تھا :-

پڑھے یار غیروں میں نامہ ہمارا
یہ قسمت ہماري ؟ یہ لکھا ہمارا

لیکن جلال نے اسکو خاص اپنا مضمون بنا لیا اور اسکو سیکڑوں طریقے سے ادا کیا :-

خط لکھے ہمیں یار، پہونچ جائے عدو کو
تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہیں جاتا

قاصد نے دیدیا مجھے خط کا یہیں جواب
مضمون جانتا تھا مري سرنوشت کا

لکھا تقدیر کا یہ کہہ رہا ہے
نہ بھیجو ، پھر لو خط نامہ بر سے

نامہ بر بھي جو بنایا تو صبا کو ہم نے
خط کي تقدیر میں لکھا تھا کہ برباد رہے

کیا لکھا ہے وائے قسمت کچھہ پڑھا جاتا نہیں
خط پیشاني ترا بھیجا ہوا مکتوب ہے

اس وقت چونکہ ہمارا روئے سخن ، جلال کے دوسرے دیوان کي طرف ہے اس لئے ہم نے صرف چند شعر نقل کئے ، ورنہ ، جیسا کہ آگے آئے گا ، جلال کا یہ نہایت مرغوب مضمون ہے جسکو وہ سیکڑوں طریقے سے ادا کرتے ہیں ۔

تلامذۂ آتش کا سب سے بڑا کارنامہ ، لطف زبان ہے ، لیکن انکي زبان داغ کي زبان سے بالکل مختلف ہے ، اور جلال اس زبان میں اس بے تکلفي سے گفتگو کرتے ہیں کہ رند و صبا کی بزم سخن سے مرحبا و آفرین کي صدائیں بلند ہوتي ہیں ۔ مثلاً :-

ہم ہیں وہ سہہ کار کہ سب حال ہمارا
کہدے گا زباں بنکے ہر اک بال ہمارا

باقي ھے نہ دل کا کوئي تکڑا نہ جگر کا
کھایا غم دلدار نے سب مال ھمارا

اُدنیٰ سا کرم دیدۂ ترکا ھے یہ ھم پر
بادل کا ھے تکڑا ، نہیں رومال ھمارا

دو اشک ندامت ھیں جلال اسکو تو کافي
دھو جائیگا سب نامۂ اعمال ھمارا

کیا کیا وفائیں کي ھیں ذرا یاد کیجئے
کچھہ سونچ کر غلام کو آزاد کیجئے

بالفرض دے بھي مژدہ اگر کوئي وصل کا
دل لائیے کہاں سے جسے شاد کیجئے

زاھد بتوں کو دیکھئے جس وقت تک ھے آنکھہ
سیر طلسم حسن خدا داد کیجئے

ایسا مجھے ستائیے ' عبرت فلک کو ھو
ظالم پناہ مانگے وہ بیداد کیجئے

بیزار پاکے مجھکو یہ کہتا ھے دل ، جلال
ایسے ھي ھم برے ھیں تو آزاد کیجئے

داغ اور تلامذۂ آتش یا داغ اور جلال کي زبان میں جو فرق ھے اسکے سمجھنے کیلئے یہ ادبي نکتہ سمجھہ لینا چاھئے کہ زبان معاني کی تابع ھوتی ھے ؛ اور جس قسم کے خیالات دل میں پیدا ھوتے ھیں وہ اپنے مناسب حال ، اسي قسم کے الفاظ ڈھونڈھہ لیتے ھیں - اس اُصول کي بنا پر ، تلامذۂ آتش یا جلال کا کارنامہ ؛ صرف یہي نہیں ھے کہ انہوں نے زبان میں سلاست و روانی پیدا کی ھے ' بلکہ ان کا اصلی کارنامہ یہ ھے کہ انہوں نے غزل کو غزل کے

مخصوص مضامین یعنی ؛ عجز ' فروتني ' خاکساري ' اور سوز و گداز سے آشنا کیا ھے ' اس لئے ان معانی نے خود بخود اس قسم کے الفاظ تلاش کر لئے ھیں جن سے وہ ظاھر ھو سکتے ھیں - مثلاً غلام اور صاحب ' وغیرہ ؛ اس کے ساتھہ لہجہ بھی نہایت نرم اور خاکسارانہ ھے ' جیسا کہ ان غزلوں کے ھر شعر سے ظاھر ھوتا ھے ' لیکن داغ کا معشوق ' ایک خالص بازاري معشوق ھے ' اور وہ ان سے طنز و تشنیع کے ایسے لہجے میں گفتگو کرتے ھیں ' جو عام پسند تو ضرور ھوتا ھے ' لیکن اُس میں عاشقانہ وارفتگي بالکل نہیں پائي جاتي ' اور اس حیثیت سے تلامذۂ آتش یا جلال کو داغ پر تفوق حاصل ھے ؛ لیکن افسوس ھے کہ داغ کی مقبولیت خود لکھنؤ والوں کو بھي اپنا یہ تفوق محسوس نہیں ھونے دیتي -

تلامذۂ آتش کا کارنامہ؛ صرف لطف زبان ھی نہیں ھے ' بلکہ انہوں نے ناسخ کے خشک ' ثقیل' اور مکروہ الفاظ کے جواب میں شگفتہ و خندان الفاظ کا ایک ایسا چمن زار کھلادیا ھے ' جس کي نظیر؛ صرف قدماء کے یہاں پائي جاتي ھے' متوسطین و متاخرین کا دامن ' ان پھولوں سے خالي ھے' جلال نے بھي اس قسم کے گلھائے رنگا رنگ کا ایک ایسا گلدستہ تیار کیا ھے جس سے گلزار داغ بالکل تہی دامن نظر آتا ھے' مثلاً :-

دست سبو نے بیعت' کي میکدے میں جس دن
پیر مغاں کا عالم' عالم مرید ھوگا

لاتا نہ ھو جواب خط شوق' مرغ دل
کچھہ آسماں پہ مثل کبوتر چمک گیا

جب حد سے یہاں گزری ہے تردامنی اپنی
دریا تری رحمت کے بھی لہرائے ہیں کیا کیا

دوڑ او طفل حسین دوڑ، اگر طالب ہے
دل وہ جاتا ہے چمکتا ہوا جگنو کی طرح

داغ کا شعر ہے،

ایک دوکان میں رکھ آئے ہیں ہم دل اپنا
دور سے سب کو بتاتے ہیں وہ مال اچھا ہے،

لیکن اگر جلال کے اس شعر سے اس کا موازنہ کیا جائے، تو الفاظ کی شگفتگی اور طرز ادا کی رعنائی میں صریح فرق نمایاں ہوگا۔

فرقت میں اپنی دل لگیاں ہیں نئی، نئی
رونا بھی اک ہنسی ہے تڑپنا بھی کھیل ہے

افشاں کسی کی چھٹ کے گری فرش خواب پر
گھر میں ہمارے وصل کی شب، دھن برس گیا

وہ دیکھو ابر نے رخ سوئے بتخانہ کیا رندو
برستا، شور کرتا، جھومتا، مستانہ آتا ہے

فرق تجھ میں، تری تصویر میں اتنا دیکھا
موہنی، آنکھ میں اس کی، ہمیں پائی نہ گئی

صحرا میں نعرۂ ہو، گلشن میں شور کو کو
دم بھر رہے ہیں ہر سو، وحش و طیور تیرا

جوش و طرب، غیظ و غضب، خاکساری و فروتنی، عجز و الحاح، اقرار و انکار، ضد و اصرار، غرض مختلف کیفیات نفسانی کے اظہار کے لئے خاص لب و لہجہ ہوتا ہے، اور جب شعر کے الفاظ و اسلوب بیان سے لب و لہجہ ظاہر ہوتا ہے تو شعراء کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ "اس شعر کے تیور اچھے ہیں" یہ انداز بیان بھی لطف زبان ہی کے سلسلے میں داخل ہے، اس لئے جو شعراء، لطف زبان کے دلدادہ ہیں ان کے کلام میں اس قسم کا اسلوب، بہ کثرت پایا جاتا ہے، جلال بھی اسی کوچے کے آدمی ہیں، اس لئے ان کے کلام میں خاص طور پر یہ لب و لہجہ پایا جاتا ہے، اور انہوں نے یہ چالیں تلامذۂ آتش ہی سے سیکھی ہیں :-

فصل گُل، حضرت دل! آئی جو گھبراگئے آپ
پھاڑتا ہوں میں گریبان کو جی ہاں سمجھا

آدمی عہد جوانی کو مسافر سمجھے
اعتبار اس کا نہیں صبح گیا شام آیا

میں اک جھلک سے ہوں گا نہ غش، وہ کلیم تھے
میں اک شرر سے خاک نہ ہونگا، وہ طور تھا

رکھا نہ اپنے پاس کبھی مال و زر، جلال
جو کچھ دیا خدا نے، اٹھایا، دیا، لیا

رعایت لفظي' لکھنؤ کے شاعرانہ رنگ کي ایک نمایاں خصوصیت ھے ' اور وہ اس زمانے میں نہایت ناپسندیدگي کی نگاہ سے دیکھي جاتی ھے ' تلامذۂ آتش بھي اس کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھتے تھے ' اور جہانتک ممکن ھوتا تھا اس سے احتراز کرتے تھے یا کم از کم اُس میں لطافت و نفاست پیدا کرتے تھے' جلال نے بھی یہي روش اختیار کي ھے ' اس لئے ان کے کلام میں جہاں کہیں رعایت لفظي پائی جاتي ھے اُس میں اس قدر لطافت پائي جاتي ھے ' کہ اگر غور و فکر سے کام نہ لیا جاے تو سرے سے رعایت لفظي کا احساس ھي نہیں ھوتا مثلاً

راحت نہ پائیں زیر زمیں بھی شہید ناز
اس فکر میں ھے یار کي تھوکر لگي ھوئي

" فکر میں لگنا " ایک محاورہ ھے ' لیکن " لگنے " کو تھوکر سے بھي مناسبت ھے کیونکہ " تھوکر لگنا " بھي محاورہ ھے '

پر بھي ھوجائنگے مرغان قفس کے پیدا
نظر پرورش افزائي صیاد رھے

پر اور پرورش افزائي میں لفظي مناسبت ھے '

بتوں سے دل مکدر ھوگیا اپنا دم آخر
لگا دامن میں مرنے وقت یہ دھبا قیامت کا

مکدر اور دھبا میں مناسبت ھے ۔

بیڑیاں دیکھہ کے ڈھارس مجھے دیتا ھے جنوں
دل نہ بھاري ھو کہ زیور ھے یہ سودائی کا

دل بھاري ھونا محاورہ ھے ' لیکن بھاري کو بیڑیوں کے ساتھہ مناسبت بھي ھے '

لاکھہ تقدیر کے لکھے کو مٹایا ' نہ مٹا
داغ ھم لیکے چلے اپني جبیں سائي کا

داغ اور جبین سائی میں مناسبت ھے ' کیونکہ جبین سائی سے پیشانی پر داغ پڑ جاتے ھیں '

مردے کیسے' لب جان بخش سے اُس بت کے جلال

نام زندہ ھے مسیحا کی مسیحائی کا

" نام زندہ ھے مسیحا کی مسیحائی کا " محاورہ بھی ھے اور زندہ کو مسیحا کے لفظ سے مناسبت بھی ھے '

یہ مشق خرق عادت ' دیوانگی میں پہونچی

دل پھاڑنا ھے میرا ' اب ذکر پیرھن کا

جو لوگ عربی زبان اور علم کلام کی اصطلاحات سے ناواقف ھیں وہ اس لفظی مناسبت کو سمجھہ ھی نہیں سکتے ' خرق کے معنی پھاڑنے کے ھیں اور خرق عادت معجزہ کو کہتے ھیں ' دل پھاڑنا بھی اُردو کا محاورہ ھے ' اس لئے ' ان تمام الفاظ کو دیوانگی اور پیرھن سے مناسبت ھے '

چلے قینچی تری صیاد' کچھہ پروا نہیں ھم کو

سلامت شوق گلشن ھے تو ایسے لاکھہ پر دیگا

" پروا " اور " پر " میں نہایت مخفی مناسبت ھے '

غرض اُنھوں نے جہاں جہاں رعایت لفظی سے کام لیا ھے ' نہایت لطافت کے ساتھہ لیا ھے '

رعایت لفظی کی طرح وہ ایک اور صنعت سے بھی کام لیتے ھیں جس کو عربی زبان میں طباق کہتے ھیں اس صنعت میں الفاظ میں تناسب کے بجائے تضاد ھوتا ھے ' لیکن فلسفیانہ حیثیت سے تضاد بھی ایک قسم کی مناسبت ھے ' یہی وجہ ھے کہ ایک ضد کو دیکھکر دوسرا ضد یاد آجاتا ھے ' اور کالے رنگ کے آدمی کو دیکھکر گورے آدمی کی یاد تازہ ھو جاتی ھے ' لیکن اس صنعت کے استعمال

میں وہ آتش یا تلامذۂ آتش کے مرہون منت نہیں ہیں بلکہ اُنہوں نے مہر سے یہ روش سیکھی ہے ' البتہ یہ فرق ہے کہ مہر نے اس کو کم برتا تھا اور جلال نے اس کو نہایت کثرت سے برتا ہے ' یہی وجہ ہے کہ وہ کسی دور کے کلام کے ساتھہ مخصوص نہیں ہے بلکہ اُن کے ہر دور کے کلام میں پائی جاتی ہے مثلاً

لاکھہ اُٹھاتا کوئی ' اُس در سے نہ اُٹھنے دیتا
تو بھی اے ضعف! مرا قوت بازو نہ ہوا

جس قدر شکر خدا آج کروں ' تھوڑا ہے
کہ مرا شکوہ کہئی یار کے لب پر آیا

الفاظ سے گذر کر انہوں نے نفس معانی میں بھی اس صنعت کا لحاظ رکھا ہے ' مثلاً

کہتے ہیں نہ لینگے دل کسی کا
پہلو یہ نیا ہے دلبری کا

کیا تم سے کہوں کہ مرکے تم پر
کیا لطف ملا ہے زندگی کا

جلال کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت' تشبیہات کی جدت اور لطافت ہے' لیکن اس معاملے میں وہ تلامذۂ آتش کے مرہون منت نہیں ہیں' جدید و لطیف تشبیہات کا پیدا کرنا' درحقیقت مضمون آفرینی کی ایک قسم ہے' اور تلامذۂ آتش چونکہ مضمون آفرینی سے دور بھاگتے تھے' اس لئے ان کے کلام میں اس قسم کی تشبیہات نہیں پائی جاتیں' البتہ شیخ ناسخ چونکہ مضمون آفرینی کرتے تھے اس لئے ان کے کلام میں تشبیہات کا ایک وافر ذخیرہ ملتا ہے' لیکن وہ بھی ان کے مضامین کی طرح ' بے کیف

و بے مزہ ہیں، اور جلال کے کلام میں بھی خال خال اس قسم کی تشبیہیں ملتی ہیں، مثلاً

لگا کے گیسوؤں کو ہاتھ، جان ہی دی تھی
بھرے نہ تھے ترے پستول، ورنہ چل جاتے

اس شعر میں گیسو کو پستول سے تشبیہ دی ہے جو ایک جدید و نادر تشبیہ تو ضرور ہے لیکن نہایت بھدی اور مکروہ ہے اس سے بھی زیادہ مبتذل مثال یہ ہے،

وہ دل رکھتے نہیں عاشق جو ان پلکوں سے ڈرجائے
کہیں شیروں کی بھی آنکھ آج تک جھپکی ہے ساہی سے

دل لگایا ہے موے مژگاں سے
بھر کے چھتے کو ہم نے چھیڑا ہے

آتش کے کلام میں بھی اس قسم کی بہت سی تشبیہیں موجود ہیں البتہ ان کے کلام میں جا بجا لطیف و سادہ تشبیہیں بھی پائی جاتی ہیں، اور ممکن ہے کہ جلال پر بھی ان کا کچھ اثر پڑا ہو، بہر حال تشبیہ و استعارہ کے لئے تقلید کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہر شخص نئی نئی تشبیہیں پیدا کرسکتا ہے، اور جلال نے بھی اس قسم کی بہ کثرت تشبیہیں پیدا کی ہیں مثلاً

ہوش جاتے رہے وحشت ہے، مگر دل کی وہی
چوکڑی بھول کے گمراہ یہ آہو نہ ہوا

پیدا کئے ہیں کچھ نئے ڈھنگ آسمان نے
فیروزہ رنگ لانے لگا جب کہن ہوا

عنایتیں نہ تمہاری سی پائیں، حضرت دل
فقیر دوست تو کتنے ہی بادشاہ ملے
کچھہ ایک حال پہ ہے زاہدوں کی خشکی زہد
کبھی ہرے نہ یہ صحرائے بے گیاہ ملے

نخل خوبی ہے تری قدسہی کی تصویر
باب فردوس ہے نقشہ تری انگڑائی کا

عمر بھر جامۂ ہستی سے رہا دل محجوب
اس کو مانگی ہوئی پوشاک میں عریاں سمجھا

لیکن تشبیہات کی یہ جدت و لطافت، صرف پہلے اور دوسرے دیوان تک محدود ہے، جبکہ ان کا زور طبع، اور حریفوں کا مقابلہ، ان کو مضمون آفرینی پر آمادہ کرتا تھا، تیسرے اور چوتھے دیوان میں، جن کو انہوں نے رام پور سے نکل کر اپنی پیری و علالت کے زمانے میں لکھنؤ کے گوشۂ تنہائی میں مرتب کیا ہے، اس قسم کی تشبیہات کا ذخیرہ نہیں ملتا ـ

رندی و سرمستی کے مضامین بھی آتش و تلامذۂ آتش نے جس جوش و ولولہ کے ساتھہ ادا کئے ہیں اس کی نظیر سے اردو شاعری کی تاریخ خالی ہے، جلال بھی اسی خمکدہ کے متوالے ہیں اس لئے ان کے کلام میں بھی اس قسم کی سرمستیاں پائی جاتی ہیں، لیکن اس قسم کے رندانہ مضامین، زیادہ تر دوسرے ہی دیوان میں نظر آتے ہیں، ان کے بقیہ دیوان سے اس اس نعرۂ مستانہ کی صدائیں نہیں آتیں، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے دوسرے دیوان کو بالکل آتش اور تلامذۂ آتش کی

زبان و طرز بیان میں مرتب کیا ہے؛ بہر حال مثالیں ملاحظہ ہوں :-

میکشی کرتے ہیں ہم؛ تو اے فلک
سائبان ابر عالم گیر کھینچ
کوے مغاں کے ہیں گدا بادشاہ
جشن کیا کرتے ہیں جم کی طرح

مغبچے گاہک ہیں اے زاہد ترے ایمان کے
بیچ ڈال اک جام مے پر، دام کم اٹھتے نہیں

کونسا دام نہاں شیخ کے جامے میں نہیں
پیچ ایسا بوی کوئی ہے کہ عمامے میں نہیں

یہ اشعار پہلے دیوان میں ہیں؛ لیکن دوسرے دیوان میں یہ لے زیادہ بڑھ گئی ہے، اور جوش بیان میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے ؛

پھر مغ، مسند جمشید پہ بیٹھا ہے جلال
جشن نوروز کے سامان ہیں میخواروں میں
مے کی بوتل پہ میں عاشق ہوں؛ وہ شیدا مجھ پر
انس ایسے نہ سنے ہونگے سیہ کاروں میں

شراب کی بوتل اکثر سیاہ ہوتی ہے اس لئے اس کو بھی سیہ کاروں میں شامل کرلیا ہے -

خارجی مضامین یعنی زلف و گیسو؛ خط و خال، عارض و رخسار بلکہ معشوق کی پوشاک، زیور، اور آرائش کے ساز و سامان کی توصیف ؛ لکھنؤ کی عاشقانہ شاعری کے نہایت اہم اجزا قرار پائئے تھے ؛ اور ناسخ و آتش نے ان کے وصف میں اپنی تمام نازک خیالیاں صرف کردی تھیں؛ البتہ آتش کے طرز بیان نے جا بجا

ان مضامین کو بھي شگفتہ و دلاویز بنا دیا تھا' اور ان کے تلامذہ نے تو زیادہ تراس قسم کے مضامین ھي ترک کردئے ھے 'جلال بھی انھی کے مقلد ھیں اس لئے اُن کے کلام میں بھي اس قسم کے مضامین بہت کم ھیں اور جو ھیں ان میں حسن ادا کی شان نمایاں ھے ' مثلاً

مرا دل اگر معتکف ہوگا زاھد
بتوں ھی کے محراب ابرو میں ھوگا

دکھادینگے اک دن لب و چشم جاناں
جو کچھہ فرق ' اعجاز و جادو میں ھوگا

مہر اندھا تھا ؟ لڑاتا آنکھہ سے اس کي جو آنکھہ
رخ سے کرنا ھمسري ؟ کیا سر پھرا تھا ماہ کا

اس کي انگڑائي کا نقشہ چشم تر میں پھر گیا
اور دو ھاتھہ آج پاني بڑہ گیا اس چاہ کا

ابرو کو تیرے اتنی تواضع ضرور کیا
جھکنا خلاف وضع ھے مغرور کے لئے

چار دن بعد کہاں یار یہ لطف لب و چشم
مزۂ پستہ و بادام بدل جائینگے

جلال کے دیوانوں میں جن غزلوں کي ردیف ھی ' چوتی ' زلفیں ' جبھن ' دانت اور اس قسم کے ظاھري اعضاء ھیں - اُن کو اس سلسلے سے الگ رکھنا چاھئے کہ شاعر ' ردیف کي پابندي سے اس قسم کے مضامین کے لکھنے پر مجبور تھا ' تاھم اس قسم کي زمینوں میں بھي انھوں نے معاملے کے اچھے اچھے شعر نکالے ھیں مثلاً

پھر وہ شب آئے الھی کہ کبھي یار الجھے
کبھي عاشق سے رھیں دست و گریباں زلفیں

ھاے رے صبح شب وصل کا عالم تیرا
دونوں آنکھیں وہ خماري' وہ پریشاں زلفیں

ہم ان کو وصل میں شرمندہ کر کے خود ہیں خجل
جھکي ہیں اس طرف آنکھیں، ادھر ھے خم گردن
حضور غیر وہ بیٹھے ہیں سر جھکائے جلال
فلک کو دیکھہ رھے ہیں اٹھائے ہم گردن

لیکن دوسرے ' تیسرے اور چوتھے دیوان میں اس قسم کي زمینیں موجود نہیں ھیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ وہ بعد کو اس قسم کي زمینوں میں ، جن میں جذبات و واردات عشق کا اظہار نہ ھو سکے ' غزل ھي کہنا پسند نہیں کرتے تھے '

جلال کی شاعري' خالص عاشقانہ شاعري ھے ' اس لئے اس میں اخلاق و تصوف کا حصہ بہت کم ھے ' البتہ آتش اور تلامذۂ آتش نے غزل میں جو فقیرانہ شان پیدا کردی تھي اُس نے شاعری میں اخلاق و تصوف کا بھي تھوڑا سا حصہ شامل کردیا تھا ' اور جلال نے جب یہ رنگ اختیار کیا تو لازمي طور پر اس قسم کے مضامین بھي ان کے حصہ میں آئے ' چنانچہ ہم ان کے اس قسم کے اشعار اوپر نقل کرچکے ھیں ' لیکن تصوف و اخلاق کے دقیق مضامین سے لکھنؤ کي شاعری کبھي آشنا نہیں ھوئی ' اس لئے جلال کے کلام میں ان کي تلاش بے سود ھے ' البتہ بہت ھي تلاش کے بعد ' ان کے دواوین میں چند صوفیانہ اشعار بھي مل جاتے ھیں مثلاً

آپ اپنے کو تو پہچان نہیں سکتا ھوں
کیا میں اقرار کروں تیری شناسائي کا

جرس کي ، زنگ کي ، ناقوس کي ، موذن کي
جو سب کي سنتا ہے اُس کو پکار دیکھینگے

ہم کو جس وقت اک زمانے سے ہوئي بیگانگی
جب کہیں اس ناشناسا سے شناسائي ہوئی

میخانۂ عرفاں میں کب آئے یہ نہ پوچھو
کچھہ ہوش تھا اُلبتہ در پیر مغاں تک

اذان گواہ ہے ، ناقوس اس کا ہے شاہد
نہیں ملا کوئي اب تک پکار باقي ہے

البتہ دیوانوں کي ابتدا میں انھوں نے تبرکاً تحمید و تقدیس میں جو اشعار لکھے ہیں ، اُن کو بھي تصوف ہی کے سلسلے میں داخل کیا جاسکتا ہے ، مثلاً

پکار اٹھتا ہے جلوہ اُس کي شان کبریائي کا
وہ بت ہوں میں کہ زیبا ہے مجھے دعویٰ خدائي کا
جمال یار عکس افگن نہیں کس آئینہ رو میں
یہ روپوشي کي عادت ؟ پھر ، یہ لپکا خود نمائی کا

اک اک عمل زشت کي گھڑیوں ہے ندامت
یہ شغل جلال آٹھہ پہر خوب ہے میرا

لکھنؤ کی بزم ادب میں سوز و گداز کا چراغ ، سب سے پہلے آتش و تلامذۂ آتش نے جلایا ، اس لئے یہ لوگ قدرتي طور پر میر کے انداز کلام کي طرف مائل ہوئے ، جلال نے بھي جب آنکھیں کھولیں تو ان کے سامنے دو راستے تھے ، ایک تو ناسخ کا راستہ ، جس میں زلف و گیسو

کي سیاهی نے هر طرف تاریکي پهیلا رکهي تهي ؛ دوسري آتش و تلامذۂ آتش کي صراط مستقیم، جس میں سوز و گداز کا تمتماتا هوا چراغ جل رها تها ، انهوں نے قدم تو اسي راستے میں رکها ' لیکن مستفیض اصل مبدا یعني میر سے هوے ، اس لئے ان کے کلام میں هر جگه سوز و گداز کے شرارے نظر آتے هیں اور اس سے ان کا کوئي دیوان بلکه کوئي غزل خالي نهیں '

لکها هے نامه اُسے ، نامه بر نهیں رکهتا
بس ایک طائر جان وہ بهي پر نهیں رکهتا
ٹپک پڑے مري حسرت پر اشک دشمن کے
رولا دیا اُسے جو چشم تر نهیں رکهتا
کهلي هے آنکهه ' چلي آئے حسرت دیدار
یه میهماں کدہ ؛ دیوار و در نهیں رکهتا
قفس سے اب مجهے کرتا هے کیوں رها صیاد
بهار جا چکي 'میں بال و پر نهیں رکهتا

حال دل کیا سنائیں دل هي نهیں
گُم وہ دفتر هوا کهاني کا

لحد میں همکو نکیرین بهی نه پوچهینگے
غریب کا کوئی پرسان حال کیا هوگا

برسوں آب و دانه نے رکها یه سمجها کر اسیر
پهر بهار آئي هے ابکی تو رها هو جائیگا

عاشق کو آپ شوق سے آزاد کیجئے
ڈرنا بھلا غریب کی آہ و فغاں سے کیا

میرے دشمن ہیں جو کہتے ہیں یہ اچھا ہو جائے
تم ہو بس دوست کہ مرنے کی دعا کرتے ہو
دل کسی وقت بھی ٹھہرا نہ محبت میں جلال
نہ ملی آج تک اس راہ میں منزل مجھکو

غرض ان کے دیوانوں میں اس قسم کے اشعار کی اسقدر کثرت ہے کہ بقول انکے

بیساختہ کی، تمام، کے دل، اس نے جلال آہ
جس نے مرے دیوان کے اشعار کو دیکھا

شیخ ناسخ کے غلو و اغراق، اور خیالی مضمون آفرینی نے اردو شاعری کو جو نقصانات پہونچائے ان میں سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ انھوں نے غزل کو غیر فطری مضامین کا ایک مجموعہ بنا دیا، لیکن اسکے بالکل برعکس آتش اور تلامذۂ آتش کی سادہ‌گوئی نے شعراء کے لئے فطری مضامین کی راہیں کھول دیں اور اس طرح شاعری کا ایک نہایت موثر دور شروع ہوا جلال نے بھی انھی کی تقلید کی ہے اسلئے انکے کلام میں بھی اس قسم کے فطری مضامین کا ایک سادہ و موثر حصہ موجود ہے، مثلاً۔

جب سے عیادتِ دل بیمار تم نے کی
اٹھ بیٹھتے ہیں آپ سے، اتنا سنبھل گئے
بے رحم تھا وہ شوخ، نہ بے صبر تھے ہمیں
تاثیر حسن و عشق سلو، دل بدل گئے

گذرتي هے جو هم پر رات کو تهري جدائي میں
اسے لکھتے هیں دن بهر روز اک افسانہ بنتا هے
بلا کر یار کو دیدیتے هیں سب اختیار اپنا
هماری بزم میں مہماں، صاحب خانہ بنتا هے

لیکن باوجود ان تمام خوبیوں کے، آتش اور تلامذۂ آتش کا کلام، ابتذال سے خالي نہ تها اور جلال کے دوسرے دیوان میں بهي یہ ابتذال کہیں کہیں باقی رہ گیا مثلاً

آتے هوے جو دیکھ لیا کوئے یار میں
شیر درِندہ میری طرف بنکے سگ چلے
چهوڑیں هماري جلتي هوئي بهي نہ هڈیاں
مشعل کي طرح داب کے دانتوں میں سگ چلے

جلال کي شاعري کے یہ دونوں دور، غالباً رام پور میں گذرے جہاں ایک طرف تو شعراء کا باهمي مقابلہ رهتا تها اور دلی اور لکهنؤ کي رقابت کي آگ، اسي چقماق کي رگڑ سے همیشہ مشتعل رهتی تهي، جلال کے شباب اور فارغ البالي کا زمانہ بهي یہي تها اسلئے اس دور میں کلام میں زور و اثر کا پیدا هونا لازمي تها اور وہ قدرتي طور پر پیدا هوا۔ کلب علي خاں مرحوم کي وفات کے بعد رام پور کي بزم شعر، درهم برهم هو گئي، اور جلال نے پریشان حالي کے ساتهہ، لکهنؤ میں شاعرانہ زندگي بسر کرني شروع کي اور اس زمانے سے ان کي شاعري کا ایک نیا دور شروع هوا جسکي خصوصیات حسب ذیل هیں،

جلال کی شاعري کا تیسرا دور

(۱) صنعت طباق کي پابندی تو علیٰ حالہ قائم رهی لیکن رعایت لفظي کا زور کم هو گیا غالباً یہ موجودہ دور کي اصلاحي تحریک کا اثر هو جسکی ابتدا مولانا حالی نے کي تهي،

(۲) وہ لطف زبان، جو دوسرے دیوان کی امتیازی خصوصیت ہے،
باقی نہ رہا - البتہ بہت سے الفاظ متروک قرار دئے گئے اور
اسی سلسلے میں وہ مبتذل الفاظ نکل گئے جو ان کے
دوسرے دیوان میں موجود ہیں مثلاً ملن، مچلنا وغیرہ -
(۳) غزلوں کے اشعار کی تعداد میں نہایت اختصار پیدا ہو گیا اور
دو غزلہ کی تو شاید ہی کہیں نوبت آئی -
(۴) رندی و سرمستی کے مضامین کا وہ جوش باقی نہ رہا، بلکہ
وہ بہت کم باقی رہے البتہ بعض مضامین کی عریانی بہت
زیادہ نمایاں ہوگئی ؟ -
(۵) کلام کی فقیرانہ و آزادانہ شان قائم نہ رہی جو تلامذۂ آتش
کا امتیازی وصف تھی اور جلال کے دوسرے دیوان میں
اس رنگ کے اشعار ملتے تھے -
(۶) مضامین کی رفعت و بلندی بھی باقی نہیں رہی -
(۷) تشبیہات کی جدت و لطافت میں بھی فرق آگیا -

لیکن با ایں ہمہ یہ خصوصیات سرے سے مفقود نہیں ہوئیں اسلئے
انکے طرز کلام میں وہ دورنگی نہیں پیدا ہوئی جو مرآۃالغیب ؟ صنمخانۂ
عشق؟ گلزار داغ اور مہتاب داغ میں علانیہ نظر آتی ہے؟ -

تاریخی حیثیت سے جلال کے کلام میں جو تغیرات و انقلابات
ہوئے انکی تفصیل کے بعد، ہم انکے کلام پر ایک اور حیثیت سے نظر
ڈالنا چاہتے ہیں اور یہ وہ حیثیت ہے جو جلال کو اور تمام اردو شعراء
سے ممتاز کرتی ہے؟ فارسی زبان میں متعدد شعراء ہیں جنکی شاعری
صرف چند مضامین میں محدود ہے، مثلاً حافظ و خیام کی شاعری
کا تمامتر سرمایہ رندی؟ سرمستی ؟ بے ثباتی دنیا؟ زہد و قناعت
وغیرہ کے مضامین ہیں اور انہی مضامین کو وہ مختلف اسلوب میں

بار بار ادا کرتے ھیں، لیکن اردو زبان کا کوئي شاعر مخصوص مضامین کا پابند نہیں ھے؛ طرزیں سب کی الگ الگ ھیں؛ لیکن مضامین سب کے مشترک ھیں صرف جلال ایک ایسے شاعر ھیں جنھوں نے چند مضامین کو خاص کر لیا ھے اور انھي کو مختلف پیرائے میں باندھتے ھیں؛ -

مثلاً بیخودي؛ تلاش دوست، شوق، یاد دوست؛ نامہ و نامہ بر؛ دل کا شوروفساد؛ وفاداروں کي جفا آموزي؛ شب وعدہ شمعوں کي اداسي؛ حسرت باري، فریاد کي ناشنوائي، جل کے دل کي لگي بجھانا؛ کمل نان کے مےنوشي کرنا؛ دیوانہ کہکر دیوانہ بنانا؛ امید وصال کي جان نوازي؛ کوششوں کا دعا ھونا، تسلي وجہ اضطراب ھونا؛ انتظار میں آنکھوں سے دم نکلنا؛ مہمان کا صاحب خانہ بن جانا؛ بد بختوں کي خوش نصیبي؛ خاموشي عشق کي وجہ کا بیان میں نہ آنا، دل کی لگي بجھانا - ضعف کي قوت؛ حسرت اور روتھا ھوا دل؛ تقدیر کی ھنسي؛ چشم سخن گو وغیرہ وغیرہ - یہ وہ عنوانات ھیں کہ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ھوتا تو ھر عنوان کے تحت میں متعدد اشعار پیش کئے جاسکتے تھے؛ -

ممکن ھے کہ ایک ھی قسم کے مضامین کي تکرار؛ جدت پسند طبیعتوں کو نا گوار ھو، لیکن اولاً تو جلال کی غزلوں کا سرمایہ صرف انھي مضامین تک محدود نہیں بلکہ وہ غزل کے اور تمام مضامین کے ساتھہ اکثر ان کو شامل کرلیا کرتے ھیں؛ دوسرے محاسن شاعری کي بنیاد؛ جدت و ندرت پر رکھنا ھی ایک ادیبانہ غلطي ھے؛ اور شیخ ناسخ کي شاعری کو اسي غلطي نے بالکل بے اثر و بے کیف کردیا؛ جاحظ کا قول ھے کہ "مضامین تو بازاروں میں پڑے ھوئے ملتے ھیں" اسلئے مضامین کي تلاش و جستجو میں ایک نئي حس شاعر اور

ایک بلیدالطبع دهقاني دونوں برابر هیں - البته شاعر کا کمال صرف یه هے که وه ان مضامین کو عمده اسلوب' اور عمده پیرایه میں ادا کردیتا هے' اور جلال اس شاعرانه کمال میں اپنے تمام حریفوں سے بڑھے هوئے نظر آتے هیں؛ رهگئي مضامین کي جدت تو وه ؛ عربي زبان کے ایک ادیب کے نزدیک ' شاعر کا کمال هے؛ شعر کا نهیں؛ کیونکه یه کوئي ضروري بات نهیں هے که جو مضمون نیا هو وه عمده بهي هو اور عمده اسلوب میں ادا بهي کیا گیا هو ؛ البته نکته آفریني اور مضمون آفرینی ' دماغي جو لانی کا ایک مظهر هے؛ اسلئے اس حیثیت سے ایک شاعر کو اپنے دماغ کي داد تو مل جائیگي جیسا که شیخ ناسخ اور دوسرے نازک خیال شعراء کو ملي' لیکن یه ضرور نهیں هے که انکو اپنے اشعار کي داد بھی ملے' اور هم نے اس مضمون میں جلال کو نهیں بلکه جلال کے اشعار کو داد دي هے جو اس دور کے ذخیرۂ شاعري میں یقیناً سب سے زیاده مستحق هیں -

---

تبصرے

مبادی فلسفہ

(از ڈاکٹر تاراچند ، ایم - اے، ڈی، فل)

مغربی فلسفہ کی بنیاد، یونان میں پڑی - یوں تو بہت سے حکیم وہاں پیدا ہوئے لیکن فلسفہ کی عالیشان عمارت، سقراط، افلاطون اور ارسطو نے هی تعمیر کی -

انسان اور فلسفہ کی تاریخ میں یہ امر نہایت عجیب ہے کہ ان استادوں کا زمانہ، یونانی تہذیب کے زوال کا زمانہ ثابت ہوا - ارسطو سکندر کا استاد تھا اور سکندر نے یونان کے سیاسی کارناموں میں ایسا اضافہ کیا کہ جس کی مثال ملنی مشکل ہے لیکن سکندر کی فتوحات کا، یونان کی ذہنی ترقی پر، اُلٹا اثر پڑا اس کے مرنے کے بعد یونان میں کوئی ایسا فلسفی یا عالم نہیں پیدا ہوا جو ارسطو کے پاسنگ بھی ہوتا - سکندر کے عروج کے بعد یونان نے دماغ اور عقل کی آزادی کے ساتھ بیرون ملک کی سیاسی آزادی بھی کھودی - رومی سلطنت کے زمانہ میں یونان میں پڑھنا لکھنا جاری رہا - یونانی غلام، رومی آقاؤں کے اُستاد بنے، اُنھوں نے پرانے حکیموں اور عالموں کے خیالات کو حتی الوسع گم نہ ہونے دیا لیکن فلسفہ میں کسی نئی بات کا اضافہ نہ کر سکے - جب عربوں نے رومی سلطنت پر دھاوا کیا اور شام پر قبضہ کر لیا تو رومی سمندر کے کنارہ پر جو یونانی آباد تھے ان کا عربوں سے واسطہ پڑا - عربوں نے بڑے شوق سے یونان کے علوم اور فلسفے کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی کتابوں کو یونانی عبرانی زبانوں سے عربی میں منتقل کیا -

ساتویں صدي سے تیرھویں صدي تک عربوں کی علم دوستي کي وجه سے پرانا یوناني فلسفه زنده رها اور ان کے ذریعه سے یورپ کي قوموں کے هاتھوں میں پهونچا - یورپ کو اس فلسفه کے سمجھنے اور حاصل کرنے میں دو سو برس لگے - لیکن سولهویں صدي تک وہ اس پر ایسے حاوي هوگئے که اب ان کے عالم اور فلسفي آزادی سے ان سوالوں پر بحث کرنے لگے جو فلسفه کے بنیادی اصول سمجھے جاتے هیں - سترهویں صدی میں دے کارت' هابز' سپنوزا اور لاک' اتھارهویں میں برکلے' هیوم' اور کانت اور انیسویں میں هیگل' مل' سپنسر وغیره بڑے بڑے فلاسفر هوئے -

تهذیبوں کے تعلقات کي تاریخ میں یه نهایت عجیب بات هے که ایشیا نے یورپ کے فلسفه میں' محض یوناني خیالات سے فائده اُٹھایا - ابتداء سے لے کر انیسویں صدي تک' اُس پرانے فلسفه کے علاوہ کسي اور حصه کی طرف توجه نه کي - وجه یه معلوم هوتی هے که زمانه متوسط میں یورپ میں فلسفه برائے نام تھا ؛ فلسفه مذهب کا جزو سمجھا جاتا تھا ؛ بذات خود کوئی حیثیت نه رکھتا تھا - اس مذهبي فلسفے یا علم کلام کی ایشیائیوں کے دلوں میں کوئي وقعت نه هوئي - عربي عالموں مثلاً رازي' ابن سینا اور ابن رشد نے ارسطو کی شرحیں لکھیں' لیکن کسي نے جان سکوتس' اینسلم' آکونیاس کی طرف توجه نه کي - سولهویں صدي میں جب ایشیا میں سیاسي تلاطم برپا هوا ' عثماني ترکوں نے اسٹریا اور هنگری کے میدانوں میں جھنڈا گاڑا ' ایران میں صفویوں کا دور دوره هوا' هندستان میں چغتائي دولت کی دهوم مچی اور چین میں منگ خاندان کی سر پرستي میں قومي حکومت قائم هوئي' تو کچھه کم زیاده دو صدیوں تک ایشیا سیاسی کامیابي اور تمدنی

ترقي کے نشہ میں مست رھا اور اس کے غرور نے اسے موقع نہ دیا کہ وہ فرنگستان کي حقیر آبادی کي تمدنی اور عقلي کارروائیوں میں دلچسپي لیتا - نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کا علم اور فلسفہ یورپ تک محدود رھا اور ایشیاء میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئي کہ یورپ میں کیا ہورھا ھے - اتھارویں صدي میں ایشیا کا رخ تنزل کي طرف مائل ہوا اور انیسویں کے آغاز میں بہت سے ملکوں کو یورپ کے سامنے سر جھکانا پڑا - ھندستان میں بنگال کی فتح کے کچھہ ھي دنوں بعد انگریزي تعلیم شروع ہوئی اور ھمارا ملک یورپ کے علوم سے واقف ہونے لگا - انیسویں صدی کے وسطي زمانے میں ھندستان میں انگریزي کتابوں کے ترجمہ کا سلسلہ جاري ہوا - لیکن ابتدائي کوششیں بہت کامیاب نہ ہوئیں اور اس کي وجہ غالباً یہ تھي کہ اس وقت تک لوگوں نے یورپ کي تمدني اور سیاسي ترقي کا راز واقعي طور پر نہیں سمجھا - ان کی نگاھوں کے سامنے یورپ کي شان و شوکت ' فوجی دبدبہ ' مال اور دولت ' عجیب و غریب کلیں اور مشینیں تھیں اور اُنھیں پر وہ یورپ کي طاقت کا دار و مدار سمجھتے تھے - انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ ظاھري سامان کسی باطني قوت کے مظاھر ھیں - ایک مدت تک انھوں نے یہ نہیں محسوس کیا کہ ان سب کي بنیاد سائنس اور علم کے کرشموں پر ھے اور علم کي نشو و نما خیال کي طاقت پر منحصر ھے - جب تک ذھن میں زور نہیں اور خیال ان قیدوں سے باھر نکلنے کی جرات نہیں کرتا جنھیں رسم و رواج' مذھب یا پرانے وقتوں کي یاد نے قائم کر رکھا ھے اس وقت تک نئی تحقیق اور نیا انکشاف غیر ممکن ھے اور اس لئے تمدن کي ترقي کا راستہ بالکل بند رھے گا - اگر یورپ کی قومیں

آزاد هیں تو اس کي وجه یه هے که وه اس بات کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں که ان کے دماغوں پر غیروں کا تسلط هو' ان کے نزدیک اپنے ذهن اور نفس کو دوسروں کے ماتحت کردینا' غلامي نہیں موت هے' کیونکه زندگي کا مفہوم خیال کی آزادي کے علاوه کچھه نہیں -

کچھه عرصه سے ایشیا کے لوگوں نے اس راز کو سمجھنا شروع کیا هے - پہلے پہل جاپانیوں نے اسے سمجھا اور اب بیسویں صدي کي ابتداء سے ترک ' مصري ' ایرانی ' افغاني ' چیني اور هندستاني بھي اسے سمجھنے لگے هیں - یه اسي بیداري کا نتیجه هے که یورپ کي ترقی کی حقیقت کو جاننے کي واقعي کوشش همارے ملک میں شروع هوگئی هے - اسی وجه سے اب هم یورپ کے علوم اور فلسفه کی نقل سے مطمئن نہیں هیں بلکه انہیں اپنے ذهن کا حصه بنانے کی جستجو کر رهے هیں - هم یورپ کے رعب سے مغلوب هوکر صرف ترجموں پر کفایت نہیں کرتے بلکه اس کي ذهني طاقت کو اپني ملکیت بنانے میں مشغول هیں -

مولوي عبدالماجد کي تصنیف بھي کچھه اسي تحریک کا نتیجه هے - مبادي فلسفه یا فلسفه کي پہلي کتاب' ان چند مضامین کا مجموعه هے جو اردو کے رسالوں میں پچھلے اٹھاره برسوں میں شائع هوچکے هیں - قابل مصنف نے مجموعه کے مرتب کرتے وقت ان پر نظر ثاني کرلي هے اور اسے ایک مستقل اور جدید تصنیف کا درجه دے دیا هے - اس مجموعه میں ۱۰ مضامین شامل هیں - پہلے میں انہوں نے ایک خاص نقطۂ نظر سے فلسفه کی تاریخ بیان کي هے؛ دوسرے اور تیسرے میں مل اور برکلے کے فلسفے کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈالي هے اور آخری تین میں نفسیات

کے بعض سوالوں پر بحث کی ہے - جن لوگوں نے انگریزی میں فلسفہ کی تعلیم نہیں حاصل کی ہے اُن کے لئے یہ مقالات نہایت مفید ثابت ہونگے - اُن کے ذریعہ سے یورپ کی خیالی زندگی کی شاندار عمارت میں اُن کا داخلہ ہوجائیگا اور منطق، مابعدالطبیعات، اخلاقیات اور نفسیات کے اصولوں سے تعارف ہوجائیگا - مولوی عبدالماجد ایسے بہت کم رہنما ملیں گے جو اُردو دانوں کو یورپ کے فلسفہ سے شناسا کرنے میں کامیابی سے کوشاں ہوں - آپ نے فلسفہ کے اصولوں پر اس طرز سے بحث کی ہے کہ مشکلیں آسان ہوگئیں ہیں اور گتھیاں سلجھہ گئی ہیں - آپ کے بیان کی خوبی محض صفائی ہی نہیں ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ فلسفہ پر کس قدر قادر ہیں بلکہ ایک شگفتگی ہے جس نے خشک سے خشک مسائل کو دلچسپ بنادیا ہے - ہر فلسفی کا فرض ہے کہ دلیلوں کے ذریعہ اصولوں کو سمجھائے اور اُن دلیلوں کے منطقی ربط کو واضح کرے - یہ ظاہر ہے کہ یہ دلیلیں ایک دوسرے کے ساتھہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ملی رہتی ہیں اور ایک کے بعد دوسری ایسی پیوست ہوتی ہے کہ کل مسئلہ پر عبور حاصل کرنے کے لئے سخت توجہ اور ذہن پر زور ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی وجہ سے فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا دقّت طلب ہے - اس دقت کو دور کرنے کا ایک ذریعہ ہے یعنے دلچسپ مثالوں سے اور صاف طرز تحریر سے اصولوں کو ذہن نشین کرایا جائے - یورپ میں چند ایسے فلسفی گزرے ہیں جنھوں نے ان امور کا لحاظ رکھا ہے - برکلے اور ولیم جیمز کے نام ان میں قابل ذکر ہیں - مولوی عبدالماجد نے بھی اُنھیں کا تتبع کیا ہے - ہندستانی زندگی سے مثالیں لی ہیں اور اپنے دلاویز طریقہ سے انھیں بیان کیا ہے -

ان مقالات میں یورپ کا فلسفہ پیش کیا گیا ہے - مدعا یہ ہے کہ برکلے، مل اور جیمز وغیرہ کے خیالات سامنے آجائیں - فلسفہ کی پہلی کتاب میں اس امر کی ضرورت نہیں کہ ان کے خیالات پر تنقیدی بحث کی جائے - اس میں شک نہیں کہ فلسفہ کا کوئی اصول منطقی رد و قدح سے خالی نہیں اور اس کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے تنقید کی ضرورت ہے لیکن غالباً اس طریقۂ بحث سے مبتدیوں کی مشکلیں بڑھ جاتیں، اس لئے اسے چھوڑ دیا گیا - تاہم موضوعوں کے انتخاب سے مصنف کی طبیعت کا رجحان جھلکتا ہے - پہلے ہی باب کو لیجئے اس میں فلسفہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور فلسفہ کا اصلی موضوع، عالم کی ترکیب یا کائنات کی ماہیت یا وجود کی حقیقت ٹھہرایا ہے اور اس بنا پر فلسفہ کا مبحث، مادیت اور روحانیت ہوتا ہے - فلسفہ کی تاریخ میں دوہی طرح کے فلسفی نظر آتے ہیں یا وہ جو مادہ کو حقیقی اور اصلی سمجھتے ہیں یا وہ جو روح کو - بعض ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک دونوں ازلی اور حقیقی ہیں - فلسفہ کی تاریخ گویا ایک طرح سے مادہ اور روح کی پرستش کرنے والوں کی جد و جہد کا بیان ہے - فلسفہ کا یہ پہلو دلچسپ ضرور ہے - لیکن فلسفہ کے تمام شعبوں پر حاوی نہیں - وجود کے مسئلہ کے برابر ہی علم نفس اور قدر و قیمت کے مسئلہ کی اہمیت ہے - علم کے مسئلہ کے تحت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم کا انحصار حس پر ہے یا عقل پر - احساسات اور معقولات کی حیثیت کیا ہے - کس قانون کے مطابق خیال کا نظام تیار ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ - نفس کا مسئلہ منطقی اصولوں سے علیحدہ ہوکر اس سوال سے بحث کرتا ہے کہ آدمی کا نفس کس طرح کام کرتا ہے؟ شعور کیا ہے؟ اس کی کیا صورتیں اور شکلیں ہیں؟ اور

اُن میں باهمي تعلقات کیا هیں؟ وغیرہ ۔ قدر و قیمت کا مسئله اخلاق اور مذهب کا بنیادي اصول هے ۔ وجود کا همیں محض علم هي نہیں هوتا هے بلکه وہ همارے محسوسات اور جذبات کو بهي بر انگیخته کرتا هے اور عمل پر مجبور کرتا هے ۔ اُن کا زندگی میں کیا درجه هونا چاهئیے؟ ؛ عملي زندگي اور کائنات کي جانچ پرتال' اخلاق اور مذهب کا حصه هیں ۔

مل کي منطق پر جو مضمون اس مجموعه میں شامل هے اس میں نه صرف تصدیق (Judgement) اور اس کے اجزاء پر بحث کي گئي هے بلکه مل کے مسئله قیاس کي طرف خاص توجه دلائي گئي هے ۔ مل نے اس بات پر بہت زور دیا تها که دو مقدموں سے جو نتیجه اخذ کیا جاتا هے وہ همارے علم میں کچهه اضافه نہیں کرتا ۔ کیونکه دراصل مقدمۂ اول میں نتیجه شامل هوتا هے اور اس لئے نتیجه محض مقدمه اول کي تکرار هے ۔ اس بحث سے مل نے یه نتیجه نکالا تها که قیاس کي یه تعریف که وہ "کلیات معلوم سے جزئیات نا معلوم تک پہنچنے کا نام هے' صحیح نہیں ۔ بلکه واقعه یه هے که قیاس بهی تجربه پر مبني هے ۔ کلیه صرف یه بتلاتا هے که قانون فطرت همه گیر هیں اور تغیرپذیر نہیں ۔ اصل یه هے که مل نے کلیه کے معني سمجهنے میں غلطي کي هے ۔ کلیه دو طریقه کا هو سکتا هے ایک کو حقیقي کلیه کہنا چاهئے اور دوسرے کو عددي کلیه یعني افراد کا مجموعه ۔ جب مقدمۂ اول میں مجموعه کا ذکر هو تو ظاهر هے که اس میں سب فرد شامل هیں اور نتیجه بجز تکرار مقدمه اور کیا هو سکتا هے ؛ لیکن دوسري حالت میں قیاس کے ذریعه سے علم میں واقعي اضافه هوتا هے ۔

برکلے کے فلسفه پر مصنف نے جو مقاله لکها هے اس سے ان کے میلان طبع پر بہت کچهه روشني پرتي هے ۔ بعض فقرے غیر معمولي جوش کے ساتهه برکلے کي تعریف میں لکهے گئے هیں ۔ اس کے

فلسفہ کو مادیت کا حریف ؟ مذہب کا حامی؟ الحاد کا دشمن' اور تصوف اسلام کا ترجمان بتایا ھے - یہي نہیں یہ بھي کہہ دیا ھے کہ اس نے مادیت کو فنا اور شک کو ختم کردیا ھے-میرے نزدیک یہ راے صحیح نہیں - محض واقعات کو دیکھیئے تو معلوم ھوگا کہ برکلے کے بعد سے آج تک یورپ میں برابر ایسے فلسفے کا رواج رہا ھے جس میں مادہ کو حقیقي تسلیم کیا ھے یاوجودکي وحدت سے انکار کیا ھے یا اسکے علم سے عقل کو قاصر سمجھا ھے - فلسفہ کے اعتبار سے بھي یہ راے مضبوط نہیں - برکلے نے مولوي عبدالماجد کے الفاظ میں یہ اصول قائم کیا "کہ وجود اشیاء محسوسیت اشیاء کے مرادف ھے" - لیکن اگر اس اصول کا پورا پورا تجزیہ کیا جاے تو اس سے صرف یہي نہیں ثابت ھوتا کہ مادہ کا وجود نہیں ھے' بلکہ یہ بھي ثابت ھوجاتا ھے کہ نہ روح کا وجود ھے نہ خدا کا- کیونکہ یہ دونوں محسوسیت کے دائرہ سے باھر ھیں -

آخر کے تین مضامین نفسیات سے تعلق رکھتے ھیں- ان میں غالباً "عادت" اور "فلسفہ عادت" سب سے اھم اور "ماھیت جذبات" سب سے زیادہ دلچسپ ھے - ان مضامین کے بارہ میں یہ عرض کر دینا کافی ھے کہ یہ آج سے قریب قریب بیس برس پہلے کے لکھے ھوے ھیں اور انمیں اس زمانہ کي نفسیات کا پرتَو نظر آتا ھے - نفسیات کے علم میں اس بیس برس کے قلیل زمانہ میں بڑي ترقي ھوئي ھے - طبیعاتي نفسیات (Physiological Psychology) نے عجیب و غریب ترقی کي ھے اور امریکہ ؟ روس اور جرمنی کے عالموں نے تجربات کے ذریعہ اس میں حیرتناک اضافہ کیا ھے - فرانس میں نفس کی غیر معلوم قوتوں کا انکشاف کرنے میں ھپناٹزم سے مدد لی گئی ھے اور اسٹریا میں فرائڈ؟ سوئٹزرلینڈ میں ینگ اور آڈلر وغیرہ نے لاشعور کے متعلق ضخیم مواد جمع

کیا ھے - جانوروں، بچوں اور وحشیوں کے مشاھدات سے نفسیاتی عملوں کی ابتداء اور نشو و نما سمجھنے میں مدد لی جارھی ھے نفسیات پر جو کچھہ بیس برس پہلے لکھا گیا تھا اس کے بارہ میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اعتماد کے قابل نہیں ھے لیکن یہ ضرور کہنا پویگا کہ اس میں تغیر و تبدل کی گنجائش ھے - عادت کے باب میں جناب مصنف نے اصلاح زندگی کے بارہ میں کچھہ مشورے دیے ھیں جو اس اصول پر مبنی ھیں کہ خارجی موئدات سے نیت اور ارادہ کے مستحکم کرنے میں مدد ملتی ھے - اگر اس اصول کا امتحان کیا جائے تو معلوم ھوگا کہ یہ کلیہ نہیں ھوسکتا - ھر فرد کا نفس ایک خاص ترکیب سے بنا ھے اس کا عمل لاشعوری، شعوری لیکن غیر ارادی اور ارادی محرکات پر منحصر ھے - اس لئے کسی خاص طبیعت کے رحجان کو جانے بغیر خارجی موئد تجویز کرنے سے بجائے فائدہ کے نقصان ھونا ممکن ھے - بعض صورتوں میں ممکن ھے کہ اس سے فائدہ ھو، لیکن اگر کلیہ کی طرح اسے تسلیم کرلیا جائے تو بعض حالات میں اسی سے ظاھرداری اور ریاکاری کو بھی تقویت پہونچ سکتی ھے - ایک بڑا گروہ جو فروش و گُندم نما انسانوں کا غالباً اسی کُلیہ پر کاربند ھونے کے باعث تیار ھوتا رھا ھے، جس کے بارے میں حافظ شیرازی نے بیشمار مقامات پر اشارے کئے ھیں - مثلاً

مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب
چوں نیک بنگری ھمہ تزویر می کنند -
واعظان کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند -

مشکلے دارم ز دانش مند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند -

ان سطروں کے لکھنے سے میرا منشاء یہ ہے کہ مولوی عبدالماجد کے مضامین کی فلسفیانہ اہمیت کی جانب پڑھنے والوں کی توجہ دلاؤں - مبادی فلسفہ ایسی کتاب نہیں ہے کہ اسے ایک مرتبہ پڑھ کر طاق پر رکھدیا جائے - اگر اس کے پڑھنے کے بعد دل میں یہ شوق نہ پیدا ہوا کہ فلسفہ کے مسئلوں پر غور اور مطالعہ کرنا چاہئے تو امر کا مدعا فوت ہوجائے گا - اس تنقید کو پڑھ کر اگر کچھ اصحاب میں تحریک پیدا ہو اور وہ ان باتوں کی تردید یا تائید پر متوجہ ہوں تو میرا منشاء پورا ہو جائیگا - میری ایک اور خواہش ہے - مولوی عبدالماجد دریاے علم کے پختہ کار تیراکوں میں ہیں ' لیکن ایک عرصہ سے وہ کنارے پر بیٹھے دریا کی سیر اور صحرا کے تماشے میں محو ہیں - کیا عجب ہے کہ یہ تنقید وہ موئد خارجی ثابت ہو جو انہیں دریا میں کودنے کے لئے اشتعال دے ' تاکہ دریاے فلسفہ کی تیراکی کے پرانے شائق پھر ان کے شاہکاروں کو دیکھنے کا موقع حاصل کریں -

---

شیون و جواب شیون

یہ ۳۲ صفحوں کی ' مسدس کی شکل میں ' دو نظمیں ہیں جو " جناب حکیم آشفتہ لکھنوی اور جناب سراج لکھنوی " کی کاوش طبع کا نتیجہ ہیں - نام کے ساتھ ہی شکوہ اور جواب شکوہ کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے ؟ اور ہر شخص بہ یک نظر یہ کہنے کے لئے مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ تقلید و تتبع کے سوا کچھ اور نہیں - لیکن تقلید و تتبع کا مسئلہ

ایک فاہر فلسفیانہ نظر کا محتاج ہے - معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب
کوئي عام سطح سے بلند تر ہستی اس عالم میں نمایاں ہوتی ہے
تو پھر وہ ایک جسم پر قناعت نہیں کرتی اور صدھا اور ہزارھا
پیکروں کے اندر سے آواز دینے لگتي ہے ؟ بولنے والے اپني آزاد
شخصیت کے فریب میں مبتلا رہتے ہیں ' وہ خود کو اپنے دل
و دماغ کا مالک سمجھتے رہتے ہیں انتہا یہ کہ وہ زبان سے
مخالفت بھي کرسکتے ہیں لیکن زبردست شخصیت کا تسلط
اس قدر چھایا ہوا ہوتا ہے کہ مخالفت کا آھنگ بھي سرتاسر
تقلیدی ہوتا ہے - شارحین مثنوي نے " بشنو از نے چوں حکایت میکند"
کي تفسیر میں ایسے ایسے بے شمار حکیمانہ لطائف سپرد قلم
کئے ہیں -

نظموں کے شروع میں بطور مقدمہ' پیر زادہ سید فدا حسین
بي - اے علیگ کي ایک مختصر سي تحریر ہے ' جس میں
شعرائے لکھنؤ کي گزشتہ غفلت و بے حسي کا ذکر کیا گیا ہے
لیکن اس کے لئے جو خوشگوار بلکہ شکرآلود انداز اختیار کیا گیا
ہے وہ عرفي کے اس شعر سے ' جسے مقدمہ نگار نے اسي ضمن میں
خود نقل کیا ہے ' قطعاً مناسبت نہیں رکھتا :-

نوارا تلخ تر میزن چو ذوق نغمہ کم یابي
حدي را تیز تر میخواں چو محمل را گراں بیني

اصل نظموں کے متعلق اگر فرصت ہو تو بہت کچھ کہا
جا سکتا ہے ' لیکن مختصر یہ ہے کہ حکیم آشفتہ کي نظم '
نسبتاً حسن شعریت سے یکسر خالي ' طرز ادا کي ندرتوں سے محروم
اور بندشوں کي چستي و صفائي سے عاري ہے ' بر خلاف اس کے
سراج کي نظم میں زبان کا لطف ' مصرعوں کي صفائی و بر جستگي

نے اس کتاب میں ان دکنی مخطوطات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ' جو انگلستان ' اسکاٹلینڈ اور پیرس کے کتب خانوں میں موجود ہیں - دکنی مصنفین کے حالات اور نمونۂ کلام کے ساتھہ متفرق اردو اور فارسی نسخوں کے اختلافات بھی دکھائے گئے ہیں -

مولف نے دکنی نظم و نثر کے مختلف دور کے جو نمونے پیش کئے ہیں - ان سے نہ صرف مخطوطات کی حالت منکشف ہوتی ہے - بلکہ اس سلسلے میں دکن میں اردو کی تدریجی ترقی پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے - (م)

بچوں کے کام

[ملنے کا پتہ :—ناظم انصاری تاردیو - بمبئی نمبر ۷ - چھوٹی جھبی تقطیع - لکھائی چھپائی عمدہ - قیمت ۲ آنہ ضخامت ۴۸ صفحات]

جناب ناظم صاحب انصاری نے کم سن بچوں کے اخلاق کی اصلاح و تربیت کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں یا یوں کہئے کہ چھوٹے اسباق لکھے ہیں - ان کے مجموعہ کا نام 'بچوں کے کام ہے سرخیاں بہت غور و فکر سے وہی انتخاب کیگئی ہیں جو بچوں کے مناسب ہیں - نظم طبعاً دلکش ہوتی ہے اس کے ذریعہ سے بچے جلد انکو یاد کر سکیں گے - اور ہمیں یقین و امید ہے کہ اصلاح اخلاق کے اہم مقصد کو یہ کتاب با حسن و جوہ پورا کر سکیگی - نظمیں نہایت صاف ستھری ہیں - اور ناظم صاحب کی پر گوئی اور مشق کی بین دلیل ہیں -

بچھوں کے کام

[تقطیع چھوٹی جھبی - ضخامت صفحات - لکھائی چھپائی عمدہ - قیمت ۲ آنہ - ملنے کا پتہ - ناظم انصاری - تاردیو - بمبئی نمبر ۷]

ناظم صاحب انصاری کی یہ دوسری کتاب لڑکیوں کی اصلاح کے لئے ہے - نظم کے ذریعہ لڑکیوں کو اخلاقی سبق دے ہیں - کڑھائی - گڑیاں - سینا پرونا - وغیرہ جو لڑکیوں کے کام ہیں انہیں پر نظمیں ہیں اور نہایت عمدہ بول چال میں ان کو نصیحت اور ہدایت ہے - ہمیں امید ہے کہ ملک میں اس کی پزیرائی اچھی ہوگی اور یہ مفید بھی ثابت ہوگی - ناظم صاحب ایسی مفید مگر کٹھن چیز پر قابل مبارک باد ہیں -

دلچسپ نظمیں

[تقطیع چھوٹی - ضخامت ۳۸ صفحات - لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۲ آنہ - ملنے کا پتہ - ناظم انصاری - انٹرنیشنل پریس - پرارتھنا سماج - بمبئی نمبر ۴]

اس کتاب میں ناظم صاحب انصاری نے (بالکل چھوٹے بچوں کے بعد) ابتدائی جماعت کے بچوں کے لئے اخلاقی اسباق کو نظم کا لباس پہنایا - ناظم صاحب کو ایسی نظمیں لکھنے پر کافی مہارت معلوم ہوتی ہے - نظمیں نہایت پاکیزہ ہیں - عمدہ بول چال ہے - زبان صاف و طرز ادا دلکش ہے - مدرس میں ابتدائی جماعت کے لئے یہ ایک اچھی کتاب ثابت ہوگی -

دبستان

[تقطیع اسکولی کتابوں کی - ضخامت ۱۴۶ صفحات - خط اور طباعت پاکیزہ قیمت ۱۲ آنہ - ملنے کا پتہ - ناظم انصاری - تاردیو پوسٹ نمبر ۷ بمبئی]

ناظم صاحب انصاری نے یہ کتاب لکھ کر فی الواقع دنیائے اخلاق و ادب پر بڑا احسان کیا - مولوی اسمعیل مرحوم میرٹھی کے بعد ایک

پیش نظر مقصد کے لحاظ سے مذکورہ تجاویز کي صحت و معقولیت سے کس کو انکار ہوسکتا ھے ' البتہ اس سلسلے میں صرف تھوڑي سي صراحت اس لئے ضروري معلوم ہوتي ھے تاکہ عام مصنفوں اور مضمون نگاروں کو صحیح مقصد کے سمجھنے میں آساني ہو ' اور اصل یہ ھے کہ انھیں کے سمجھنے اور متفق ہونے پر اس مقصد کی حصول یابي کا دار و مدار بھي ھے '

انشاء و ادب میں کُل دو چیزیں ھیں جن کا لحاظ رکھنا ضروري ہوتا ھے - اول یہ کہ " آپ کیا " کہتے ھیں ' دوسرے یہ کہ " کس طرح " کہتے ھیں - کیا کہنے کا اس وقت سوال نہیں ھے ' جو کچھہ بحث ھے وہ "کس طرح" کہنے پر ھے '

ہمارے علمي حلقوں میں اس وقت بیشتر ایسے حضرات موجود ہونگے ' جو اگر چاھیں تو نہایت آسانی سے عربی اور سنسکرت میں اظہار خیال کرسکتے ھیں ' لیکن باوجود اس قابلیت کے اگر وہ ملکي زبان میں اظہار خیال کو ترجیح دیتے ھیں تو اس کے صرف ایک ھی معنے ہوسکتے ھیں ' وہ یہ کہ ان کی غرض یہ ھے کہ ان کے قیمتي خیالات سے ملک کا بڑا حصہ فیضیاب ہوسکے ' لیکن اگر اس میں بھي نامانوس الفاظ اور ثقالت کو دخل دیا گیا تو فرمائیے کہ یہ غرض کس درجہ محدود ہوکر رہجائے گي - ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ادب کي حیثیت ' عام تحریروں سے مختلف ہوتي ھے بلکہ یہ بھي تسلیم کرتے ھیں کہ محدود حلقوں میں صرف اشارات و محذوفات سے بھي کام لیا جاتا ھے ' لیکن اس زمانے

میں ' کہ تقسیم دولت میں عوام و خواص کا امتیاز مٹایا جارہا ھے علم و ادب کی دولت کو کسی خاص حلقے کے لئے کیونکر مخصوص کیا جاسکتا ھے ؟ اب وقت آگیا ھے کہ ھمیں علم و ادب کے خزانے کو بھی یکساں طور پر سب کے لئے عام کردینا ہوگا ' یہ ھے اصل چیز جس پر اس وقت ھمارے علمی حلقے نے اگر لحاظ نہ کیا تو زمانہ؟ جمہوریۂ روس کی طرح ایک دن ان کا سارا اقتدار خاک میں ملا کر رکھہ دیگا ' اور ملک میں علمی و ادبی بساط بھی ایک نئے انداز سے بچھائی جائیگی -

---

ھم یہ نہیں کہتے کہ اردو سے فارسی اور عربی الفاظ کو یک قلم خارج کردیا جائے ؟ اس لئے کہ اردو زبان جب انہیں مختلف زبانوں سے ملکر بنی ھے تو ایسا کرنا عملاً نا ممکن ھے لیکن یہ امر بہ آسانی ممکن ھے کہ ھم لکھتے وقت اس کا لحاظ رکھیں کہ ھماری تحریروں کو پڑھنے والے ' عربی اور سنسکرت سے ناآشنا ھیں اور ان دونوں زبانوں کے وھی الفاظ انہیں معلوم ھیں جو ایک مدت سے ملکی زبان کا جزو ھوگئے ھیں ؟ اس صورت میں شاید "آسان زبان" کا لکھنا ان کے لئے آسان ھوجائے -

ایک مشہور ادیب کا (جن کے مضامین عموماً آج کل رسالوں میں نکلتے رھتے ھیں) ایک خط ھمیں موصول ہوا جس میں انہوں نے اکیڈیمی کے متعلق کچھہ باتیں دریافت کی تھیں ' اسی سلسلے میں ھم نے اُن سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ رسالے کے لئے بھی کچھہ مضامین مرحمت فرمائیں ؟ موصوف کی تحریروں میں زرا شین قاف کا خرچ ضرورت سے زیادہ ھوتا ھے اس لئے ھم نے یہ بھی لکھدیا کہ اکیڈیمی کے رسالے کی غرض

یہ ہے کہ وہ بلند علمي مضامین سے عوام کو آشنا بنائے' اس لئے براہ کرم ذرا زبان کو سہل و آسان رکھنے کي کوشش کیجئے کا اس کا جواب ہمیں یہ دیا گیا کہ ایسا کرنا قطعاً ناممکن ہے - اگر یہ صحیح ہے (اور جب انہوں نے لکھا ہے تو کیوں نہ صحیح ہوگا) تو ہمیں ان کي حالت سے پوري ہمدردي ہے ؛ اس لئے کہ اب وہ عورتوں' بچوں اور عام آدمیوں سے باہم تبادلۂ خیال کي لذتوں سے محروم ہوگئے ہونگے' یہ دوسری بات ہے کہ اس محرومی پر بھي غالب کي طرح اپنی اس تمنا پر تسکین حاصل کر رہے ہوں -

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا

ہمارے کہنے کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے کہ ایک فاضل اہل قلم نے اپنے بارے میں کوئي امر خلاف واقعہ بیان کیا ایک مدت کی عادت کے بعد اس قسم کي مجبوري بالکل قدرتی ہے - بہت ممکن ہے وہ صاف سادہ اور عام فہم عبارت میں اظہار خیال کي قدرت کہو چکے ہوں - لیکن اگر وہ اپنے ذہن میں اپنا مخاطب ہندوستان کے عام انسانوں کو مقرر کرلیں تو شاید بہت آساني سے سادہ تحریریں ان کے قلم سے نکلنے لگیں - لیکن اگر وہ اپنے بلند مگر محدود حلقۂ ادب سے باہر نہ نکلینگے' تو شاید آسان اور عام فہم تحریر بالکل ان کے بس سے باہر ہو جائیگي - ایک صاحب ایک مولانا کا چشم دید واقعہ بیان کرتے تھے - کہ بازار میں انہوں نے ایک پھلکي والے سے بجائے اس کے کہ یہ دریافت فرماتے کہ اسے گن کے دیتا ہے یا تول کے' اپني عربیت سے مجبور ہوکر' یہ دریافت فرمایا کہ تو اسے

عدداً دیکھتا ہے یا وزناً بیچارہ پُھلکي والا متحیر ہوکر اُن کا منھہ دیکھنے لگا - مولانا کے پاس اظہار خیال کا اور کوئي اسلوب تھا ہی نہیں - مجبوراً دوسرے شخص نے مولانا کی ترجماني کي اور اس طرح ہندوستان کے بلکہ ایک شہر کے دو انسان ایک دوسرے کا مفہوم سمجھنے کے قابل ہو سکے -

---

مشکل اور آسان تحریر کا اصل راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ لکھنے والے کا صحیح مخاطب کون شخص یا کون سی جماعت ہے - الہلال مرحوم نے جب ایک خاص اسلوب تحریر ملک میں پیش کیا تھا تو اس کا مخاطب رہنما یان قوم اور علماء کا طبقہ تھا - یہي وجھہ تھي کہ اُن تحریروں پر عربیت کا رنگ غالب تھا - لیکن وہی مولوي ابوالکلام جب ہندو مسلم کي عام جماعت میں تقریریں کرنے لگے اور اُن کا تخاطب عام ہندوستانیوں سے ہونے لگا تو اُن کا بیان حد درجہ سلیس اور سادہ ہو گیا اور وہ بات بالکل جاتی رہي کہ قدم قدم پر لغات سے مدد حاصل کی جاے تقریر کے علاوہ تحریروں میں بھي جب یہ غرض ملحوظ خاطر ہو کہ زیادہ سے زیادہ انسان اُس سے مستفید ہوسکیں تو اُس میں بھي صفائي اور سادگي ضروري ہوجاتي ہے - چنانچہ حال میں مولانا کا ترجمان القرآن اس حقیقت کي ایک روشن مثال ہے اس میں الہلال کي سي عربیت کہیں نام کو بھي نہیں ہے - صفائي اور سادگي اور رواني کا یہ عالم ہے کہ قریب قریب ہر شخص اس کو بہ آساني سمجھہ سکتا ہے - جس کي وجھہ یہ ہے کہ خود مولانا کا بھي یہی منشا ہے کہ ہر شخص اسے سمجھے اور اس سے

مستفید ہوسکے ۔ یہ صرف ہمارا خیال نہیں ہے بلکہ خود مولانا ایک جگہ اپنے دیباچہ میں فرماتے ہیں :-

"میں نے تجربے کے لئے سورہ بقر کا مجرد ترجمہ ایک چودہ ، پندرہ برس کے لڑکے کو دیا جو اردو کی آسان کتابیں روانی کے ساتھہ پڑھہ لیتا ہے ، پھر ہر موقع پر سوالات کرکے جانچا ، جہاں تک مطلب سمجھہ لینے کا تعلق ہے وہ ایک مقام پر بھی نہ اٹکا اور تمام سوالوں کا جواب دیتا گیا ، پھر ایک دوسرے شخص پر تجربہ کیا ، جس نے بڑی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھا ہے اور ابھی اس کی استعداد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اردو کے تعلیمی رسائل بہ آسانی پڑھہ لیتا ہے ، یہ تین جگہ تین فارسی لفظوں پر اٹکا ۔ لیکن مطلب سمجھنے میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی ۔ میں نے وہ الفاظ بدل کر نسبتاً سہل الفاظ رکھدئے :-

یہ سب اہتمام کس لئے ہوا ؟ صرف اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ اہل ملک اس سے فائدہ اُٹھاسکیں ' لیکن کیا اس اہتمام سے تحریر کی ادبی شان جاتی رہی ، اور وہ ادنیٰ و پست ہوگئی ؟ ہرگز نہیں نظم ہو یا نثر ' اس کے لئے یہ کہنا کہ اہتمام و انتظام اور کاٹ چھانٹ کے باعث اس میں برجستگی باقی نہیں رہتی ' قطعاً صحیح نہیں ، آج ہمارے سامنے نظم و نثر کے جو بہترین نمونے موجود ہیں ' کون کہہ سکتا ہے کہ اُن پر کتنی جانکاہیاں صرف کی گئی ہیں اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے کو کس کس طرح تول تول کر رکھا گیا ہے ۔ بہر صورت اگر کسی تحریر کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اُٹھا سکیں تو اس کا صاف ،

سادہ اور آسان ہونا ضروري ہے ' اور اس کے لئے ہر لکھنے والے کو کسي قدر تکلف اور اهتمام کرنا ہوگا ' کسی زبان اور اس کے ادب کي کامیابي کا اندازہ اس امر سے بھي ہوتا ہے کہ اس کا اثر بلکہ اس کي فرمانروائي کتنے انسانوں پر ہے ؟ کوئي چیز کتنی ہي اعلیٰ کیوں نہو لیکن اگر اس کي دنیا ؟ ایک مختصر اور محدود حلقے سے آگے نہیں ہے تو اس کو اُس غرور و ناز کا ہرگز موقع نہیں ہے جو قبول عام کے شرف پر ہونا چاهئے - اس لئے بھي خواهان اردو اگر اردو کی ترقي چاهتے ہیں اور ترقي کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عام ہوجائے اور زیادہ سے زیادہ انسانوں کے ..صو... میں آسکے تو اغلاق کو چھوڑ کر اپنی تحریروں کو صاف اور آسان بنانے کي کوشش کرنا چاهئے - اور ہ زبان و ادب کا انتہائي کمال بھي ہے کہ اچھے سے اچھے مطالب سادہ اور آسان طور پر ادا ہوجائیں -

---

گذشتہ تین مہینوں کے اندر هندي ادب کے تین مشہور مصنفین کي وفات کي خبر یقیناً سخت افسوس کے ساتھہ سني جائیگي - ان میں سے ایک صاحب پنڈت پدم سنگھہ شرما تھے ؟ آپ اُردو اور فارسي سے بھی کافي دلچسپي رکھتے تھے ' آپ نے اکیڈمي کي گذشتہ کانفرنس میں " هندي ' اُردو یا هندستاني " کے عنوان سے ایک نہایت پر مغز علمي مقالہ پڑھا تھا ؟ جو اِس وقت پریس میں ہے اور عنقریب اکیڈیمي کي جانب سے شایع ہوگا ؟ دوسرے صاحب گوسوامی کشوري لال ' هندي کے مشہور شاعر اور ناولسٹ تھے تیسرے بابو جگناتھہ داس رتناکر برج بھاشا کے ایک

بلند پایہ شاعر اور ہماری اکیڈیمی کی کونسل کے ممبر تھے

یہ تینوں بزرگ ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر بھی رہ چکے تھے اور یہی وہ سب سے بڑی عزت ہے جو ملک کی جانب سے کسی شاعر یا ادیب کو دیجا سکتی ہے ۔ ہندی کا حلقۂ شعر و ادب ان حضرات کی مفارقت پر جسقدر ماتم گسار ہو، کم ہے ۔ ہم بھی اس سانحہ پر متاسف ہیں ۔ اور پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں ۔

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جولائی ۱۹۳۲ء

ہندستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ، الہ آباد

هندستانی سنہ ۱۹۳۴ع

ایڈیٹر : اصغر حسین ، اصغر

فہرست مضامین

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۴ } جولائی سنہ ۱۹۳۴ع { حصہ ۳

اردو، هندی، هندستانی

از رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو - کے - سی - ایس - آئی - پی سی

آج کل میں اکثر رسالوں، اور اردو کی تصنیفات میں یہ دیکھتا هوں کہ اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ اردو دکن میں پیدا هوئی یا پنجاب میں یا کہیں اور - تاریخی نقطۂ نظر سے اگرچہ یہ بحث نہایت دلچسپ ہے لیکن زبان اور ادب کی ترقی پر مجھے اس کا اثر هوتا هوا نظر نہیں آتا - علماے ادب کو اختیار ہے کہ اپنی تحقیقات سے اِس کا مولد خواہ دکن قرار دیں خواہ دهلی مگر اس واقعے سے کسی شخص کو انکار نہیں هو سکتا کہ اس تیرہ دو سو برس کے عرصے میں جو کچھ ترقی اردو زبان یا اردو ادب میں هوئی ہے وہ دهلی یا لکھنؤ میں هوئی ہے؛ گو مجھے اس بات کے اعتراف کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ پچھلے بیس سال میں حیدرآباد نے اردو کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے - پچیس برس پیشتر تک جب کوئی شخص اردو کا تذکرہ کرتا تھا تو اُس سے مراد زیادہ تر اردو شاعری

سے ہوتی تھی لیکن اس پچیس برس میں شاعری کے علاوہ اور اصناف میں بھی اردو میں خاصی ترقی ہوئی ہے ' اب کچھ کتابیں تاریخ یا فلسفے یا اور مضامین پر اردو میں نکل گئی ہیں اور اُن کو پڑھ کر اردو کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے ' اسی طور پر ہمارے شاعروں کا بھی کچھ ڈھنگ بدل رہا ہے ' پہلے تو اُن کو موے میاں ' چاہ زنخداں اور گل و بلبل وغیرہ کی بہت تلاش رہتی تھی اور اسی تلاش میں اُن کی عمر صرف ہو جاتی تھی ' لیکن اب شکر ہے کہ ہمارے شاعروں کی توجہ اور طرف بھی مبذول ہوئی ہے ' ایران میں ' اس بیس چالیس برس کے اندر شاعری کا ڈھنگ بالکل بدل گیا ' اور عصر جدید کے شعرا نے پرانی زنجیروں کو توڑ کر اپنے تخیل میں آزادی حاصل کرلی ہے ' اپنے ملک کی اصلاح میں اور اپنے وطن کی حوصلہ افزائی میں جو ایران کے شعرا نے حصہ لیا ہے اس سے کسی شخص کو جو عصر جدید کی شاعری سے واقف ہو انکار نہیں ہو سکتا ' اگرچہ ابھی تک اردو شعرا پر تغزل کا رنگ بہت گہرا چڑھا ہوا ہے لیکن بتدریج وہ بھی بدل رہے ہیں - غالب نے ستر آسی برس پیشتر اِنہیں قیود کو محسوس کرکے غالباً یہ شعر لکھا تھا -

بقدر شوق نہیں ظرف تنگناے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مری زباں کے لئے

اگر وسعت زبان کی ہماری طرف سے سمجھ بوجھ کر کوشش کی گئی تو میرے خیال میں بیس پچیس برس کے اندر اردو ادب میں کافی ذخیرہ پیدا ہو جائیگا جس کے ذریعہ سے ابتدا سے انتہا تک اسی زبان میں تعلیم دینا ممکن ہو جائے گا - میرا عرصے سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی ملک کی تعلیم غیر زبان میں نہیں ہو سکتی ' نہ کوئی شخص

غیر زبان میں کمال حاصل کر سکتا ھے - ملٹن کے سے شاعر نے جو لاطینی زبان کا استاد تھا جب پراڈائز لاسٹ (Paradise lost) لکھنے کا ارادہ کیا تو آخرکار اس نے یہی تجویز کیا کہ اپنی ھی زبان یعنی انگریزی میں اُسے نظم کرنا چاھئے ' چنانچہ جو شہرت ملٹن کو اپنی زبان میں "پراڈائز لاسٹ" لکھنے کی وجہ سے ھوئی وہ اظہر من‌الشمس ھے -

انگریزی تعلیم یافتہ ھندستانیوں کی تعداد تیس یا پینتیس کرور آدمیوں میں صرف چند لاکھ کی ھے ' لیکن بڑے سے بڑے ھندستانی کو ھر وقت یہ خوف رھتا ھے کہ انگریزی بولنے یا لکھنے میں کوئی غلطی نہ ھو جائے - ایسے شخص ھندستانیوں میں جن کو انگریزی زبان پر پوری قدرت حاصل ھو ' یا جو محاورے اور ترتیب و بندش الفاظ میں غلطی نہ کرتے ھوں ' بہت کم ھیں اور ھمیشہ کم رھیں گے - ھر زبان کا تعلق سوسائٹی کے نظام سے ھوتا ھے ' جب ھمارا طرز و طریق زندگی ھندوستانی ھے تو بہت سے الفاظ اور محاورے انگریزی زبان کے ایسے ھیں جن کا اثر ھم پر ویسا نہیں ھو سکتا جو انگریزوں پر ھوتا ھے ؛ اسی طرح اگر بجائے انگریزی کے ھندستان میں فارسی یا عربی کا عام طور پر رواج ھوتا تو اُس کا بھی ویسا اثر ھندستانی طبیعت پر نہ ھوتا جیسا ایرانیوں اور عربوں پر ھوا کرتا ھے ' چنانچہ اس کا تجربہ ھندستان کو ھو چکا ھے -

اسلامی عہد حکومت میں فارسی اور عربی کا بہت کچھ زور ھندستان میں رھا ؛ لیکن ھندستانی مسلمانوں کو بھی بہ‌حیثیت زبان دانی کے کبھی وہ رتبہ حاصل نہیں ھوا جو ایرانی اور عرب ادیبوں کو ھوا ھے - ایک مرتبہ اس مضمون پر مجھہ سے پروفیسر براؤن سے کیمبرج میں گفتگو ھوئی تھی ' میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اُن سے یہ پوچھا کہ آپ کے

تجربے میں ایران میں کس هندستانی شاعر کی قدر کی گئی ہے ' اُنھوں نے صرف خسرو کا نام بتایا اور اُس پر بھی یہ کہا کہ گو خسرو هندستانی تھے یعنی یہ کہ هندستان میں رہے اور وہیں اُنھوں نے انتقال کیا لیکن نسل اُن کی هندستانی نہ تھی - مگر فارسی اور معربی کو چھوڑ کر جب سے اُردو کی بنیاد پڑی ' هندستانیوں نے جو اردو میں کمال حاصل کیا ہے اس پر کسی غیر ملک والے کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہے - میر ' سودا ' ذوق ' غالب و مومن ' آتش و ناسخ ' انیس و دبیر اردو کے مالک تھے ' انھوں نے جن ترکیبوں اور محاوروں کی بنیاد ڈال دی خواہ وہ فارسی اور عربی کے لحاظ سے صحیح ہوں یا غلط ' وہ اردو میں مروج ہو گئے ' بہ حیثیت بانیاں زبان اُن کو یہ حق تھا کہ وہ جس طرح چاہتے اردو ترکیبوں کو قائم کرتے ' ان کی زبان ٹکسالی زبان ہو گئی - اُن کے محاورے یا ترکیبوں سے اختلاف کرنا یا تجاوز کرنا غلطی میں شمار ہوتا ہے - اسی طریقے سے عصر موجودہ کے جو اساتذہ ہیں اُن کو بھی پورا اختیار ہے کہ نئے خیالات و محسوسات کو مناسب طریقے سے اردو میں ادا کریں ' ممکن ہے کہ بعض اوقات اُن پر بھی نکتہ چینی ہوتی ہو مگر رفتہ رفتہ ہم اُن کی ایجادوں کے بھی عادی ہو جائیں گے - اور اُن کی ترکیبیں بھی زبان میں داخل ہو جائیں گی -

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی زبان اپنی ملکیت ہے اس کو جس طرح ہم چاہیں استعمال کر سکتے ہیں اور اُس میں حسب ضرورت جو ترقی چاہیں ' کر سکتے ہیں ' کسی شخص غیر کی راے یا اجازت کے ہم محتاج نہیں - ہماری زبان ہمارے محسوسات و جذبات کی ترجمان ہے ' جو نہ انگریزی ہو سکتی ہے اور نہ کوئی دوسری زبان - میں اسی وجہ سے ہمیشہ اس کا کوشاں رہا کہ اردو کی ترقی ہو ' مگر

میں اس سے ناواقف نہیں ہوں کہ جب اردو کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندی کی کیوں نہ ترقی ہو؟ میں نہ ہندی کا بدخواہ ہوں اور نہ دشمن، گو اکثر ہندو اصحاب کا یہ خیال ہے کہ مجھ پر اردو یا مفلوسی کا اس قدر رنگ جما ہوا ہے کہ میں قریب قریب نیم مسلمان ہوں، میں نے نہ کبھی یہ کہا اور نہ اس کی کوشش کی کہ ہندی کی ترقی نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ پانچ برس کی عمر سے جب کہ میری تعلیم شروع ہوئی ہے مجھے اردو اور فارسی کا شوق رہا ہے اور اکثر انہیں زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں - اٹھاون برس کی عمر میں نئے نئے شوق ذرا پیدا ہونے دشوار ہوتے ہیں - اگر کسی کو یہ شکایت ہے کہ میں نے ہندی اور سنسکرت کیوں نہیں پڑھی تو اس کا جواب جہاں تک کہ میرے عالم طفولیت کا زمانہ ہے میں نہیں بلکہ میرے بزرگ ہو سکتے تھے - اور میرا خیال یہ ہے کہ میری عمر کے اکثر ہندوؤں کی یہی کیفیت ہے، پچاس برس پیشتر اس صوبے میں کم سے کم اُن اطراف میں جہاں میں پیدا ہوا اور میری تعلیم ہوئی، متوسط درجے کے ہندوؤں میں عام طور پر یہی رواج تھا کہ اردو اور فارسی میں اُن کی تعلیم شروع ہوتی تھی خواہ اُس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اردو اور فارسی زبان ذریعۂ معاش تھی، خواہ کوئی اور وجہ ہو، لیکن واقعہ یہی ہے کہ دہلی میں جہاں میرے بزرگ رہتے تھے اور اس کے قرب و جوار میں جہاں میری تعلیم ہوئی یہی رواج تھا - اُسی رواج کے مطابق میری بھی تعلیم ہوئی مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں ہندو ادب سے بالکل ناواقف ہوں یا میں نے واقفیت حاصل کرنے کی اپنے فرصت کے اوقات میں کوشش نہیں کی، میرا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی ہندوستانی اپنے تئیں ہندوستانی کہنے کا مستحق نہیں ہے تاوقتیکہ وہ ہندو اور اسلامی تہذیب و ادب سے تھوڑی بہت

واقفیت نہ رکھتا ہو - میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی اکثر یہ شکایت کرتا ہوں کہ انہوں نے ہندو تاریخ اور ہندو تہذیب و تمدن سے واقفیت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی - اگرچہ ایک زمانے میں مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد مل سکتی تھی جنہوں نے ہندو ادب میں بھی ایک خاصہ درجہ پیدا کرلیا تھا - تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ ایک مسلمان نو جوان مجھسے ملنے آئے انہوں نے تاریخ میں ایم - اے ' پاس کیا تھا - یونان ' روم اور یورپ کی تاریخ سے انہیں خاصی واقفیت تھی لیکن ہندو زمانے سے وہ بالکل ناواقف تھے اور اس کا انہوں نے اقبال بھی کیا - اسی طرح اکثر ہندو ایم - اے بھی ایسے ملینگے جن کو اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن سے مطلق واقفیت نہیں -

جب ایک معمولی تعلیم یافتہ ہندو کو یہ تعلیم دی گئی ہو کہ مسلمان ہندوستان کو لوٹنے کے لئے آئے تھے ' محمود غزنوی نے سترہ حملے کئے ' مسلمان بت شکن تھے ' انہوں نے آکر جابرانہ طور پر یہاں ۶۰۰ برس تک حکومت کی تو کسی کو کیوں تعجب ہو کہ وہ مسلمانوں سے دل میں نفرت رکھتا ہے ' اسی طرح اگر کسی مسلمان بچے کو شروع سے یہ تعلیم دی جائے کہ ہندو جنگلی ہیں سب بت پرست ہیں ' ان کے دینیات میں بجز تعصبات کے اور کچھہ نہیں ہے ' اور یہ مسلمانوں کے زیر حکومت ۶۰۰ برس تک رہ چکے ہیں اور اب مسلمانوں سے تاریخی انتقام لینا چاہتے ہیں تو کیا تعجب ہے اگر مسلمان ہندو سے نفرت کرے - اس چالیس برس کے اندر جس طرح کے بیج ہم نے بوئے ہیں اُسی طرح کے درخت اور اُسی طرح کے پھل ہمارے سامنے آرہے ہیں - اور اس پر ہر شخص کو دعوی نیشنلزم کا ہے -

آج کل یہ تماشہ ہورہا ہے کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقے میں کھانے پینے کی تو عام طور پر قیدیں اٹھ گئی ہیں ' بلا تکلف ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھہ عام جلسوں میں یہاں ' یا غیر ملکوں میں جب جاتے ہیں تو خورو نوش جائیز رکھتے ہیں مگر یہی حضرات جب سیاسی معاملات میں گفتگو یا تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے گویا کچھہ واسطہ ہی نہ تھا - اس سے بہتر تو ہمارے بزرگ تھے جو پابند قیود تھے لیکن چشم مروت رکھتے تھے ' آپس میں دوستی اور اخلاص کا تعلق رکھتے تھے - ممکن ہے کہ یہ بے اعتمادی اُس آزادی اور پولیٹکل طاقت کا پیش خیمہ ہو جس کا ہم سب دم بھرتے ہیں - جہاں اور نزاعات کی باتیں ہیں وہیں ایک زبان کا بھی مسئلہ ہے ' اپنے دل کے بہلانے کے لئے اب ہم نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ جب اردو اور ہندی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں زبانیں ایک ہی ہیں اور ہم کو بجائے اردو اور ہندی کے لفظ ہندستانی استعمال کرنا چاہئے ' ممکن ہے کہ چالیس یا پچاس برس پیشتر اس لفظ ہندستانی کا استعمال جائیز ہوتا لیکن اس وقت تو میرے خیال میں اس لفظ کے استعمال سے یا تو اپنے دل کو بہلانا مقصود ہے یا ایک دوسرے کو دھوکا دینا - واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جارہی ہیں ' اردو کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اردو میں فارسی اور عربی کے غیر مروج اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار کردیں ' اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ہندی میں بھی غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ بھر دئے جائیں - پس میرے لئے یہ مان لینا غیر ممکن ہے کہ ایسی اردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندستانی کا لقب دے سکتے ہیں - مجھہ کو تو اس کا خوف

ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ زمانہ دور نہیں جب کہ اردو داں کو ہندی داں سے گفتگو کے وقت ایک ترجمان کی ضرورت ہوگی اور اسی طرح اس کا بر عکس - اگر واقعی ہم لوگوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اسی طریقے سے اردو اور ہندی کی علحدہ علحدہ ترقی ہو اور جو کچھہ نتائج ہوں برداشت کریں تو کیوں نہ جرائت کے ساتھہ ہم اس کومان لیں کہ اردو دانوں کو اردوکی ترقی کا استحقاق حاصل ہے اور ہندی دانوں کو ہندی کی ترقی کا - میرے خیال میں اگرچہ یہ بہتر ہوتا کہ ہندستانی یعنی ایسی مشترکہ زبان جس کو عام طور پر ہندو اور مسلمان سمجھہ جاتے رائج ہوتی' لیکن اب اگر یہ نا ممکن ہوگیا ہے تو ہم کم از کم یہ کر سکتے ہیں کہ غیر مانوس عربی اور فارسی کے الفاظ اردو سے اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ ہندی سے خارج کرنے کی کوشش کریں - کچھہ عرصہ ہوا کہ ایک وصیت ایک ہندو صاحب نے ایک وکیل صاحب کی معرفت میرے پاس بھیجی - میں نے اُسے دو مرتبہ سنا ' ہندی میں لکھی ہوئی تھی - ستر فیصدی الفاظ میں نہیں سمجھہ سکا - ایسے ایسے قانونی الفاظ سنسکرت کے اس میں لکھے گئے تھے جو میں نے اپنے اڑتیس برس کے تجربے میں کبھی نہیں سنے تھے - آخرکار جب اُس کا ترجمہ انگریزی میں میرے سامنے پیش کیا گیا اس وقت میں قانونی راے دے سکا اب ایسی دستاویز کو میں کیا کہوں ' اردو ' ہندی یا ہندستانی ؟ -

میں اگرچہ سیاسی معاملات کے متعلق بہت کم عرض کرنا چاہتا ہوں لیکن جو کچھہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے وہ محض اس وجہ سے کہ زبان کا بہت کچھہ تعلق سیاسی نظام سے ہوتا ہے - یورپ کے بعض ممالک میں مثلاً پولینڈ یا السوس لورین میں جو زبان کے متعلق آپس

میں جھگڑے ہوئے ہیں اور اُن سے جو نتائج پیدا ہوئے ان سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہئے، مگر وہاں تو یہ تھا کہ فاتح اور مفتوح کے درمیان تنازعے تھے، یہاں یہ کیفیت ہے کہ یہ جھگڑے فاتح اور مفتوح کے درمیان نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ملک کے باشندوں میں اور اس پر لطف یہ کہ دونوں خواہاں آزادی ہیں -

میں نے روارَوی میں اپنے مکرم دوست مولوی اصغر صاحب مدیر رسالۂ ہندستانی کی فرمائش اور تقاضے کی وجہ سے اپنے چند خیالات کا غیر مسلسل طور پر اظہار کیا ہے، ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو میرے خیالات سے اختلاف ہو، مگر میں انہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے یہ خیالات مخلصانہ ہیں -

راس لیلا

(از مولوی حبیب الرحمان شاستری)

مجھے بحیثیت مسلمان ' کرشن کی راس لیلا سے وہ تعلق نہیں ہوسکتا ' جو ایک ہندو کو ہونا چاہئے ' لیکن ایک خاص معنی کے لحاظ سے اوتار ' یا مظہر کمالات ربانی مہاراج کرشن کی اعلی روحانی منزل کا یہ عجیب و غریب مظاہرہ صرف ظاہر بینی کی بنا پر آج کل قابل اعتراض خیال کیا جاتا ھے اس لئے میرے خیال میں ہر منصف شخص کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہ اس روحانی فعل کی للہیت کو واضح کرے -

نظر برآں ہندوستان کی مشہور روحانیت اور تصوف (ویدانیت سے ذوق رکھنے والے حضرات کی خدمت میں مضمون ہذا کے سلسلے میں خیالات ذیل کا پیش کرنا غیر مناسب نہ ہو گا -

زبان سنسکرت میں تشبیہ اور استعارہ کی بھر مار کی وجہ سے کسی حد تک یہ کہنے کا موقعہ ضرور ہوسکتا ھے ' کہ کرشن اور گوپیوں سے مراد انسان اور اُس کی خواہشات ہیں ؛ جو اُسے طرح طرح کے ناچ نچایا کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ - اس قسم کی تاویلات سے بعض لوگوں کی تسکین ہوجاتی ھے - لیکن میرے خیال میں یہ تاویلات اس جماعت کے لئے کافی نہیں ہیں جو گہرائی میں گھسنے کی عادی ھے اور ویاس جی کے سیدھے سادے الفاظ سے ہٹنا نہیں چاہتی ؛ نہ اسی کو ماننے کے لئے تیار ھے کہ جناب ویاس فرضی قصوں کے پیرائے میں اپنی ہدایتیں پیش کیا کرتے تھے - نیز اس لیلا میں اگر انسان کے لئے کوئی خاص اہم ہدایت اور روحانی اسرار مضمر نہیں تھے ' تو یہ چیز کرشن جیسی

مہتمم بالشان ہستی کے ساتھہ منسوب ہی کیسے ہوگئی ' اور نہ صرف منسوب ہوگئی بلکہ آج تک نظر عقیدت سے دیکھی جاتی ہے ' اس کے علاوہ میں جانتا ہوں کہ خدا کی طرف لے جانے والا علاوہ سلوک (کرم کانڈ) کے کبیر ' سور ' اور بلبھی والا ایک راستہ عشقی بھی ہے ' اس لئے میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ کے خیال سے متفق ہو کر نہایت آزادی سے کہہ سکتا ہوں ' کہ باوجود تمامی طریقوں سے واقف ہونے کے بھی کرشن کی اپنی اصلی چال مسجد اور مندر سے الگ ' ایک نسبت عشقی تھی ' لہذا اس نسبت عشقی کی غیر معمولی کشش اور اس کے ضروری لوازم پر غور کرنے کے بعد ' میرا غالب خیال ہے کہ اگر اصلی گوپیاں ہی کرشن کی شیدائی ہوکر راس لیلا کا باعث ہوئی ہوں تو بھی کسی معترض کو اعتراض کا حق نہیں ہو سکتا ' حضرت مرزا صاحب موصوف کا خیال مذکور حسب ذیل ہے -

† " ایک دن کسی شخص نے اُن کے سامنے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آگ سے بھرا ہوا ایک جنگل ہے اور کرشن آگ کے اندر ہیں اور رام چندر اُس آگ کے کنارے پر ' ایک شخص نے اس خواب کی تعبیر میں کہا کہ کرشن اور رام‌چندر بڑے کافروں میں سے ہیں اس لئے دوزخ کی آگ میں عذاب پارہے ہیں - فقیر (مرزا مظہر جان‌جاناں رحمۃ الہ علیہ)

---

† روزے شخصے در حضور ایشان گفت در خوابے دیدہ ام کہ صحرائیست پُر از آتش و کشن درون آتش است و رام چندر درکنار آن آتش - شخصے در تعبیر آن خواب گفت کہ کشن و رام چندر از کبرائے کفار اند - در آتش دوزخ معذب اند - فقیر گفت این خواب را تعبیرے دیگر است بر شخصے معین از گزشتگان بے آن کہ کفر یا واز شرع ثابت شود حکم بکفر جائز نیست - از احوال این ہردو کتاب و سنت ساکت است و بقتضائے " آیتہ شریفہ = وان من قریۃ الاخلا فیہانذیر " ظاہر است کہ درین جماعۃ نیز بشیرے ونذیرے گذشتہ باشد -

نے کہا اس خواب کی تعبیر دوسری ھے ؛ گزرے ہوئے کسی خاص شخص پر بلا اس کے کہ اُس کا کفر آواز شرعی سے ثابت ہو حکم کفر لگانا جائز نہیں ھے ؛ ان کے احوال سے قرآن و حدیث دونوں خاموش ھیں اور " کوئی بستی ایسی نہیں ھے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گذرا ہو " اس اقتضائے قرانی کے مطابق اِس جماعت میں بھی بشیر و نزیر (خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا) گذرا ہوگا -

† اس حالت میں احتمال ھے کہ یہ نبی یا ولی ھوں - رام چندر چونکہ پیدائش اجنہ کے شروع میں پیدا ہوئے اور اس وقت عمریں بڑی اور قوتیں زیادہ تھیں ' اس لئے وہ زمانے کے لوگوں کو نسبت سلوکی (کرم کانڈی طولانی راستہ) سے تربیت کرتے تھے اور کرشن ان کے بزرگوں میں آخری ھیں ' اس وقت بمقابلہ پہلے کے عمریں کم اور قوتیں ضعیف ہوگئی تھیں اس لئے انھوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو نسبت جذبی (عشق یا بھگتی کی راہ) سے ھدایت کی - گانے بجانے کی زیادتی جو ان کے متعلق بیان کی جاتی ھے وہ اس بات کی دلیل ھے ' کہ انہیں نسبت جذبہ سے ذوق و شوق تھا - لہذا نسبت عشق و محبت کی حرارتیں آتشی جنگل کی صورت میں ظاہر ہوئیں اور کرشن چونکہ محبت کی کیفیتوں میں مستغرق تھے اس لئے آگ کے اندر ظاہر ہوئے -

---

† دریں صورت محتمل است کہ اینہا ولی یا نبی باشند - رامچندر کہ در ابتدائے خلقت جن پیدا شد - در اں وقت عمرہا دراز وقوتہا بسیار بود اہل زمانہ را بہ نسبت سلوکی تربیت می کرد - وکشن آخریں بزرگاں اینہا است و دریں وقت نسبت بہ سابق عمرہا کوتاہ وقوتہا ضعیف گردید - پس اہل زمانۂ خود را بہ نسبت جذبی ھدایت می کرد کثرت غنا و سماع کہ ازوئے منقول است دلیل است بر ذوق و شوق نسبت جذبہ - پس حرار نہائے نسبت عشق و محبت بہ صورت صحرائے آتش نمودار شد - کشن کہ مستغرق کیفیتہائے محبت بود درون آتش ظاہر گردید -

†† اور رام چندر نے چونکہ سلوک کا راستہ رکھا ' اس لئے اس کے کنارہ پر نمودار ہوئے - زیادہ اللہ جانتا ہے - حضرت حاجی صاحب نے بہت پسند کیا اور اس تعبیر سے بہت خوش ہوئے " -

اس مختصر تمہید کے بعد گذارش ہے کہ مہاراج کرشن چونکہ جوگیوں کے سر تاج تھے اس لئے ان کی راس لیلا (ایک روحانی کرشمہ جس کو اکثر لوگ رقص و سرود ھی تک محدود جانتے ھیں) کی اندرونی حقیقت جاننے کے لئے جوگیانہ ادراک سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے - کون نہیں جانتا کہ انسان انفرادی (اشیاء عالم میں باھمی فرق دکھانے والی نظر جس کی وجہ سے زید عمرو سے علیحدہ معلوم ہوتا ہے) اور اجتماعی (وہ باطنی نظر جس کے اثر سے عالم میں ایک ھی انا دکھائی دیتا ہے) دونوں ادراکوں کا سر چشمہ ہے ' اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ارادوں اور افعال میں بھی ان دونوں کی نمایاں جھلک پائی جاتی ہے ' چنانچہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جب انسان پر انفرادیت یا خود غرضی کا غلبہ ہوتا ہے ' تو اپنے ذاتی فائدہ کے لئے اس بیٹے تک کے قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے جسے اس نے خود اپنا ھی خون اور پسینہ

---

†† و رامچندر کہ راہ سلوک داشت در کنارۂ آن پدیدار شد - واللہ علم حضرت حاجی صاحب رحمۃاللہ علیہ بسیار پسندیدند وازیں تعبیر خوش شدند "
مقامات مظہری مطبوعہ مجتبائی پریس دھلی صفحہ ۲۳ فصل ششم در استفادۂ از حاجی محمد افضل رحمۃاللہعلیہ -

حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب نے بھی ایک استفسار کے سلسلے میں بعینہ اسی عبارت مندرجہ بالا کا ترجمہ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃاللہعلیہ سے نقل فرمایا ھے -
ارشاد رحمانی مطبوعہ شاھی پریس لکھنؤ در حالات حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی - صفحہ ۴۴ -

ایک کرکے پالا تھا - اس کے ساتھہ ساتھہ ھی بعض اوقات کسی غیر کے
بھی شیر خوار بیکس بچے کو بھوک اور پیاس سے تڑپتا دیکھہ کر اسی
انسان کا کلیجہ ھل جاتا ھے اُس کی بھوک اِس کی بھوک اُس کی پیاس
اِس کی پیاس ھوجاتی ھے - اور اس اتحادی کیفیت کے سیلاب
میں انفرادیت کی دیواریں متزلزل ھو جاتی ھیں - یہاں تک کہ
یہی اپنے بیٹے کے قتل کا ارادہ کرنے والا انسان ' اس مصیبت زدہ کی
راحت کے لئے اُس دولت کے خرچ سے بھی دریغ نہیں کرتا ' جس کے
لئے خود اپنی اولاد سے بھی برسر پیکار ھوچکا تھا - غرض کہ اپنے گوشت
و پوست کی روح اور جوھر اصلی سے بنے ھوئے اپنے کو غیر سمجھنے اور
غیر کو اپنا جان کر گلے لگانے کا مادہ ' فطرت انسانی میں موجود ھے -
ظاھر ھے کہ اُن میں سے پہلے کا سر چشمہ ' ادراک انفرادی یا خود غرضی
ھے ' اور دوسرے کی بنیاد ' وہ اجتماعی یا عالمگیر باطنی انا کا اندرونی
ادراک ھے ' جس کی تحریک سے انسان موجودہ قومی رھنماؤں کی
طرح ' وقتاً فوقتاً دوسروں پر قربان ھوتا ھوا نظر آتا ھے ' نیز اپنے عمل
سے دنیاء مادی و انفرادی کے سب سے زود اثر ' اور ھیبت ناک اسلحہ
یعنی تیر ' تلوار ' توپ اور تفنگ کو خاک کے ذروں سے بھی زیادہ
بے وقعت سمجھکر ' اشیاء عالم اور ان کے اثرات کی واقعیت نما غیر
واقعیت کی قلعی کھولتا ھے - پس ان دونوں ادراکوں میں سے عوام تو
پہلے کو واقعی اور اصلی سمجھکر اسی پر جم جاتے ھیں ' لیکن جوگی
یا صوفی اس خواب کی سی ھستی سے ابھرتا ھے اور اپنے باطن سے متحد
ھونے کی وجہ سے اس کیفیت بیداری کا احساس کرتا ھے جس میں
خواب آسا انفرادیت ' عالمگیریت میں محو ھو جاتی ھے - اس ساری

تحریر سے میرا مطلب یہ ہے کہ جوگی یا ولی کی اصلی حالت ، عام طالبان خدا کی حالت سے مختلف ہوتی ہے ، گیتا بھی کہتی ہے -

(۱) " سب جگہہ مساوی نظر رکھنے والا جوگی اپنے کو موجودات عالم میں اور اپنے میں موجودات عالم کو دیکھتا ہے "

(۲) "جو شخص وحدت سے وابستہ ہوکر مجھہ کل موجودات میں رھنے والے کی بندگی کرتا ہے ، وہ جوگی ہر حالت میں رھتا ہوا بھی مجھہ ہی میں رھتا ہے "

(۳) " جو رنج سے رنجیدہ نہیں ہوتا اور راحت کا آرزو مند نہیں ہوتا - نیز جو رغبت و خوف اور غصہ سے مبرا ہو چکا ہے ، وہ سلیم العقل ملنی (جوگی) کہلاتا ہے "

(۱) تمامی جانداروں کی جو رات ہے ان میں متقی جوگی جاگتا رھتا ہے اور جس رات (لذات مادی میں غافل ہو جانے کی رات) میں تمام جاندار جاگتے ہیں وہ حقیقت میں جوگی کی رات ہے -

گیتا کے یہ اقوال جوگی کی حالت ظاہر کرتے ہیں کہ عوام سے برعکس ہے - جوگیانہ ادراک کے معنی بیان کرنے کے بعد اب میں راس لیلا کی لفظی تحقیقات کرکے ہندو شاستر کے مطابق اس کا صحیح مفہوم پیش کرنا چاہتا ہوں - اس سلسلے میں گذارش ہے

१—सर्वभूतस्थमात्मानं सर्वभूतानिचात्मनि ।
ईक्षते योगयुक्तात्मा सर्वत्रसमदर्शिनः ॥ (गीता अ० ६-२९)

२—सर्वभूतस्थितं यो मां भजत्येकत्वमास्थितः ।
सर्वथावर्तमानोऽपि स योगीमयिवर्तते ॥ (गी० अ० ६-३१)

३—दुःखेष्वनुद्विग्नमना सुखेषु विगतस्पृहः ।
वीतरागभयक्रोधःस्थितधीर्मुनिरुच्यते ॥ (गी० अ० २-५६)

که برادران وطن کا بعض مذھبی کتب کی بنا پر یہ قدیم عقیدہ ھے ' کہ اس لیلا کے دیکھنے ' سننے ' پڑھنے اور نقل کرنے سے نروان [1] یعنی نجات کامل حاصل ھوتی ھے - نیز اُن کا لٹریچر یہ بھی بتاتا ھے - کہ نجات چونکہ مفروضات دنیا سے چھٹ کر واصل‌باللہ (ब्रह्म में लय) ھونے کا نام ھے ' اس لئے اس کا حصول بغیر عرفان الٰہی (ब्रह्मज्ञान) کے ممکن نہیں - ان خیالات کے ھوتے ھوئے ھر جویاے حقیقت کا فرض ھے ' کہ وہ سب سے پہلے راس لیلا کے ایسے مفہوم کی جستجو کرے ' جو خیالات مذکورہ سے پورے طور پر چسپاں ھوکر ' ان کے پہلو بہ پہلو چلنے کی صلاحیت رکھتا ھو - اور چونکہ مفہوم مذکور کی تشریح سے پہلے اوتار کا مسئلہ مدنظر رکھنا ضروری ھے ' اس لئے مختصراً گذارش ھے کہ ھندو محققین نے اوتار کو حسب ذیل طریقہ سے سمجھا ھے -

خدائی طاقتیں ھر ذی شعور اور غیر ذی شعور میں اپنا ظہور کرتی ھیں ' اُن طاقتوں کا باھمی تناسب سمجھنے کے لئے اُن کے سولہ درجے (कलायें) فرض کئے گئے ھیں - اس کے ساتھہ ھی ساتھہ یہ بھی مانا گیا ھے کہ عام مخلوق میں ایک سے لیکر کمالات ربانی کے آٹھہ درجے تک ظاھر ھو سکتے ھیں - لیکن اس کے بعد اوتار کا مرتبہ ھے یعنی نو درجہ سے لیکر سولہ تک کے کمالات ' جس ھستی میں ظاھر ھوں گے وہ اصطلاحاً اوتار ' برھم ' خدا کہی جائیگی - اس تشریح سے یہ امر واضح ھوگیا کہ سولہ درجہ کے اوتار میں چونکہ نو سے لیکر پندرہ تک یعنی سات اوتاروں کے درجات کمالیہ بھی شامل ھیں ' اس لئے اس اوتار کو مجازاً خدا ' برھم یا کامل اوتار (पूर्णावतार) بھی کہا جاسکتا ھے -

---

१—या निशा सर्वभूतानां तस्यां जागर्ति संयमी ।
यस्यां जाग्रति भूतानि सा निशा पश्यतो मुने : ॥ (गी० २—६९)

اوتار کی اس حقیقت اور راس لیلا کے مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی لفظی تحقیق یوں ہونی چاہئے ' اس لفظ کے دو ٹکڑے ہیں راس اور لیلا ؛ لفظ راس رس سے (रस्य समूह:) بنایا گیا ہے اور پشر کے قول (रसोवैस: ' خدارس ہے) کے مطابق ' رس ' کے معنی برھم یا خدا کے ہیں اس لئے راس کے معنی حسب تشریح بالا سولہ درجہ کے کامل اوتار یا مجموعی برھم (पूर्णावतार) مہاراج شری کرشن کے ہوئے اب لفظ لیلا پر غور فرمائے ' لیلا مرکب ہے ' لی اور لا کا - ' لی ' مصدر کے معنی ہیں فنا ہوجانا (लय हो जाना) اور لا کے معنی ہیں لینے کے - اس طرح یہ لفظ فنایت حاصل کرنے والے فعل یا کرشمۂ مخصوص کے معنی ظاہر کرتا ہے ' اس لئے راس لیلا کے معنی ہوئے کامل اوتار یا (पूर्णब्रह्म) میں فنایت (लयता) حاصل کرانے والا کرشمۂ مخصوص - مقصد یہ ہے کہ اِسی لیلا کے ذریعہ سے کامل اوتار یا کرشن برھم نے گوپیوں کو اپنے میں فنا کرکے درجۂ فنا فی اللہ تک پہنچایا -

گوپیاں کرشن میں فنا (لے) ہوکر درجۂ فنایت تک کیسے پہونچیں اس کی تشریح حسب ذیل ہے -

پرانوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے - کہ کرشن جی کے ساتھہ گوپیوں کی محبت کا درجہ ' عشق کامل تک پہونچ گیا تھا - اور اس درجہ کا یہ لازمی نتیجہ ہے ' کہ عاشق کا قلب ماسوا محبوب سے خالی ہوکر ' اسی میں سما جائے - کیونکہ عشق کامل کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف پوری چاہت یا طلب کا ہونا - اور چاہت اس وقت تک پوری چاہت نہیں کہی جا سکتی ' جب تک کہ قلب ہمہ تن یکسو ہوکر اپنی پوری قوت اور توجہ ایک ہی طلب میں نہ لگادے - اور جب قلب کی پوری توجہ ایک چیز میں لگ گئی ' تو پھر اس میں سوائے

محبوب کے کسی کا ذکر ھی نہیں ھوسکتا ، لہذا یہ بالکل صحیح ھے کہ عشق کامل میں عاشق کا قلب محبوب کے سوا جملہ اشیاء سے خالی ھوجاتا ھے -

در دل عاشق چو عشق آتش فروخت
هرچه جز معشوق بود آنرا بسوخت

اور یہی مطلب ھے " العشق نار یحرق ماسوالمحبوب " کا یعنی عشق ایک آگ ھے جو محبوب کے سواء دنیا و مافیہا کو جلا دیتی ھے ، اس حالت میں عاشق کا دل دوسری تمام چیزوں سے توٹ کر صرف ھستئی محبوب سے مربوط ھوجاتا ھے - لذات نفسانی کی تمنا کیسی ؟ جسم جسمانیات کا احساس کہاں - انسانی ھستی کی کل کائنات ھی دریاء عشق میں غرق ھوجاتی ھے - جیسا کہ شعر ھذا [1] سے ظاھر ھے - " جب میں سر سے پیر تک تیری تمنا میں خرچ ھوچکا ، تو کچھہ باقی ھی نہ رھا کہ دوسری تمنا کروں "

اس محویت تامہ کے عالم میں جب محب و محبوب کے بیچ کا پردہ اُٹھہ جاتا ھے تو محب وہ محب اور محبوب وہ محبوب نہیں رھتا ھے - بلکہ اس وقت کی حالت قوت گویائی کے حدود سے بالا تر ھوجاتی ھے - جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاھر ھوتا ھے -

کہوں کیا کہ خلوت خاص میں جو حجاب بیچ سے اُٹھہ گیا
نہ وہ تم رھے نہ وہ ھم رھے جو رھی سو بے خبری رھی

مصرع ثانی سے ثابت ھوتا ھے کہ عاشق کا اصلی مقصود محبوب کا جسم نہیں ھوتا بلکہ اس کا منتہاے نظر چوں و چگوں کے حدود سے

---

۱ - چو من ز سرتا پای خود صرف تمنایت شدم * هیچم نماند تا ز نو صرف تمنائے دگر -

باھر ' وہ گنگ کردینے والی بے صورت ' لطیف تجلی ھوتی ھے ' جس کے ظہور کی طرف " نہ وہ تم رھے نہ وہ ھم رھے الخ " میں اشارہ کیا گیا ھے اور ظاھر ھے کہ یہ وھی آفتاب حسن ھے جس کی کرنوں کی چمک سے مہ جبینان عالم کے چہرے دمک رھے ھیں ' اور جو تمامی موجودات کے وجود سے ماورا رھکر انکو چمکا رھا ھے -

اسی کی شوخی شرار میں ھے ' اس کی گرمی چنار میں ھے
وہ آب ھر سبزہ زار میں ھے ' وہ لالہ ھر کوھسار میں ھے

عشق کی اسی منزل کے لئے کہا گیا ھے " العشق نار و اصل فی الذات رب العالمین " یعنی عشق ذات خداوندی سے ملا دینے والی ایک آگ ھے - بعضوں نے تو یہانتک کہا ھے کہ " العشق ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ انیس العاشقین میں ارشادات حضرت مخدوم شاہ حسام الحق مانکپوری رحمۃ اللہ علیہ میں بھی اسیکی وضاحت ھے اسی کو پلٹ کر بعض شعراء مغربی نے یوں کہا ھے - کہ عشق خدا ھے اور خدا عشق -

اس مقام پر یہ خیال پیدا ھونا صحیح نہیں ' کہ ھر عاشق اپنے محبوب میں فنا ھوکر درجۂ فنافی اللہ تک پہونچ جاتا ھے - کیونکہ یہ اسی کا درجہ ھے جو جسم سے پرے دریائے وحدت بیرنگی میں غرق ھوچکا ھو ' یا یہ کہ گوپیونکی طرح اس کی لو کسی ایسے مظہر کامل (पूर्णावतार) سے لگی ھو ' جس کے جسم مادی سے بھی آتشی شیشے کی طرح آفتاب بیرنگی کی کرنیں نکل رھی ھوں - اس عینیت محبوبی کے مسئلے کو یوں بھی سمجھہ سکتے ھیں ' کہ مذاھب نے روح کو متفقہ طور پر ایک انتہائی جوھر لطیف تسلیم کیا ھے اور فلسفۂ طبیعہ کی تحقیقات سے بھی یہ امر ثابت ھوچکا ھے کہ جو چیز جتنی زیادہ

لطیف ہوتی ہے ' اس میں اتنی ہی زیادہ نرالی طاقت بھی پائی جاتی ہے ' جیسا کہ ہوا بھاپ اور بجلی وغیرہ لطیف اشیاء کے حیرت انگیز واقعات سے ظاہر ہوتا رہتا ہے ' لہذا روح چونکہ تمام اشیاء سے زیادہ لطیف ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں طاقت بھی سب سے زیادہ تحیر خیز اور نرالی پائی جائے - پھر کیا وجہ ہے کہ روح کی اس غیر معمولی طاقت کا صدور کسی ایک متنفس سے بھی نہیں ہوتا ؟ اسکی وجہ سوا اس کے اور کچھہ نہیں ہوسکتی کہ روح غلبۂ عشق میں جسم انسانی سے مربوط ہوکر اسی طرح جسم ہوگئی ہے جسطرح قلمی پود سے بندہ کر تخمی پیڑ بھی قلمی ہوجاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ روح کی اپنی اصلی طاقت اسوقت ضرور ابھر آتی ہے جبکہ اس کے اوپر سے جسم اور جسمانیات کے خیالات کا تسلط اٹھہ جاتا ہے -

جوگی یا صوفی جب دنیا و مافیہا سے مڑکر اپنی انا یا حقیقت روحانی میں ڈوب جاتا ہے تو اس کی روح کی ابھری ہوئی طاقت ہی سے وقتاً فوقتاً حیرت انگیز تماشے ہونے لگتے ہیں - ورنہ اگر انسان کی روح میں غیر معمولی طاقت پہلے سے موجود ہی نہوتی تو اب کہاں سے آکر کمالات مذکورہ کو ظاہر کرتی ؟

یوگ درشن باب ایک - مقولہ مختصر (سوتر) اکتالیس [1] سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح بلور اپنی متصل چیز کا اثر قبول کرکے اسی کے رنگ روپ میں رنگ جاتا ہے - اسی طرح وہ قلب جو دنیا و ما فیہا سے خالی ہوتا ہے جس چیز کی طرف مائل ہوتا ہے اس کی شکل میں ڈھل جاتا ہے - اس امر کی مفصل توضیح ہوجانے کے بعد کہ عاشق محبوب کی

१—क्षीणवृत्तेरभिजातस्येवमणेर्ग्रहीतृग्रहणग्राह्येषु तत्स्थतदञ्जनता समापत्तिः (यो० १-४१)

صفات سے متصف ہوکر عین محبوب ہوجاتا ہے ' یہ امر خود بخود صاف ہوگیا ' کہ ہر عاشق درجۂ فنافی الہ تک نہیں پہنچ سکتا - کیونکہ جب عاشق میں محبوب کی صفات کا آنا ضروری ہے تو جو شخص کسی خواہشات نفسانی کے مجسمہ سے محبت کر کے اس کے جسم ہی کو مقصود اصلی قرار دیگا اس میں بھی لازمی طور پر نفسانیت اور انفرادیت وغیرہ اس کے ادنی صفات ہی سرایت کرینگے اور ظاہر ہے کہ ان صفات سے فنایت فی الہ کوسوں دور ہے - لیکن برخلاف اس کے گوپیوں کی لو ایک ایسے جوگیوں کے سرتاج سے لگی تھی جو کمالات ربانی کا آئینہ تھا لہذا ان کے لئے جو گیشور (جوگیوں کے سرتاج) کرشن کی صفت جوگ سے متصف ہوکر قناعت تک پہونچ جانا ایک معمولی امر تھا - گوپیوں اور کرشن کی محبت کے سلسلے میں مجھے یہ اور عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ گوپیوں کو کرشن سے محبت تھی - لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کرشن کو کیا محسوس کرتی تھیں ایک محیط کل عالمگیر روحانیت (آتما) یا جسم محدود - اس کا جواب خود اُنہیں کی زبان سے سنئے -

''آپ [1] یقیناً یشودا کے لڑکے نہیں ہیں بلکہ آپ تو تمامی ارواح میں اپنے آپ کو دیکھنے والے ہیں'' گوپیوں کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرشن کو وہی محیط کل روح اعظم یا اصلی ہستی سمجھتی تھیں جس کے بیان سے گیتا کے ابواب پُر ہیں - ایسی حالت میں غور طلب یہ مسئلہ ہے کہ وہ ان کے جسم محدود سے محبت رکھتی تھیں یا ان کے اصلی اور محیط ہستی سے' جواب ظاہر ہے کہ جسے وہ کرشن سمجھتی تھیں '

१—नखलुगोपिकानन्दनोभवानखिलदेहिनामन्तरात्मदृक् । (श्रीमद्भागवत स्कं० १० अ० ३१ श्‍लो० ४)

اسی سے محبت کرتی تھیں - نیز جب اصلیت اور صفات کمالیہ سے متصف عالمگیریت سامنے آگئی تو جسمی حدبندی اور نمایشی وجود کا گزرھی کہاں ؟ کیا یہ ممکن ھے کہ اصلیت کی موجودگی میں کوئی شخص فرضی یا نمایشی چیز کو پسند کرے ؟ - بلکہ واقعہ تو یہاں تک ھے کہ حقیقت اور اصلیت کھل جانے پر فرضی اور نمایشی چیز کی نوعیت کی تمام چیزیں ' دل سے اتر کر کالعدم ھوجاتی ھیں - چناچہ بھاگوت کو بغور پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ گوپیوں کا دل جسم و جسمانیت کی گرفت سے کسی حد تک آزاد ھوچکا تھا - اس میں اجسام کی غیر واقعیت کا خیال اس حد تک جاگزیں ھوگیا تھا کہ بعض اوقات وہ واقعی اور غیر واقعی میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتی تھیں اور جسم واقعی کا کام غیر واقعی (خیالی) سے لینے لگی تھیں - جیسا کہ کرشن کے غائب ھوجانے پر ان کے قول " میں ھی کرشن ھوں "[۱] سے ظاھر ھوتا ھے کیونکہ گوپیوں کا جسم عام نقطۂ نظر سے تو کرشن تھا ھی نہیں - لیکن پھر بھی انھوں نے اپنے کو کرشن کہا - اس سے صاف نتیجہ نکلتا ھے کہ تمامی اجسام عالم کے ساتھہ ساتھہ کرشن کے جسم محدود کے بھی نمائشی و اعتباری ھونے کا راز کسی حد تک ان پر کھل چکا تھا اور اعتباری و خیالی چیز چونکہ ایک جگھہ کے بجائے دوسری جگھہ بھی فرض کی جا سکتی ھے - اس لئے انھوں نے اپنے میں کرشن یا کرشن میں اپنے کو دیکھا -

اے زاھد ظاھر بیں از قرب چہ می پرسی
او در من و من در وے چوں بو بہ گلاب اندر

" اے ظاھر بیں زاھد تو نزدیکی کے متعلق کیا سوال کرتا ھے - وہ مجھہ میں اور میں اس میں اس طرح رھتا ھوں جیسے خوشبو گلاب کے

१—असावहंत्वित्यबलास्तदात्मिका न्यवेदिषुः कृष्णविहारविभ्रमाः ॥ भा० स्कं० १० अ० ३ श्लो० ३)

پھول میں'' اس واقعہ کی یہ توجیہہ صحیح نہیں ہوسکتی' کہ محض کرشن کے پوشیدہ ہو جانے کی وجہ سے گوپیوں کی یہ صرف اضطراری حرکت تھی - کیونکہ کرشن کی موجودگی میں بھی ایک گوپی کا آنکھیں کھول کر کرشن کا نظارہ کرنے کے بجائے اُنکی [1] خیالی تصویر کے تصور میں آنکھیں بند ہونے پر بھی مقشعرالاعضاء (بدن پر رونگٹے کھڑے ہونا) ہوجانے کا واقعہ بھی کسی ایسے نقطۂ نظر کا پتہ دیتا ھے کہ جہاں دنیاء واقعاتی کا بیڑا دریاء خیالی میں غرق ہو جاتا ھے - ہاں یہ سوال ضرور ہو سکتا ھے کہ جب گوپیاں عالمگیریت اور بیرنگی سے آشنا ہو چکی تھیں ' تو پھر کرشن کے جسم کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھاننے کے کیا معنی ؟ اس کا جواب یہ ھے کہ کرشن کی عالمگیر روحانیت سے آنکھ لڑتے ہی ان کی آنکھوں میں کچھہ ایسی عالمگیریت سمائی کہ تشبیہہ (ساکار) میں تنزیہ (نراکار) اور تنزیہ میں تشبیہہ کا تماشا دیکھنے لگی تھیں - نیز عالمگیریت کی کھڑکی کھل جانے پر بھی اس دنیا میں بالعموم جسمانیت ہی کا غلبہ رھنے کیوجہ سے بغیر کسی دقت کے لگاتار اور مسلسل مشاہدہ جسم ہی سے ہوسکتا ھے ' یہی وجہ ھے کہ اکثر طالبان بیرنگی نے بیرنگی کی کامل گرفت نہ کرسکنے کیوجہ سے جسم ظاہری ہی کو حقیقت کا زینہ بنایا ' جیسا کہ ایک عشقی نسبت کے بزرگ کو کسی چہرہ کے نظارہ میں محو دیکھکر کسی نے سوال کیا کہ یہ کیا ھے ؟ جواب ملا [2] - آفتاب کے چشمہ کو دیکھتا ہوں لیکن پانی کے طشت میں دیکھہ رہا ہوں '' - اب ذرا اس طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ھے

१—तं काचिन्नेत्ररन्ध्रेण हृदिकृत्य निमील्य च । पुलकाङ्ग्युपगूह्यास्ते योगीवानन्दसंप्लुता ।। भा० स्क० १० अ० ३२ श्लो० ८)

۲— چشمۂ آفتاب می بینم * لیک در طشت آب می بینم

کہ گوپیوں کی محبت کوئی معمولی محبت نہیں تھی - بلکہ اس کی تہ میں جوگ کی اعلیٰ حقیقتیں کام کر رہی تھیں -

دیکھئے دل میں اٹھتے ہوئے خیالات کے روکنے کو یوگ درشن میں جوگ [1] کہا گیا ہے اور خیالات روکنے کی دو ترکیبیں [2] بتائی گئی ہیں - اول اشیاء دنیا کی مدلل بے حقیقتی و بے ثباتی دیکھ کر ان سے قلب کا برگشتہ ہوکر منحرف ہو جانا - دوسرے جس حقیقت کی تحریک نے ان چیزوں سے دل کو برگشتہ کیا ہے اس سے وابستگی پیدا کرنے والے ذرائع کا متواتر عملدرآمد یعنی تصور مقصود میں ڈوب جانے کی مشق - ذرائع مذکور میں سے مہاراج پتنجلی نے منظور نظر شے کے تصور اور لذات دنیا سے برگشتہ انسان کامل کی روح سے وابستگی کو بھی بیان کیا ہے - نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ جسے [3] جوگ کی دھن ہوتی ہے وہ جلد کامیاب ہو جاتا ہے - خیال [4] واحد میں محویت کو بیماری - سستی اور بے قراری وغیرہ جوگ سے روکنے والی اشیاء کا مانع قرار دیا گیا ہے - کسی [5] خاص جگہہ دل کے باندھنے یا لگانے کو (بذریعہ تصور) مراقبہ یا دھارنا کہتے ہیں - یہی مراقبہ مسلسل یا لگاتار قائم ہوجانے پر لفظ دھیان [6] سے موسوم کیا جاتا ہے - اور جب [7] مراقب مراقبہ میں

१—योगश्चित्तवृत्तिनिरोधः यो० सू० २
२—अभ्यासवैराग्याभ्यांतन्निवृत्तिः । यो० सू० १२
३—यथाभिमतध्यानाद्वा । यो० सू० ३९
४—वीतरागविषयं वाचित्तम् । यो० सू० ३७
५—तीव्रसंवेगानामासन्नः । यो० समा० सू० २१
६—तत्प्रतिषेधार्थमेकतत्त्वाभ्यासः । यो० समा० सू० ३२
७—देशबन्धश्चित्तस्यधारणा । यो० वि० सू० १
८—तत्रप्रत्ययैकतानताध्यानम् । यो० वि० सू० २
९—तदेवार्थमात्रनिर्भासंस्वरूपशून्यमिवसमाधिः । यो० वि० सू० ३

کمال محویت کے ذریعہ شے مقصود کی شکل بن کر قائم ہو جاتا ہے
تو یہ حالت جوگ کی آخری منزل یعنی سمادھی کہلاتی ہے ۔ اب
ذرا جوگ کے ان بنیادی اصولوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے گوپیوں کی
حالت عشقی پر نظر ڈالئے ' تو معلوم ہوگا کہ یہ تمامی اصول اُن کے طرز
عمل میں بغیر کسی کوشش کے خود بخود موجود تھے - ابھی ابھی ظاہر
کیا گیا ہے کہ کرشن کی اصلی اور عالمگیر ہستی کے احساس کی وجہ سے
گوپیوں کے دل سے جسم و جسمانیت کا تخیل کالعدم سا ہوکر رہ گیا تھا '
اور اشیاء دنیا سے دلچسپی کا دار و مدار اسی تخیل پر ہے ' لہذا کوئی
وجہ نہیں کہ گوپیوں کے دل میں دنیا سے مکمل برگشتگی کا وجود
تسلیم کر کے ان کو دنیا سے کامل کنارہ کش (पूर्णवैराग्यवती) نہ
مانا جائے ' چنانچہ بھاگوت کے پڑھنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ
کرشن کا ادنیٰ [1] رابطہ بھی گوپیوں کے دل سے دیگر تمامی خواہشات کو
بھلا دینے والا تھا جو کامل ویراگ کا روشن ثبوت ہے - دوسری چیز یعنی
مشق تصور مقصود ' تو اس کا تو عاشق کامل کے لئے کہنا ہی کیا ہے -
عاشق سے زیادہ تصور محبوب میں اور کون مستغرق ہو سکتا ہے '
اب رہا منظور نظر شے کا تصور اور انسان کامل کی روح سے وابستگی -
تو ان دونوں چیزوں کی تکمیل تو گوپیوں نے کرشن ہی کے تصور کے ذریعہ
سے کر لی تھی - کیونکہ کرشن گوپیوں کو محبوب بھی تھے اور کامل ویراگ
کی تصویر بھی - اب باقی رہی محویت ' تو وہ عاشق سے زیادہ اور کسی
میں ہوتی ہی نہیں - اور گوپیوں کا صرف کرشن ہی میں محو رہنا
جوگ کی رکاوٹوں کے روکنے کے لئے بھی کافی تھا - نیز [2] " تم ہی میں

१—इतररागविस्मारणं नृणां वितर वीरनस्तेधरामृतम्
(भा० स्क० १० अ० ३१—श्लो० १४)
२—त्वयिधृतासव : त्वां विचिन्वते। (भा० १२० अ ३१—१)

دل رکھنے والی گوپیاں " اس جملہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گوپیوں نے کرشن میں چت (دل) لگا کر ' دھارنا (مراقبہ) کے منازل کو بھی طے کرلیا تھا - کیونکہ [1] آسو کے معنی چت (دل) کے ہیں اور چت کو کسی جگہہ (شے میں) رکھنے ہی کو دھارنا کہتے ہیں دھارنا کی ترقی یافتہ حالت ہی دھیان اور سمادھی ہوجاتی ہے - پھر کیا وجہہ ہے کہ خیالات دنیا سے کنارہ کش گوپیاں اِس عشقی جوگ کی تکمیل کرنے پر بھی کرشن میں لے ہوکر درجۂ فنایت تک نہ پہونچیں ؟ یہ ہے گوپیوں کی مذہبیت ' عشق صادق اور فنایت کی تشریح - اور یہ ہے اصلیت اس کرشمۂ عشق کی جسے دنیا راس لیلا کے نام سے یاد کرتی ہے -

१—शब्दार्थचिन्तामणि, पृष्ठ २२६

امیر خسرو اور تغلق نامہ

از مولوی مقبول احمد صمدنی ، صاحب ''حیات جلیل''

نامور و نام آور شعرا کے تذکروں اور کارناموں پر نگاہ ڈالنے سے اِن باکمال حضرات کے مقدمۃالجیش امیر خسرو پائے جاتے ہیں - امیر کا زمانہ شوال ۶۵۱ یا ۶۵۳ھ سے شروع ہوکر شوال ۷۲۵ھ میں ختم ہوجاتا ہے (= ۱۲۵۳-۱۳۲۵ع) قدرتی طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں - (۱) اس تہتر چوہتر برس کی مدت میں انہوں نے کیا کہا کیا تھا ؟ (۲) اِن کا سخنورانہ مرتبہ کیا تھا ؟ تخفیف تصدیع ، نیز گرمی محفل کے واسطے پہلی بات کا جواب بعد کو دینا چاہتا ہوں ؛ دوسری کا پہلے - اسکے لئے صرف چند ارشادات ایسے بزرگوں کے نقل کردینا کافی ہوں گے جنکی راستبازی ، درست گوئی وسیع خیالی و ژرف نگاہی دنیاے علم و فضل میں مسلم ہے ، جنکا فتوی اس بارے میں فیصلۂ قطعی کا اثر رکھتا ہے -

(۱) ملا عبدالقادر بدایونی [1] منتخب‌التواریخ [2] میں لکھتے ہیں

'' کلام منقد میں بعد ظہور کوکبۂ خسرو شاعران حکم وجود ستارہا در وقت اِرتفاع اعلام نیر اعظم پیدا کردہ و مانند سہیات ہنگام وحی منزل برخیرالبشر سید عالم علیہ‌السلام در پردۂ تواری ماندہ ، ازین ہا کم می گویند و می نویسند بلکہ نمی نمایند '' -

---

۱ــ ولادت ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ م) - وفات ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ م) بحوالۂ ثمرات‌القدس -

۲ــ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ م) سال ختم تصنیف - چہار سال مدت -

(۲) حضرت شیخ عبدالحق محدث دھلوی[۱] اخبارالاخیار میں فرماتے ھیں " امیر خسرو دھلوی رحمةاللہعلیہ سلطان‌الشعرا برھان‌الفضلاست - دروادی سخن یگانۂ عالم و نقادہ نوع نبی آدم ست - وے در سخن عالمی است از عوالم خداوندی کہ پایان ندارد - و او را از مضامین و معانی در اطوار سخن و انواع آن دست داد کہ ھیچ کس را از شعراے متقدمین و متاخرین ندادہ -"

انھیں پر منحصر نہیں — (۳) شیراز کے ھزاردستان و ھزار زبان شیخ سعدی[۲] نے امیر کے کلام اور اس کی حلاوت و شیرینی سے متاثر ھوکر جو تحسین بلیغ فرمائی[۳] اور سلطان محمد قا آن (خان شھید) ناظم ملتان کو لکھہ کر بھیجی تھی اور ان کا کلام مرتب رکھنے کی حرص دلائی تھی[۴]، غایت شھرت سے بے نیاز اعادہ ھے ، اور ایک دور افتادہ معاصر کے لیے موجب صد افتخار و نازش - شیخ کے ساتھہ امیر کی ارادت دلی اور خوش اعتقادی کا پتا خود اُن کے کلام سے چلتا ھے :—

خسرو سر مست اندر ساغر معنی بریخت

شیرہ از خم خانۂ سعدی کہ در شیراز بود

ایک اور موقع پر کہتے ھیں — جلد سخنم دارد شیرازۂ شیرازی -

(۴) خواجہ عصمت بخاری[۵] کو امیر کے تتبع پر فخر تھا - مولانا جامی نے بہارستان[۶] میں اسکا حوالہ دیا ھے -

---

۱—ولادت ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ع) - وفات ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ع) -

۲—ولادت ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ع) - وفات ۶۹۱ھ (۱۲۹۲ع) -

۳—تذکرة الکاملین قلمی - ید بیضا قلمی ، صفحہ ۱۱۹ -

۴—خزانۂ عامرہ ، صفحہ ۲۳۹ -

۵—وفات ۸۲۹ھ (۱۴۲۶) - ید بیضا ، صفحہ ۲۳۷ -

۶—صفحہ ۱۰۶ ، خزانۂ عامرہ ، صفحہ ۲۱۳ -

(۵) مولانا کاتبی نیشاپوری[1] کے سے استاد فن فرماتے هیں که میں نے خسرو کو ایک بار خواب میں دیکھا اور عصمت کی شهرت اور کامیابی کے راز کی نسبت پوچھا تو یه جواب ملا -

میر خسرو را علیه‌الرحمه شب دیدم بخواب
گفتم ایں‌عصمت ترا یک خوشه چین خرمن است
شعراو از شعر تو چوں بیشتر شهرت گرفت
گفت با کے نیست شعراو همیں شعر من است

نیز ایک موقع پر لکھا تھا [2] :—

گر حسن معنی ز خسرو بُرد نتواں عیب کرد
ز انکه استادست خسرو ، بلکه ز استادان زیاد
ور معانی حسن را برد از دیوان کمال
هیچ نتواں گفتن اورا دزد[3] بر دزد اوفتاد

میر غلام علی آزاد بلگرامی خزانه عامره [4] میں تحریر فرماتے هیں که یہاں کمال سے مراد خواجه کمال خجندی[5] هیں اور حسن سے امیر حسن علاسنجری دهلوی[6] ، جو خسرو کے خواجه تاش اور رفیق شفیق تھے -

---

۱—وفات ۸۲۹ھ (۱۴۳۵ع) ید بیضا ، ۳۶۰ - ' خزانه عامره ، صفحه ۳۸۵ -
۲—خزانه عامره ، صفحه ۲۱۴ -
۳—خواجه کمال خجندی ، امیر حسن دهلوی کا تتبع کرتے تھے - لیکن مولانا جامی فرماتے هیں که جو لطافت و معنی رسی کمال کے کلام میں هے وہ خود حسن کے اشعار میں نهیں پائی جاتی - اسی تقلید و پیروی کی بنا پر بعض ان کو دزد حسن کهنے لگے تھے - (بهارستان ، صفحه ۱۰۵) -
۴—صفحه ۲۱۴ -
۵—وفات ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ع) -
۶—وفات ۷۳۸ھ (۱۳۳۷ع) - مگر ید بیضا ، صفحه ۹۷ میں ۷۳۷ھ ۱۳۳۶ع) لکھا هے-

(۶) مولانا جامی۱ بھی ان دونوں صاحبوں کے کمال کے قائل تھے -

آن دو طوطی که به نوخیزی شان

بود در بند شکر ریزی شان

عاقبت سدرۂ افلاک شدند

خامشانِ قفس خاک شدند

خود امیر حسن کا قول اپنے یار غار خسرو کے بارے میں ملاحظہ طلب ہے -

خسرو از راہ کرم بپذیرد * آنچه من بندۂ حسن می گویم

سخنم چون سخن خسرو نیست * سخن این ست که من می گویم ۲

ملائے جامی بہارستان میں امیر خسرو کی نسبت لکھتے ہیں که···تتبع خاقانی می کند - ہر چند در قصیدہ به وے نرسیدہ اما غزل را از وے گذرانیدہ و غزل ہاے وے بواسطۂ معانی آشنا که ارباب عشق و محبت بحسب ذوق و وجدان خود را در می یا بند مقبول همه کس افتادہ است - خمسۂ نظامی به ازوے کسے در جواب نگفته وورائے آن مثنوی ها ، دیگر دارد همه مطبوع و مصنوع۳ -

خاقانی شروانی۴ کا قصیدہ ''شینیه'' بہت مشہور ہے - خسرو نے اُس کے اتباع میں ''مرآۃالصفا'' نام قصیدہ کہا تھا - جامی

۱—ولادت ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ (۷ نومبر ۱۴۱۴ء) - وفات ۱۸ محرم ۸۹۸ھ (۹ نومبر ۱۴۹۲ء) -

۲—حیات خسرو ، صفحه ۱۶۱ -

۳—ید بیضا ، صفحه ۱۲۰ -

۴—وفات ۵۸۲ھ یا بعد ۵۹۰ھ = ۱۱۸۶ یا ۱۱۹۴ء ید بیضا ، ۱۱۶ -

نے اِس کے جواب میں ایک طویل قصیدہ " جلاءالروح " لکھا - فرماتے هیں[1] -

چو درسیر معانی یافت خسرو سوے آن خوان رہ
ملاحت هاے او افگند شورے در نمک دانش
دگر خسرو سقاک‌اللہ نمی یا بد از آن رشتہ
شود سیراب فیض عین عرفان جان عطشانش
بشکر من چو طوطی روح او شکر شکن گردد
چو بفر ستم بهند این تنگ شکر از خرا سانش[2]

جامی کا دوسرا سیر حاصل قصیدہ " لجۃالاسرار " بھی خسرو کے جواب میں ھے - اِن کے سوا کئی غزلیں بھی خسرو کے طرز پر لکھی هیں -

زنکتہاے حسن جامی این کمالت بس
کہ ساز نظم ترا جز نواے خسرو نیست[3]

(۷) عرفی شیرازی[4] کے سے نازک مزاج و نازک دماغ سخن‌دان نے جو هر ایک هندی نژاد کے شاعرانہ کمال کا قائل نہ هوتا تھا ، طوطی هند "خسرو" کے تفوق و برتری کا نہ سهی ، اُن کے مرتبے کا ضرور اعتراف کیا ھے -

بروح خسرو ازیں پارسی شکر دادم
کہ کام طوطئی هندوستان شود شیرین

۱—کلیات جامی ، صفحہ ۳۲ -
۲—کلیات جامی ، صفحہ ۳۲ -
۳—کلیات جامی ، صفحہ ۱۳۷ -
۴—وفات ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ ع) ۳۶ سال - والہ نے ریاض‌الشعرا میں اور آرزو نے مجمع‌النفائس میں بڑی تعریف کی ھے -

(۸) ہمارے مایۂ ناز مورخ اور محقق شاعر آزاد۱ موصوف نے امیر کی منزلت اور اُن کے کمالات سخن رسی و بذلہ سنجی کو پیش نگاہ رکھ کر اُن (امیر) کے بعض مصرعوں پر پیش مصرع لگا دینے ہی کو اپنا فخر و شرف سمجھا تھا - مثلاً

اے خسرو شوخان چہ کند وصف تو آزاد
"خوبان عمل فتنہ ز دیوان تو یا بند"
میر خسرو نمکین شعر ترا خواند آزاد
"از نمکدان تو شد تازہ گرفتارئی دل"

(۹) آزاد کے محترم و مفتخر نانا اور اُستاد میر عبدالجلیل ۲ واسطی بلگرامی نے اپنی بے نظیر مثنوی میں اپنے شاعرانہ کمال کے اظہار کے سلسلے میں امیر کی فضیلت اور سربلندی بلکہ یکتائی فن کا اقرار و اعلان فرمایا ہے -

اگرچہ میر خسرو بود اُستاد
ندارد چرخ چون او دیگری یاد
بفکر دور دو پرواز دارد
نبی نبود ولے اعجاز دارد
در انواع سخن شور جہان است
بقدرت خسرو صاحب قران است

۱ــولادت ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ (۱۲ جون ۱۷۰۴ء) وفات ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) - حیات جلیل حصہ دوم - صفحہ ۱۷۱ -

۲ــولادت ۱۳ شوال ۱۰۷۱ھ (۲ جون ۱۶۶۱ء) وفات ۲۳ ربیع الاخر ۱۱۳۸ھ (۷ دسمبر ۱۷۲۵ء) - حیات جلیل ' صفحہ ۲۲۹ اول و خزانہ عامرہ ' صفحہ ۳۵۵ -

ولے من هم ازیں گلدستۂ نو
دریں عصرم بجائے میر خسرو[1]

اِن اور اِن ایسے بہت سے اقوال و اعترافات کے سننے کے بعد آج کس کے منہ میں زبان ہے جو کہہ سکے کہ

کوکبۂ خسرویم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی[2] فگند
گرچہ بروختم سخن مہر بست
سکۂ من مُہر زرش را شکست[3]

یہ محض خسرو کا ادعائے شاعرانہ تھا یا سخن گسترانہ تعلی، حقیقت سے دور، دلیل و تصدیق کی محتاج - لیکن اگر یہ اعتراض بجا اور حق بجانب سمجھا جائے تو اس شاعر کی جلالت شان اور عظمت درجت کے ثبوت میں میں اُن کے محتشم مرشد[4] اور بعض اسلامیان ہند کے دور وسطی کے مرجع اور بر گزیدہ رہنما حضرت نظام الدین اولیا کی ایک رباعی پیش کروں گا - اس سے بڑھ کر کوئی بینہ وشہادت کیا ہوسکتی ہے -

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن ایں خسرو راست
ایں خسرومانست ناصر خسرو[5] نیست
زیراکہ خدا، ناصر ایں خسرو ماست[6]

۱—مثنوی طوے محمد فرخ سیر بادشاہ، بحوالہ سر و آزاد، صفحہ ۲۶۳ و حیات جلیل، حصہ دوم، صفحہ ۱۰۳

۲—وفات بعمر ۸۴ سال ۵۹۷ھ (۱۲۰۰ء)

۳—مطلع الانوار -

۴—خزانۂ عامرہ، صفحہ ۲۰۹ -

۵—وفات بعد ۴۴۳ھ (۱۰۵۲ء) -

۶—ید بیضا، صفحہ ۱۱۸ -

نئے پرانے تذکروں اور تاریخوں میں ضیاء برنی ۱ کی تاریخ فیروز شاہی اور شاہزادہ دارا شکوہ ۲ کے سفینۃالاولیا اور نواب صدیق حسن ۳ کے تذکرۂ شمع انجمن کا نام لے دینا کافی سمجھتا ہوں -

امیر کی ان صفات واضافات کے ذکر کے ساتھہ ساتھہ اُن کی ذات کی نسبت یہ یاد دلادینا لابد ہے کہ وہ ہندوستانی تھے - میں نے وہ دونوں مقام دیکھے ہیں ' جنکے ساتھہ اُن کے کالبد خاکستری کو اِس جہان آب و گل میں تعلق رہا ہے - اور وہ دونوں اِسی ہندوستان کی سر زمین پر واقع ہیں -

(۱) وہ ویران قصبہ ' پٹیالی - جو اَب صوبجات متحدہ کے ضلع ایٹہ سے وابستہ ہے ' شاہنشاہ اکبر کے عہد میں دریاے گنگ کے کنارے مومن آباد پٹیالی کے نام سے سرکار قنوج ' صوبہ آگرہ کا ایک محال یا ضلع تھا - اِسی جگہہ کو یہ بے مثل شرف حاصل ہے کہ سلطان بلبن کے تعمیر کردہ قلعے میں (جسکے کھنڈر اب بھی نمایاں ہیں) یہاں کے حاکم امیر سیف‌الدین محمود کے مشکوے عالی میں ابوالحسن نام ' امیر خسرو عرف ' یمین‌الدولہ لقب ' وہ بچہ پیدا ہوا تھا ' ۴ جس نے روشن دنیا کے (یورپ کو چھوڑکر ' جس پر تمام تر تاریکی ' جہالت و گمنامی اُس وقت طاری ہو رہی تھی) سب سے زیادہ مشہور اور خوش گو ' دربار رس ' مگر متورع و متقی درویش مزاج شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی - جس نے بچپن کے چار سال یہاں گزارے تھے۵ - یہ لاچین ترک '

---

۱ — آٹھویں صدی میں وفات پائی - تاریخ فیروز شاہی ۷۵۸ میں لکھی تھی -
۲ — قتل ۲۱ ذالحجہ ۱۰۶۹ ھ = ۲۹ اگست ۱۶۵۹ع -
۳ — وفات ۲۹ جمادی‌الثانی ۱۳۰۷ھ - مطابق ۲۰ فروری ۱۸۹۰ع -
۴ — خزانۂ عامرہ ' صفحہ ۲۰۹ - و ید بیضا ' ۱۱۷ -
۵ — حیات خسرو ' صفحہ ۵ -

جس کے باپ دادا ہزارہ سے آئے تھے ۱ ' جسکی زباں پورے طور پر ب اور پ اور ت اور ٹ کے غیر نازک فرق سے آشنا اور ہندستانی ناموں کے صحیح تلفظ اور صحت کے لئے حرفوں کی تقدیم و تاخیر پر بھی قادر نہ تھی ' کچھ مدت تک " سلطانی " تخلص کرتا تھا ' اپنے دیوان تحفۃالصغر میں اپنے مولد و منشاء کو کس محبت کے ساتھہ یاد کرتا ھے -

گرچہ ایں از قضاے یزدانی ست
بھتیالی چہ جاے سلطانی ست ۲
من کہ از جملۂ سوار انیم
از تھی دستی اشک بار انیم

امیر اُسوقت تک سپاھی پیشہ ' ایک سوار تھے - " سلطانی " تخلص تھا - اُسکے بعد دونوں کو خیر باد کہہ دیا ' اور اپنی عرفیت امیر خسرو کی مناسبت سے " خسرو " تخلص اختیار کیا تھا ' جس نے نفس آخریں تک ساتھہ دیا - میرا یہ گمان ھے کہ " سلطانی " تخلص حضرت سلطان‌الاولیا کے انتساب اور اُنکی شفقت و رافت کی رعایت سے رکھا گیا جنھوں نے اِس عزیز اِرادتمند کو " ترک‌اللہ " خطاب دیا تھا ' ۳ نظر بحالات خصوصیات و تعلقات تا دم مرگ ' صحیح نہیں معلوم ھوتا - یہ وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اُتار دے - بلکہ مولوی سعید احمد مارھروی کی تحریر ۴ سے پایا جاتا ھے کہ امیر کو ایک بار اپنا تخلص بدل دینے کا خیال اِس بنا پر پیدا ھوا تھا کہ خسرو اھل دولت سے نسبت

۱—ید بیضا ' صفحہ ۱۱۷ -

۲—مقدمہ شیریں خسرو ' صفحہ ٦ نوٹ ۱ -

۳—سیرالولیا قلمی - مصنفہ سید محمد مبارک کرمانی معروف بہ امیر خورد - و ید بیضا ' صفحہ ۱۱۸ - حیات خسرو ' صفحہ ۱۳ -

۴—حیات خسرو ' صفحہ ۱۳ ید بیضا ' صفحہ ۱۱۸ -

رکھتا ھے - موقع پاکر حضرت سے عرض بھی کیا مگر آپ نے اسي کو قائم رکھا اور حلقہ بگوش اِرادتمند کا اطمینان بھي فرما دیا -

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا - خسرو جب وحشی تاتاریوں کی قید سے چھوٹے تو سیدھے دھلی آئے - غم زدہ ماں اور رنج و الم میں مبتلا عزیزوں کا کلیجہ ٹھنڈا کیا - اُن کے پیچھے بہت سی منتیں مانی گئی تھیں ؛ پوری کی گئیں - مگر دھلی اب اِن کے لئے اِن کی پیاری دھلی نہیں رھی تھی - حالت پُر آشوب پائی - اِطمینان و فراغت کے ساتھہ قیام کی کوئی صورت نظر نہ آئی ' ابنائے روزگار کا رنگ بدلا پایا ' تو شفیق والدہ اور عزیزوں کو لے کر پٹیالی چلے آئے [1] اور کچھہ مدت مقیم رھے - اِسی جگہہ سلطان معزالدین کیقباد کی تخت نشینی کی خبر ملی - پیچھے پیچھے طلبی کا شاھی فرمان پہونچا - ایک زبر دست بد خواہ ملک نظام‌الدین داربک کی موجودگی میں دربار سلطانی میں جانا خلاف مصلحت تھا ' لہذا پٹیالي سے اپنے ایک پرانے قدر شناس خان جہان حاتم خان کے پاس چلے گئے - [2]

(۳) حضرت دھلی ' کنف دین‌وداد

جنت عدن ست کہ آباد باد[3]

جہاں خسرو بڑھے چڑھے [4] اور عمر کا بڑا حصہ گزارا ' اور بالاخر یہیں پیوند خاک ھوئے - اِس کا ذکر جس خلوص و تپاک اور مستانہ روش سے فرماتے ھیں ' اُن کے دیوان اور مثنویاں بھری پڑی ھیں -

---

۱- مقدمہ قران‌السعدین از خان صاحب مولوی محمد اسماعیل ' صفحہ ۳۸ -

۲- " " " " ' صفحات ۵۳ ' ۳۸ -

۳- قران‌العدین ' صفحہ ۲۸ -

۴- خزانۂ عامرہ ' صفحہ ۱۱۶ -

اے دھلی و اے بتاں سا دہ!
پگ بستہ دریشہ کبج نہادہ!

اِن کے پیر طریقت کا قدمگاہ جو زندگی بھر اِن کا مامن و ماوی تھا، اِن کا آخری ملجا و ملتجا بنا اور یوں اِن کی دیرینہ تمنا یا سچی پیشین گوئی بھی پوری ھوکر رھی -

کلامش را نیارم نام گیرم
زھے بخت آرتھہ پایش بمیرم![1]

مدۃالعمر میں خسرو صرف ایک مرتبہ ھندوستان سے باھر گئے تھے - اپنے آقا ومربی سلطان شہید کے قتل کے بعد، اُس کی نمک خواری و وفاداری یعنی مصاحبت و مصحف داری کی خدمت کی بدولت، چنگیز خانی مغلوں کے پنجۂ ظلم و ستم میں گرفتار ھو کر اِن کو دوسال بلخ میں مقید اور طرح طرح کے تشددات و آلام میں مبتلا رھنا پڑا تھا - [3] فطرت کی شوخی و نیرنگی کہوں یا کار کنان قضاء و قدر کی ستم ظریفی، کہ یہ وھی ام البلاد بلخ ھے، جہاں امیر خسرو کے دادا پر دادا امیر اور حکمراں رھے تھے - آج اُسی خانوادہ عز و جلال، اُن ھی سلف مکرم کا ایک رشید خلف اُسی شہر میں (۶۸۴ ھجری = ۱۲۸۵ عیسوی) میں پا بجولاں لایا جاتا ھے! جو امیر ابن امیر اور خود بھی حشمت و شوکت والا ھے - قبولیت عام اور شہرت و نام نے جس کے قدم چومے ھیں -

معاف کیجئے گا کہ میں نے اِس ذراسی بات کو اِس قدر تفصیل کے ساتھہ یہاں لکھا ھے - میری اس حدی خوانی کے طفیل میرے اھل وطن

۱—قران السعدین، صفحہ ۳۶ -
۲—دول رانی خضر خان، صفحہ ۱۶ - "نسخۂ کشش" -
۳—خزانۂ عامرہ، صفحہ ۲۱۰ - حیات خسرو، صفحہ ۳۴ - ید بیضا، صفحہ ۱۱۹ -

ذہن نشین رکھیں کہ ان کا مایۂ فخر شاعر (خسرو) ہندستان زا تھا ' ہندوستان میں رہا ہندوستان ہی میں مرا ' جو کان بلاغت ' جان فصاحت تھا ' جو اصل و نسل دونوں اعتبار سے غیر ایرانی تھا ' مگر فارسی زبان پر ایسی قدرت رکھتا تھا کہ ایرانی بھی رشک کرتے تھے ! یہ بھی خیال رہے کہ خسرو کی ماں ہند و نژاد یعنی راوت عرض [۱] (مخاطب بہ عمادالملک [۲]) کی بیٹی تھیں اس طرح خسرو کی آبائی زبان ترکی ' مادری ہندی ' [۳] اور قومی و علمی زبان فارسی تھی - باپ کا سایہ کم عمری میں سر سے اُٹھ گیا تھا اِس لئے اِن کی پرورش و پرداخت ' تعلیم و تربیت تمام تر دردمند ماں اور دل سوز نانا کے زیر اثر ہوئی تھی -

انہیں خسرو اور ان کے چند معاصرین اور بعض حلقہ بگوش مقلدین کا تصرف اور اُن کے ذوق شعر و شوق ادب کا ثمرہ تھا کہ ہندوستان کی زبان اور فارسیت نے اہل فارس کے دل فتح کر لئے تھے - ہر طرف سے خراج تحسین وصول ہوتا تھا - زبانوں پر ستایش و نیایش کی صدائیں بلند تھیں - یہ اِنہیں کی گردش قلم کا فیض تھا کہ فارسی آج تک ایک غیر فانی زبان بنی ہوئی ہے -

"مجنون و لیلیٰ" کے ہنر پرور و جوہر شناس ناقد و مصحح کا بیان ہے کہ اس عہد میں ہندستان کی فارسی خراسان و ایران کی فارسی سے زیادہ فصیح وصحیح تھی ' جس پر خود امیر کی شہادت ہے اور اس سے بڑھ کر کیا شہادت ہوسکتی ہے -

---

۱ــ تمہید قران السعدین از سید حسن برنی ' صفحات ۵۷ ' ۵۹ - راوت ' ہندوستان کی ایک قوم جو راجپوت بھی کہلاتی ہے - قران السعدین ' صفحہ ۳۹ - حاشیہ تعلیق اول - نیز ملاحظہ ہو سیرالاولیا , صفحہ ۱۰۸ -

۲ــ خزانۂ عامرہ ' صفحہ ۲۰۹ -

۳ــ تمہید مذکور ' صفحہ ۵۹ -

اِسی سلسلے میں یہ اقرار بھی ضروری ھے کہ امیر خسرو کے ابتدائی زمانے کے اساتذہ بھی ھندی تھے ا - البتہ اِنھوں نے ھوش سنبھالا تو مولانا شہاب‌الدین مہمرہ کے کلام کا تتبع کیا تھا جو ایران سے چلے آئے تھے اور بدایوں میں آسودۂ خاک ھیں - اِسی بدایوں کی کشش سے مجبور ھوکر فرماتے ھیں -

زبس کز مرقد اهل بصورت چشمۂ نو راست
بجائے سرمہ دردیدہ کشم خاک بدایوں را

اپنے معنوی اُستاد کے نسبت ارشاد ھوتا ھے :—

دربدایون مہمرہ سرمست برخیزدزخواب
گر بر آید غلغل مرغان دهلي زین نوا

شہاب مہمرہ در مور گفتہ است خوب تر شعرے
دل چوں مورمن نیز از قضا سفت آن قدر موے

مہمرہ کا رنگ امیر کے پہلے دیوان تحفۃالصغر میں گہرا نظر آتا ھے - پھر تو اسي نوخیز نو آموز نے وہ کمالات اور جامعیت کے جوھر دکھائے کہ اُسکے زمانہ میں بلکہ اُسکے بعد بھی اب تک کوئي اس رفعت و بلندی تک نہیں پہونچ سکا - اس نے تو شروع ھی میں قدم اُس زینہ پر رکھا تھا جہاں اچھے اچھوں کی رسائي نہ تھی - پر جلتے تھے - دنیا پلٹ گئی - بہت سے نام اور نام والے مٹ چکے - مگر خسرو ! تمھارے کار نامے اب تک زندہ و بر قرار ھیں -

مولانا عبدالرحمن جامی اپنے ایک شفیق و رفیق بزرگ " صاحب دولتی " کے وجود باجود پر فخر کرتے اور ان کے فضائل و محاسن علمی

ا — مثلاً خواجہ شمس‌الدین خوارزمی ' جن کي ھشت بہشت میں تعریف کی ھے -

و شعری کو اندازہ و قیاس سے بلند و بالاتر بتاتے هیں - فرماتے هیں کہ انہوں نے بھی خمسۂ نظامی کے مقابلہ میں مثنویاں لکھی هیں - تیس هزار شعروں کا مجموعہ هوگا - خسرو دهلوی کے قصیدے کے جواب میں بھی ایک قصیدہ لکھا تھا " دوپائی " نام - اس میں بڑے دقیق معانی اور لطایف خیالات پیدا کئے تھے - قلق هے کہ اب ناپید هے - مطلع یہ تھا -

آتشیں لعلے کہ تاج خسرو اں را زیورست
اخگرے بہر خیال خام پختن در سرست ۱

پورے قصیدے یا اس کے کسی مسلسل ٹکڑے کو دیکھنے کے بغیر یہ رائے قائم کرنا مشکل هے کہ آیا صاحب دولتی کے مدنظر خسرو کی قدرشناسی وستایش تھی یا گریز محمدت - لیکن زور دار مطلع کے تیور بتاتے هیں کہ شاعر کو امیر کے کمالات کے اعتراف سے ننگ و عار هے - وہ لعل گراں بہا جو سلاطین کے تاجوں کا سرتاج هورها تھا ، اُسکی حقیقت ایک بے حقیقت انگارے سے زیادہ نہیں سمجھتے -

ان کے ایک هم‌عصر کی رائے بھی سن لیجئے - محمد تغلق جب صرف شاهزادہ آلغ خان تھا تو عبید زاکانی نام ایک نو وارد ایرانی بھی بارسوخ ملازم دربار تھا - یہ شخص جتنا بلند نظر اور وسیع‌الخیال واقع هوا تھا اُتناهی متکبر و بد دماغ بھی - امیر خسرو اُس کی نگاہ سے همیشہ گرے رهے - کہتا هے۲ -

فاط اُفتاد خسرو راز خامی
کہ سکبا پخت در دیگ نظامی۳

۱-بہارستان ، صفحات ۱۰۸ ، ۱۰۹ -

۲-حیات خسر ، صفحہ ۱۶۳ -

۳-سکبا ، ولایت میں ایک آش ، گیہوں کے روے ، گوشت ، سرکہ ، مصری اور کشمش سے تیار کیا جاتا هے -

اس تمثیل-میں شرخی سے زائد اسکی لطافت نمایاں ھے -

مثنویات خسرو کے جامع‌الفضائل دیباچہ نگاران نے امیر خسرو کا تقابل معمولاً مولانا نظامی سے کیا ھے اور بعض بزرگوں نے تو اس خدائے سخن کو مسجد کا بوریا نشین فریب ملا بلا کر چھوڑا ھے - حالانکہ دونوں کے زمانے میں سو سواسو برس کا فرق تھا - امیر کی زبان اوز ان کے کلام کی آبداریوں کا موازنہ ان کے ہم زمانہ شیخ سعدی سے کرنا چاھئے تھا - خسرو کی نظم و نثر دونوں ' سعدی کی نظم و نثر سے صریحاً مختلف ھیں - دونوں کا معیار بھی جدا ھے - امیر دونوں کو قدرے مشکل عبارت میں دشوار فہم لکھتے ھیں - سعدی وھی باتیں سیدھی سادی زبان اور بے تکلف بول چال میں ادا کردیتے ھیں - امیر کے یہاں لغات اور کم مانوس کلمات کی آمد ھے ' صنائع و بدائع ' تکلفات اور استعارات کی فراوانی اور بھر مار - سعدی چھوٹے چھوٹے جملوں اور لفظوں میں حرف مطلب اس طرح کھہ ڈالتے ھیں جیسے کوئی قند و نبات کی ڈلیاں بانٹ رھا ھو - خسرو بسااوقات لوھے کے چنے اور اینٹ پتھر کے روڑے لاکر سامنے رکھہ دیتے ھیں - اب اپنا اپنا ذوق سخن اور چاشنی زبان ھے ' جو جسے چاھے پسند کرلے - لاریب کہ سعدی کا میدان سخن ھی دوسرا ھے ' جہاں ھر لحظہ خاموشی اور سکون چھایا رھتا ھے - خسرو ھر وقت رزمگاہ میں رھتے ھیں ' ان کو جوش و خروش ' تعلیات و تصلعات سے کام لینا پڑتا ھے - ورنہ شاید اس بازی میں بھی یہ پیچھے نہ رہ جاتے اور نا کام نہ ھوتے - خسرو کو بظاھر تین دشواریوں سے پالا پڑا تھا اور زیر کرنا تھا - (ا) ان کی عدیم‌الفرصتی ' رات دن کے مشاغل - صبح سے شام تک ایک امیر و مقرب کی حیثیت

سے تھاری اور دربار شاھی میں موجودگی - پھر اپنے برگزیدہ شیخ کی خدمت و حضوری کا ولولہ و جذبہ ' جو ان کے دل و دماغ اور درویشانہ نہاد پر ھر وقت مستولی رھتا تھا - اسکے بعد وقت ھی کیا بچتا تھا جس کو اپنی ضروریات ' ذاتیات اور شاعری کی نذر کرتے - (۲) خسرو کی تصانیف کی بے شماری اور نیرنگی و بوقلمونی - (۳) سب پر طرہ یہ کہ خود ان کی خوشی یا طبیعت کی پسند کو مطلقاً دخل نہ تھا - انکی تصنیف و تالیف اور شاعری ونثاری کا محض اُمرا و ملوک کے گوشہ چشم کے اشارے پر دار مدار رھتا - ان حوصلہ شکن قیود اور سختیوں اور صبر آزما پابندیوں کے ساتھہ لطیف و نفیس کلام کا یہ انبار ' کیا شاعرانہ کرامت و اعجاز سے کم ھے ! - سعدی کے لئے یہ مجبوریاں کہاں تھیں - انھوں نے زیادہ تر اخلاق و نصائح پر لکھا ھے یا ھزلیات و مطائبات پر - عمر بھی زیادہ پائی تھی - تاھم خسرو کا عشر عشیر بھی نہ لکھہ سکے - خسرو نے پھر بھی اُن کی عظمت و عزت کو پہچانا اور مانا ھے - وعظ و نصیحت کی ھموار زمین پر جب اُترتے ھیں تو خسرو بھی سعدی کے نقش قدم طرز) پر چلنے اور سادگی و بیرنگی کے رنگ میں ڈوبے نظر آتے ھیں - حیات خسرو کا فاضل جامع اس روایت کا ذمہ‌دار ھے کہ خسرو نے گلستان سعدی کا بھی جواب لکھا تھا - حسب معمول فاتحہ قبول کی آرزو کے ساتھہ پیر محترم کی بارگاہ اقدس میں لے گئے - ارشاد ھوا کہ کل لانا - رات ھوئی تو امیر کو عالم خواب میں روحانیات و مکاشفات کے تمام پردے خود بخود اُٹھہ گئے - اور جو کچھہ دیکھا اُس کا اثر یہ تھا کہ صبح ھوتے ھی دریا پہونچے اور اپنی گلستاں کا ایک ایک ورق پانی میں بہا دیا[1]

ایں دفتر بے معنی غرق جمن آب اولیٰ -

---

۱ - حیات خسرو ' صفحہ ۹۳ -

" دوسری بات یعنی پہلی تنقیح کا جواب زیادہ پھیلاؤ چاہتا ہے - پھر بھی میں اس کے ہر پہلو کو کم سے کم لفظوں میں نمودار کرنے کی کوشش کروں گا - "

خسرو کی ہر قسم کی تصنیفات کی تعداد[۱] باختلاف روایات ایک سو بانوے تک پہونچتی ہے - ننیانوے[۲] ایک متوسط عدد ہے ' اسماے حسنیٰ کے مساوی - اسی پر اکثر تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے - ان کا غالب حصہ نظم ہے - نثر کمتر ' مگر ایسا نہیں کہ نہ ہو - حسب روایت امیر جملہ اصناف کلام کو ملاکر ان کے اشعار کا شمار چار اور پانچ لاکھ کے درمیان بتایا جاتا ہے[۳] - بعض پانچ لاکھ بہت سے بھی زیادہ لکھتے ہیں - ہندوستان کی زندہ و مردہ زبانوں میں کوئی بھی ایسی نہیں ' جس میں امیر نے کوئی مستقل تصنیف یا یادگار نہ چھوڑی ہو - عربی ' فارسی ' سنسکرت ' ہندی ' بھاشا ' پنجابی وغیرہ سب ہی آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہیں . دیوان اور مثنویاں ملاکر ان (۹۹) میں سے گیارہ چھپی ہوئی میری نظر سے گزر چکی ہیں ' اور چار غیر مطبوعہ - باقی کا علم دانندۂ حقیقی کو ہے -

خمسۂ نظامی کے جواب یا بہ تغیر لفظ مقابلہ میں ان کا پنج گنج بھی شہرت تام اور قبول عام حاصل کرچکا ہے - سخن فہم نا قدین کلام نے اس کی توصیف بے حد فرمائی ہے - حتیٰ کہ بعض اہل نظر نے اس کے مختلف اجزا کو نظم نظامی سے بہتر اور بر تر قرار دیا ہے - دولت شاہ

۱—فیروز شاہی مولفۂ ضیاء الدین برنی -
۲—ید بیضا ' صفحہ ۱۲۰ - مسٹر بلہ وکٹوری ' صفحات ۱۵۱ و ۱۵۳ نیز آتش کدہ آذر -
۳—ید بیضا قلمی ' صفحہ ۱۲۰ و حیات خسرو صفحہ ۹۰ -

سمرقندی راوی ہے کہ امیر زادہ سعید بایسنغر بہادر۱ (والی ہرات) خسرو کے خمسہ کو نظامی کے خمسہ پر ترجیح دیتا تھا - خاقان مغفور اُلغ بیگ (فرمانروائے سمرقند) ۲ کو اس سے اختلاف تھا - وہ نظم نظامی کی افضلیت کا قائل تھا اور اس حمایت و عصبیت پر دونوں سخن فہم شاہبھائیوں کے باہم پر لطف مناظرہ و مذاکرہ ہوجاتا تھا - خسرو کی نسبت خود دولت شاہ کے سے فاضل وسیع النظر کی رائے کا نچوڑ یہ ہے کہ "معانی خاص و نازکی ہاے خسرو و سخندان پُر شور عاشقانۂ او آتش در نہاد آدمی می زند......و در نازکی ہاے خمسۂ او اگر ذکر کنند ' نکتہا نیست کہ وصف نتوان کرد -

آج سے بیس بائیس برس پہلے ایک اولوالعزم اور سر گرم کار جماعت نے جس کے روح و روان نواب عمادالملک میر سید حسین بلگرامی۳ اور نواب حاجی محمد اسحاق خان۴ (خدا تعالیٰ اُن کو بخشے اور اِس کارنیک کی جزاے خیر دے) اور سکریٹری نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب‌الرحمان شروانی (طال بقاءہ) تھے ' کمر ہمت باندھی - سلطان‌العلوم خسرو دکن نے سرپرستی و دستگیری فرمائی - بیش قرار سرمائے اور شاندار اہتمام سے مطبوعہ و قلمی نسخے فراہم کیے گئے - مشہور و ماہر علماے فن اور کملاے وقت نے جن کی نظریں وسیع ' معلومات فراوان اور قلم تیز و رواں تھے ' تہذیب و تنقیح ' تحشیہ و تصحیح کی خدمات اپنے ذمے لیں اور حق یہ ہے کہ نقد و نَصر اور جرح و تعدیل

۱—مرزا بایسنغر } دونوں مرزا شاہرخ کے بیٹے اور امیر تیمور کے پوتے تھے - متعدد
۲—مرزا الغ بیگ } زبانوں میں لکھ پڑھ سکتے تھے اور شعر کہتے تھے ان کی علماء فضلا کی قدر دانی شہرۂ آفاق ہے - نویں صدی ھجری کے شروع (۸۰۲ھ - ۱۳۹۹ع) میں پیدا ہوئے اور پچاس برس کے اندر عمر پائی -

۳—وفات بماہ ذیقعد ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۲۶ع

۴—آخر اکتوبر ۱۹۱۸ع میں رحلت فرمائی -

کا حق پورا پورا ادا کیا - ۱۹۱۳ع سے ۱۹۲۷ع تک وہ بیش بہا مکلف نسخے شایع ہوئے ' جلکی صحت ' خوبی کتابت اور حسن طباعت پر دنیاے علم و عمل کو مدتوں ناز رهے گا - خسرو نے تو یہ مثنویان مختلف عهدوں میں مختلف بادشاهوں کے نام پر لکھی تهیں - لیکن میں اس کو اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان کی خوش نصیبی کہوں یا ان نفیس مطبوعات کی ' جو سب کی سب اسی تاجدار کے عهد علم پرور میں نظر افروز عالمیان هوئیں - اور هم ایسے بے سر و سامان ' بے بضاعت' خادمان علم و ادب بهی اس لازوال دولت سے بہرہ‌ور اور مالا مال هوگئے -

اوراق تاریخ شاهد هیں کہ امیر خسرو نے غیاث‌الدین بلبن کے عهد سے لے کر محمد شاہ تغلق تک گیارہ بادشاهوں کا زمانہ پایا تها - (۱) غیاث الدین بلبن - (۲) معزالدین کیقباد - (۳) کیومرث‌الملقب بہ شمس‌الدین ' چند روز - (۴) جلال الدین فیروز شاہ خلجی - (۵) رکن الدین ابراهیم شاہ ' چار ماہ - (۶) علاء الدین خلجی - (۷) شهاب الدین عمر ' تین مهینے - (۸) قطب الدین مبارک شاہ - (۹) ناصرالدین خسرو خان ' صرف دو مهینے - (۱۰) غیاث الدین تغلق شاہ - (۱۱) محمد تغلق - یعنی غلاموں کے خاندان کی با اقبال سلطنت کا آفتاب اُن کے سامنے غروب هوا - خلجیوں کا چراغ اِنہوں نے روشن هوکر گل هوجاتے دیکها - خود اپنی تحریرا کے مطابق سات بادشاهوں کی مصاحبت و ملازمت کی تهی - (۱) شاهزادہ۲ محمد سلطان پسر غیاث‌الدین بلبن - (۲) معز الدین کیقباد (۳) فیروز خلجی - (۴) علاء الدین خلجی -

---

۱—خزانۂ عامرہ صفحہ ۲۱۰ ' بحوالۂ نہ سپهر - ید بیضا ' صفحہ ۱۱۹ -

۲—ید بیضا ' صفحہ ۱۱۹ - پانچ سال خسرو اور امیر حسن اس کے همراہ ملتان میں رهے تهے -

(۵) قطب‌الدین مبارک ' خلجی - (۶) غیاث الدین تغلق - (۷) محمد تغلق (کچھ مہینے) ۱ اور سب کی کچھ نہ کچھ علمي و ادبی خدمت کی تھي - ان کی مشہور منظومات میں سے اکثر و بیشتر چیزیں کسی نہ کسي علم دوست فرمانروا کی خواهش یا تحریک سے لکھی گئی تھیں - یا مصنفین اور شعرا کے دستور کے مطابق ' جو ازل سے شاید اب تک یکساں عمل پذیر رہے گا ' خسرو نے اپنے کسي سر پرست و عزت افزا تاج دار کے نام منسوب و معنون فرمائی تھیں - وہ بے مایہ و تہی دست جو دو حرف لکھنے پر قادر نہیں ' اس کو تملق و خوشامد سے تعبیر کرتا ہے : مگر تجربہ‌کار هنرمند جانتا هے که کسي امیر کی قدر شناسی و همت افزائی کے بغیر اس عالم کا کوئی کام نہیں چل سکتا - امیر نے هر ایک کتاب کے دیباچے میں زمزمۂ توحید اور شہادت رسالت اور اپنے پاک مرشد کي منقبت سرائی کے بعد ایک پورا باب سلطان عصر کی مدحت گزاری و ثنا گستري میں وقف فرمایا هے - اسی کے ساتھ امیر کے ستایش طراز اور معتقد ثناخوان بڑے دعوے کے ساتھ کہتے هیں کہ انہوں نے ' پیر کی تعریف هو یا بادشاہ کی صفت ' کبھي جادۂ اعتدال و حدود راست گوئی سے قدم باهر نہیں رکھا - یہ رائے کسی حد تک صحیح و وقیع مانی جاسکتی هے - مگر ان کی تحریرات کے سرسری مطالعہ اور ادنے سی توجہ سے روشن هوجاتا هے کہ شاعرانہ جوش و خروش ورجز خوانی کے بعد ' ان کے ممدوح کی سیرت کے متعلق ' جو کچھ باقی رہ جاتا هے ' وہ بھی مبالغہ و اغراق سے خالی نہیں تو عجب نہیں - کون کہہ سکتا هے کہ کسی شخص کی نسبت جو کچھ

۱—ید بیضا ' صفحة ۱۱۸ -

لکھنے کے قابل تھا یا جس کا لکھنا واجب تھا سب ہی سپرد قلم کر دیا ھے - ملک گیری اور تخت و تاج کی آز و ھوس میں کتنے ھی مظالم اور جورو ستم اُن زبر دست انسانوں کے ھاتھہ سے سرزد نہیں ھوئے تھے ' مگر ان کے ذکر سے دار و گیر کا اندیشہ ' جان و مال کا خطرہ تھا ' اس لئے اعادہ سے یک قلم گریز کیا گیا ھے - لکھنے والوں کی مجبوریاں اور زمانہ کی جفاکشي اور ناحق کوشي ظاھر ھے - امیر ھوں یا ان کے معترض ' دونوں کے لئے حدود ادب مانع آتے ھیں اور مجھہ سے بے ادب بے نصیب کو بارگاہ خسروی سے محبت کا سلام اور لب بہ بند و چشم بند و گوش بند ' کا پیام مکرمت پہونچتا ھے - جہاں تک پچھلوں کا واسطہ تھا ' یا خود زندوں کے متعلق ' امیر نے ذرا بھی گنجایش پائی ھے تو اظہار امر واقع میں رو رعایت نہیں فرمائی - ایک دور اندیش ناصح کی طرح ' ھر مناسب اسلوب سے ' پند و موعظت سے کام لیا ھے - اُسوقت مواخذۂ مجرمانہ اور سزا و جزا کا فیصلہ ' اور کار روائي کا انحصار تنہا حکمراں کی رائے اور حکم پر تھا - آج آئین و قانون اور نظام عدالت کی عملداری و نمایش ھے تو اِسکے لئے بھی قانون و قاعدے سامنے آجاتے ھیں - والیان ملک و رؤسا کے خلاف کون زبان کھول سکتا یا قلم کو حرکت دے سکتا ھے -

امیر خسرو کے چاروں دیوان (۱) تحفۃالصغر ' (۲) وسطالحیات ' (۳) غرۃالکمال ' (۴) بقیۂ نقیہ ۱ اور اکثر مثنویاں مختلف بادشاھوں کی تعریف کے ترجیع بند اور قصائد سے مالا مال ھیں - تفصیل کی گنجایش نہیں - " عناصر خسرو " میں جو ان کے چاروں دیوانوں کا جوھر ھے '

۱ــید ایضا ' صفحہ ۱۲۰ -

ہر قسم کے اکیس قصیدے موجود ہیں[1] امیر نے چھ مہینے میں تین مثنویاں اور تین سال کے اندر پورا خمسہ علاوالدین خلجی کے عہد میں ختم کیا تھا - اس لئے یہ پانچوں مثنویاں سلطان مذکور کے نام سے معنون ہیں - ' مطلع الانوار ' نظامی کے ' مخزن اسرار ' کے جواب میں لکھا تھا - اخلاق و تصوف کے غوامض و نکات کو شریعت و طریقت و حقیقت کے راز و رموز کے ساتھ عمدہ دلکش پیرایہ میں سمجھایا ہے - یہ مثنوی سب سے پہلی ' یعنی ان کے ابتدائی شوق یا شوق ابتدا کی یادگار ہے - باایں حجم و ضخامت اور کمالات صوری و معنوی چودہ دن میں لکھ ڈالی تھی - مولانا ابوالحسن نے شرح لکھی - فرماتے ہیں -

خسرو دہلی ست بہ نزد حسن

خسرو اقلیم سخن بے سخن [2]

کیا ممدوح کی ستایش و تحسین کے سوا اس میں مادح کی معنوی قدر و وقعت کا بھی کوئی پہلو نکلتا ہے ؟

خضر خان سلطان مذکور کا بڑا بیٹا اور خسرو کا پیر بھائی تھا - اسکی تشق و محبت اور سوز و گداز کی سر گزشت جو خود اس کی خواهش و فرمایش سے نظم کی تھی [3] لاجواب ہے - واقعات جتنے دلچسپ و دلکش یا جہاں تہاں درد ناک و عبرت خیز تھے ' اس فسوں ساز نے اسی انداز اور معجزانہ طراز سے سجا کر سامنے رکھ دئے ہیں - ساڑھے سات سو برس پہلے کے ہندوستان اور اس ملک کی زبان

---

۱ — شاہزادہ بایسنغر پسر شاہرخ مرزا نے بھی جمع کرایا تھا مگر یہ ہمت ہار گیا - اور ناتمام چھوڑا - ید بیضا ' صفحہ ۱۲۰ -

۲ — حیات خسرو ' صفحہ ۱۳۸ -

۳ — صفحہ ۴۱ - دول رانی خضر خان -

اور یہاں کے کپڑوں کی اچھائیوں کے متعلق حصہ ا یقیناً اس قابل ھے
کہ یہاں کا ھر فرد جو فارسی کا مذاق اور تھوڑی سی استعداد رکھتا ھو
اس سے لطف اُٹھائے اور بہرہ اندوز ھو - تاریخی نقطۂ نظر سے
بھی یہ بڑی قدرو قیمت کی چیز ھے - ' قران السعدین ' ان کی سب سے
پہلی ' تاریخی ' اور نہایت مشہور مثنوی ھے - جس میں دو
باپ بیٹوں کی ملاقات ' یعنی ناصرالدین بغرا خان فرمانروائے
بنگالہ کی آمد اور اپنے بیٹے سلطان معزالدین کیقباد بادشاہ
دھلی سے ملنے کا حال درج ھے - یہ مثنوی کیقباد کی فرمایش
سے لکھی تھی اور اپنی خوبیوں اور صوری و معنوی لطافتوں اور نزاکتوں '
اور موقع و محل پر قسم قسم کے مواعظ و نصائح کے باعث بہت مقبول
اور پسند خاص و عام رھی ھے - جب تک فارسی زبان اور اس کی شیرینی
و دلربائی کا چرچا رھا ' اس کا بھی خوب دور دورہ تھا - نصاب درسیات
میں داخل تھی - بارھا چھپی - متعدد شرحیں لکھی گئیں - فارسی
کی اُونچی اُونچی کتابوں کے ساتھ مجھے بھی سبقاً سبقاً پڑھائی گئی
تھی - " مقالہ " میں خلفائے راشدین کے حالات و فتوحات اور صوفیائے
کرام کے اقوال و ارشادات مرقوم ھیں - اس کا مطالعہ ھم خرما وھم
ثواب کا لطف رکھتا ھے - ' مجنوں لیلی ' اور ' شیریں خسرو ' قابل
استناد تحریریں نہ سہی لیکن ان سے بھی بہت سے حالات اور حقائق
عصری کا پتہ چلتا ' اور عرب و عجم کے پرانے رسم و رواج اور غیرت و
حمیت کے جذبات کی جھلک دکھائی دیتی ھے - ' آئینۂ سکندری '
سکندر مقدونی کے متعلق اُس عہد تک کی معلومات اور تحقیقوں کا
اچھا خاصہ آئینہ ھے - فوجی و جنگی شان و شوکت ' مقابلوں کا طور

—دول رانی خضر خان - مقدمہ از مولانا رشیدسالم ' صفحات ۱۰۰ لغایت ۱۱۰ -

طریق اور رسوخ و عزیمت خوب نمایاں کی گئی ھے - ' هشت بهشت '
پند و اخلاق کی عمدہ کتاب ھے - چھوٹے چھوٹے افسانوں میں نہایت
کار آمد اور سبق آموز باتیں خسرو نے ایک دلچسپ طرز اور معمول
سے زیادہ سلیس و سادہ زبان میں نظم کردی ھیں - ' خزائن الفتوح
یا تاریخ علائی ' کا مرتبہ بہت بلند ھے - علاءالدین خلجی محمد شاہ
کے اوائل سلطنت ' معرکہ آرائیوں اور فتحوں کو کامل شاعرانہ انداز سے
صنائع و بدائع کے ساتھ ' مستند تاریخی رنگ میں جلوہ پیرا کر دیا
ھے - شیخ بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کی بڑی تعریف کی
ھے ' سر ھنری ایلیٹ بھی اس کی ستایش میں رطب اللسان ھیں اور
اس کو پر از معلومات اور بڑی عمدگی سے مرتب کیا ھوا بتاتے ھیں -
ان کا خیال اس کی نسبت یہ ھے کہ " اس تاریخ میں با قاعدہ تاریخ
وار واقعات تو تحریر نہیں ھیں - بلکہ خاص خاص زمانوں میں ملک
کے جس کسی حصہ میں کچھہ واقعات گزرے ھیں ' اُن کو بلا امتیاز
و تفریق درج کردیا ھے - تاھم امیر خسرو نے جو کچھہ لکھا ھے وہ بوجوہ
وقیع و مستند مانا جاتا ھے - اول تو یہ کل واقعات اُن کے زمانے کے ھیں -
دوسرے ' ان میں سے اکثر میں وہ بذات خاص شریک تھے - تیسرے '
ضیاءالدین برنی کسا مورخ اپنی تاریخ کے بیانات کی تصدیق کے لئے
اکثر اسی کتاب کو پیش کرتا ھے - سولہ برس ھوئے کہ نواب محمد
اسحاق خان نے دنیا سے کنارہ کشی کی اور بقیہ کلیات خسرو
کی اشاعت و نشر کا کام نا تمام چھوڑا - اب یہ تاریخ (علائی)
جس کی تر تیب و تصحیح و تبیض با حسن وجوہ انجام
پا چکی تھی ' اس کا مسودہ الماری میں بند پڑا اور اپنے مقدر کے فیصلہ کا

منظر ھے - 'نہ سپہر' قطب الدین مبارک شاہ [۱] کے نام پر معنون ھے - اسی بادشاہ کے عہد کے واقعات اور حالات اس میں نظم کئے ھیں - اس کے مختلف حصوں اور واقعوں کو مختلف بحروں میں نظم کی خلعت پہنائی گئی ھے - [۲]

'رسائل اعجاز' یا اعجاز خسروی [۳] عربی آمیز دشوار فہم فارسی نثر میں ' فن انشا کے متعلق پانچ رسالوں کا مجموعہ ھے - وہ جوان عمر ' جوان خیال ذھین خسرو کے عہد جوانی کی یادگار نہیں ' بلکہ ستر برس کی عمر اور مرنے سے دو سال پہلے (۷۲۳ ھ) کی تکمیل ھے [۴] نثر کی یہی اکیلی کتاب ان کی منظومات کے ایک بڑے حصے پر ھر حیثیت سے بھاری نظر آتی ھے - مدت ھوئی لمبی چوڑی تقطیع کے ۱۱۸۹ صفحات پر چھاپی گئی تھی - متن کے ساتھہ ساتھہ حواشی' شرح' حل لغات اور ترجمۂ اشعار و اقوال عربی نے بہت سی جگہہ لے لی ھے - باوصف خوبی طباعت اور جلی قلم کے ' حاشیوں پر اُلٹی سیدھی اور بین السطور لکھائی ' اصل و نقل کی گنجلکوں اور پیچیدگیوں میں آنکھ اُلجھتی' طبیعت بھاگتی ھے - دل گھبرانے لگتا ھے - اس میں ھر قسم کے بدائع وصنائع ' معانی و نکات ' حقائق و دقائق اور لطائف و ظرائف ' نیز صنائع جگت کو بڑے اھتمام و نمود سے یکجا کیا ھے - ایجادات و اختراعات گونا گوں کا بھی التزام فرمایا گیا ھے ' تقریظ لکھنے والوں کا فتوی ھے کہ یہ بے مثل کتاب خسرو کا شاہ کار اور

۱- خزانۂ عامرہ ' صفحہ ۲۰۹ -

۲- مسٹر بیل کی بیاگرفی کل ڈکشنری میں ان سب کتابوں کے نام ' انگریزی میں مسخ شدہ صورت میں ملتے ھیں -

۳- مطبوعۂ منشی نول کشور ' ۱۸۷۶ ع -

۴- رسالہ رابعہ اعجاز خسروی صفحہ ' ۱۰۳ -

مقبول روزگار ہے - نہ ایسے مصنف پیدا ہوئے ہیں نہ پیدا ہوں گے - نہ ایسی کتابیں انسانوں کی دنیا میں اُتریں گی - شاید یہ فیصلہ کبھی درست رہا ہو - ایک وقت رہا ہوگا جب اس قسم کا مذاق سخن عام تھا - قدیم درسیات کے سلسلہ میں ہر طالب کمال کو اپنا ، یا دوسروں کا شوق پورا کرنے کے لئے ایسی کتابوں کے مطالعہ و درس اور ان سے استفادہ و استفاضہ کا مشورہ دیا جاتا تھا - اس کے عربی شعروں ، مثلوں ، کہاوتوں ، محاوروں اور استعاروں کی ، جو پریشاں کن کثرت و افراط کی حد سے بھی زائد ہوگئے ہیں ، مضامین کی خوبی ، محاسن کا تنوع ، تشریح و توضیح اور لطف بیان کی خاص کر بڑی تعریف کی جاتی اور توجہ دلائی جاتی تھی - لیکن آج دہ السنۂ مغربی و مشرقی کی وسعت نظر اور کثرت فنون اور لٹریچر کی نزاکت و بہار سے ، نہ کتابوں کے شائق کو اتنی فرصت ہے اور نہ ان طلسم آرائیوں کی کوئی قدر ، تو کون ان گورکھدھندوں میں پھنسے اور اپنے اوقات عزیز کو رائیگاں کرے گا - ازماسلام گویند پیران پارسارا - اس کا پانچواں حصہ " السوابق من المنشاۃ " سے موسوم اور چند سطر کے دیباچے اور چھ خطوں پر مشتمل ہے - چھٹے خط کا عنوان " طیبت وہزل " ہے جس کی ضخامت ستر صفحے ہیں - اس میں تملق ، مطائبہ و خوش طبعی ، نزاکت و لطافت خیال تو نام کو نہیں ، نہ خوش مزاجی ہے نہ حاضر جوابی - ہزل یا عریانی بھی اپنے معنی میں صحیح طور پر آنے نہیں پائی - البتہ از سر تا پا فحش و مغلظات بھرے پڑے ہیں - جن کی طرف کوئی شریف طینت ، گرامی منش انسان رخ بھی نہ کرے گا -

میر آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں امیر خسرو کی نسبت لکھا ہے - ۱ " ہنگامہ آرائے سخن طرازی شیخ سعدی شیرازی کہ مروج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی ہم دارد...... امانا سیخ نقوش مانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی وقوع گوئی گردید و اساس آن را بلند ساخت...... " خدا معلوم کہ آزاد کا اشارہ کس وقوع گوئی کی طرف ' اور کیا تھا - البتہ جو دو چار شعر خود اپنے یا کسی اور کے مثالاً نقل کئے ہیں ان کو دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آزاد کی مراد اس سے وہی تھی جو اُن کے ہم خیال متقدمین و متاخرین نے لی ہے - یعنی جیسا کہ پروفیسر علی احمد خان نے شیریں و خسرو کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے - ۲ " عشق و محبت اور وصل و فراق کی دنیا میں جو واقعات و معاملات واقع ہوتے ہیں اُن کی واقعیت ظاہر کرنے کو واقعہ نویسی یا معاملہ نویسی کہتے ہیں اور کسی خاص طرز ادا سے اس کا بیان کرنا واقعہ نویسی کا کمال ہے .....امیر خسرو اس کے موجد اور پورا کرنے والے ہیں.....شاید بقول امیر علاءالدولہ قزوینی اس رنگ کا عشق انگیز اور زلف و خال آمیز ہونا ہی ضروری ہے - " ۳

کہنا یہ ہے کہ واقعہ پھر واقعہ ہے - ہوسکتا ہے کہ بزم و خلوت میں بھی کبھی ہو جاتا ہو - لیکن وہ بیشتر رزم کا میدان ' اور اپنا بر سر عام ہونا پسند کرتا ہے - عشوہ و کرشمہ اور ناز و نیاز سے تنہا وابستگی نہیں رکھتا - وہ تیر و تفنگ اور معرکہ و نبرد کا عاشق ہے اور زمزمۂ چنگ سے زیادہ صف جنگ کا شائق - وہ راز جو ' اسرار گو متشاعر جو دوسروں کو عشق مجازی اور عشق حقیقی کے پھندوں میں پھسانا چاہتا ہے '

۱—صفحہ ۲۵ -
۲—صفحہ ۵ -
۳—نیز خزانۂ عامرہ صفحہ ۲۰۹ -

مجاز کو حقیقت کا پہلا زینہ بتاتا ھے ' اپنی دلخواہ تعبیر و تعریف کے لئے نئے نئے حیلے تراشتا ھے - لیکن گستاخ و بسیار گو مورخ جو ایسی شعر گوئی کو کفر سمجھتا اور ان مجاز و حقیقت کی نیرنگیوں کو نگاہ حقیقت سے دیکھنا چاھتا ھے' ملکر ھے - وہ سیاہ کو سفید سے متمائز کرتا ھے اور کسی آلودۂ فسق کو آسودگان عشق کی صف میں جگہہ نہیں دیتا - خوب جانتا ھے کہ یہ لفظ تو قرآن حکیم میں بھی آیا ھے - ائمہ‌لسان و لغت نے بھی اس کو اور اس کے مختلف معانی کو شرح و بسط سے بیان کیا ھے - بھر کیف ' راقم سطور تو خسرو کا کمال زیادہ تر اسی حقیقی و تحقیقی واقعہ نگاری کی فراخ و ھموار زمین پر دیکھتا آیا ھے - شاعروں کی متخیلہ اور بکاری ھوئی صورت سے اُسے دور سے دور پایا ھے - واقعات دو قسم کے ھوتے یا ھوسکتے ھیں - ایک چشمدید جو لکھنے والے کے سامنے گزریں - دوسرے ' وہ جو سامنے تو نہیں گزرے لیکن سنے ھیں اور قلمبند کرنا پڑتے ھیں - اول‌الذکر کے بیان میں یہ خوبی ملحوظ رھنا چاھئے کہ سامع کے روبرو اصلی نقشہ ھوبہو کھنچ جائے اور جو اثر دیکھنے والے کے دل پر ھوا ھو وھی سننے والے پر پڑے - دوسری قسم کے ذکر میں ناقل کا کام ایسے واقعات کا انتخاب ھوسکتا ھے اور پھر خود اُس کا پرداز کلام ' جس کو سنکر سامع ' اور پڑھکر قاری ایمان لے آئے کہ ضرور ایسا ھی ہوا‌ھوگا - شاعر کو اس تصویر کشی میں وہ تمام خط و خال نمایاں کرنے پڑتے ھیں جو خود تو اُس نے نہیں دیکھے مگر دوسروں کو دکھا دینا اُس کے کمال کا زیور ھے -

میرا خیال ھے کہ امیر اسی قسم کی واقعہ نگاری اور حقائق نویسی کے دلدادہ و گرویدہ تھے - انھوں نے اسی کو ترقی دے کر

اوج کمال پر پہنچا دیا تھا - ان کی عقیدت کیشی اور محبت ' جو اپنے با برکت مرشد کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی تھی ' ان کو دنیا کی ابلہ فریبیوں اور عاشق مزاجیوں یا اُس زمانہ کی مودت نوازیوں کے لئے کب مہلت دیتی ہوگی - میں نے جن کتابوں کا اوپر ذکر کیا ہے وہ میری راستی خیال اور صدق مقال کی شاہد ہیں - مورخانہ مثنویاں ہوں یا رزمیہ نظمیں ' اس شناور بحر سخن کے سامنے سب سطح آب پر بہتی نظر آتی ہیں - بے شبہہ مغازلہ و معاملہ کے میدان میں بھی خسرو کامیاب ہوئے اور دوسروں سے فائق رہے ہیں ' مگر یہ چیز (منظوم تاریخ نگاری) تنہا انہیں کا حصہ تھی ' اور پھر استدر افراط و کثرت کے ساتھہ کہ جس کا پایان بھی نہیں ملتا - پرانے جنگی قصص' مذہبی غزوات اور مجاہدات کو تو بعض اور لوگوں نے بھی نظم کا لباس پہنایا ہے مگر واقعات عصری اور حادثات تاریخی کو موزوں کرنے میں تمام معروف یا مجہول‌الاحوال شعرا میں یہی پیش پیش رہے ہیں -

" تغلق نامہ " امیر خسرو کی آخری مثنوی بلکہ یقیناً آخری کتاب ہے [۱] - جسکے بعد اُن کو کچھہ لکھنے کی نوبت ھی نہیں پہونچی تھی - مورخین اور تذکرہ نویس اس بارہ میں متفق ہیں اور متفرق تحریروں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق شاہ اول ' صوبہ دار بنگالہ کے خلاف بعض شکایات اور عرضیوں کی تحقیقات کے لئے خود لکھنوتی (دارالصدر) کو ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ع) میں گیا اور امیر خسرو کو همرکاب لے گیا تھا[۲] - بادشاہ تو اگلے برس واپس چلا آیا ' مگر خسرو کو کسی ضرورت سے وهیں چھوڑ دیا تھا - پورا سال

---

۱ --- منتخب‌التواریخ قلمی - و یاد داشت نواب ضیاء الدین احمد خاں بنام سرهنری ایلیٹ سنہ ۱۸۳۸ع و حیات خسرو ' صفحہ ۱۱۹ -

۲ --- حیات خسرو ' صفحہ ۵۵ -

گزر چکا تھا اور واپسی کی صورت نظر نہیں آتی تھی - لکھنوتی کا قیام ' حسرت و پریشانی ' دھلی کی مفارقت و جدائی سوھان روح تھی - ادھر غیاث الدین بھی کارزار حیات سے نجات پاچکا تھا ۱ - یہ وھی باجبروت تھا جو تمام تحریری اور زبانی روایات کے مطابق خسرو کے ملکوتی صفات رھنما حضرت سلطان اولیا کے حسن اعتقاد سے محروم تھا - امیر نے یکا یک اپنے شیخ معظم کی رحلت کی خبر پائی - اس حادثۂ جان کاہ سے ان پر جو کچھہ گزری اُس کو لکھتے ھوئے لکھنے والوں کا دل دھلتا ھے - وہ آنکھیں جو نعال رحمت کے غبار کو اپنے اندر جگہ دینے کو ترس رھی تھیں ' روتے روتے پتھرا گئیں - وہ پیشانی جو اس متبرک آستانے پر جھکنے اور سجدۂ و سجود کے لئے وقف اور سرتاپا تمنا تھی ' سنگ و حشت سے لہو بھر کر زخمی ھو رھی تھی - کسی نہ کسی طرح یہ دھلی پہونچے بے اختیار ھوکر سر منڈوا ڈالا - چہرہ پر سیاھی پھیر لی ۲ - اور اس ھیئت گدائی سے آستان جنت نشاں پر حاضر ھوئے - پہلے تو کھڑے کھڑے روتے رھے - پھر مزار مبارک پر اپنا سر دے مارا ۳ - ھوش میں آئے تو زندگی بھر کا اندوختہ ' عمر بھر کی کمائی ' نقد و جنس سب مساکین و فقرا کو بانٹ دی۴ - مال و متاع فانی سے سبکدوش و فارغ ھوکر تمام دنیوی کاموں سے دستکشی کرلی - موتا سیاہ ماتمی لباس اختیار کرلیا تھا اور مزار پر انوار کی مجاورت و حاضر باشی۵ - یہ تھے اور ان کا جوش و خروش ' اور وہ مستانہ شوریدگی جو آگاہ دلوں کے بقول عشق صادق کا

۱— حیات خسرو ' صفحہ ۵۹ -
۲— " " صفحہ ۵۹ -
۳— " " صفحہ ۶۰ -
۴— " " صفحہ ۶۰ -
۵— " " صفحہ ۶۰ -

لوازمہ اور چشتی نسبتوں کا خاصّہ ہے - چھہ مہینے بعد اسی حال اور انتہائے حزن و ملال میں ۱۸ شوال ۷۲۵ھ (ستمبر ۱۳۲۵ع) کو اس درد و غم بھری دنیا سے رخصت ہوگئے! - اپنے محبوب رہبر کے مرقد مطہر کے پائیں، جو ان کے سوز سینہ کا جیتے جی واسطہ دیتے رہے تھے، ہمیشہ کے لئے خاموش اور آسودۂ خاک ہیں۲ -

تغلق نامہ کے تحریر کرنے کا صحیح زمانہ متعین نہیں ہوسکتا کیونکہ مجوزہ یا موجودہ نسخے کے آخری اجزا، جہاں اپنی تصانیفات میں معمولاً خسرو سال تحریر اور تعداد اشعار و سلسلۂ تصانیف درج فرما دیتے تھے، کم از کم چار صدیاں ہوچکیں کہ اس جہان گزران سے گزر چکے ہیں - یہ بھی ظاہر ہے کہ امیر نے یہ مثنوی اپنے آقا و مربیّ سلطان غیاث الدین مذکور کے عہد میں لکھی تھی اور اُسی کے نام سے منسوب کی ہوگی۳ - بقول مسٹر بیل اور مولوی سعید احمد، ان کو اس بادشاہ کے خزانہ سے ایک ہزار تنکہ ۴ ماہوار ملتا تھا - یہ سب صحیح اور مجملاً یہ معلومات قابل استناد ہے؛ نیز یہ کہ اس میں واقعات ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ع) تک کے ہیں - رہا سال تصنیف جو ۷۲۵ یا کچھہ دن قبل بتایا جاتا ہے، قیاس چاہتا ہے کہ یہ بھی صحیح اور درست ہو -

---

۱—حیات خسرو، صفحہ ۶۰ - مسٹر بیل ڈکشنری، صفحہ ۱۵۱ -

۲ ,, ,, ، صفحہ ۶۰ ید بیضا، صفحہ ۱۲۰ -

۳—مسٹر بیل ڈکشنری، صفحہ ۱۵۱ -

۴—اُس وقت کا تنکہ ایک تولہ سونے یا چاندی کا سکہ تھا - نقرئی تنکہ کے تانبے کے پچاس پیسے ہوتے تھے - یہ پیسہ جیتل ہی کہلاتا تھا اور اس کا وزن ایک تولہ یا پونے دو تولہ ہوتا تھا - مولف حیات خسرو کی روایت ہے کہ امیر کو جلال الدین فیروز شاہ بارہ سو تنکہ تنخواہ دیتا تھا - جیتل کا نام اس عہد کے بعد نہیں ملتا ہے - ان کے قریب ہی کے زمانہ میں متروک ہوگیا تھا اور سکوں کے نئے نئے نام، اشرفی، اختر زر وغیرہ رائج ہوگئے تھے - مثنویات خسرو میں جیتل اکثر چاندی کے معنے میں آیا ہے -

خدا بخشے نواب محمد اسحاق خاں کو جن کی دلچسپی اور ادبی شغف کے طفیل (بیس برس ہوئے جب) سلسلہ خسرویات کی تہذیب و طباعت و اشاعت کا معاملہ در پیش ہوا اور کئی مثنویاں بڑے اہتمام اور بڑی آب و تاب کے ساتھ چھپ کر نکلیں ' تو تغلق نامہ کی تلاش بھی دامنگیر ہوئی - مگر باوجود کوشش بلیغ نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے کسی معروف و با قواعد کتب خانہ میں اس کا سراغ تک نہ چلا - یہ بھی عجب اتفاق و بخت تھا کہ فارسی کی ایک پرانی قلمی مثنوی کا نسخہ نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب‌الرحمان خان شروانی کے ذخیرہ نوادر میں موجود تھا - جس کے سر ورق پر غلطی سے یا صحیح طور پر "جہانگیر نامہ عطائے حیاتی کاشی" نام لکھا تھا ' جس نے اپنے متعلق خود اپنے فاضل و وسیع‌النظر مالک کو بھی شبہ میں ڈال رکھا تھا - دنیائے علم و ادب کو جنت مکین مولوی رشید احمد انصاری متخلص بہ سالم پروفیسر علی گڈہ کا مرہون احسان ہونا چاہئے ' جنکی سعی و کرم کی بدولت یہ منزل کسی نہ کسی طرح ختم ہوگئی اور جن کے تفحص و تجسس سے یہی نسخہ " تغلق نامہ خسرو " قرار پاگیا - مرحوم نے خود محنت و تحقیق کرکے پہلے اس کی ایک صحیح نقل تیار کی - پھر اس پر مقدمہ لکھا ' جو افسوس ہے کہ موصوف کی مرگ بے ہنگام سے نا تمام رہا - اِدھر نواب اسحاق خان کے انتقال سے بقیہ کلیات خسرو ' اُدھر مولوی صاحب کی رحلت سے اِن کے مفروضہ یا مسلمہ "تغلق نامہ" کی طباعت و اشاعت کا سارا کام در ہم و برہم ہوگیا - لیکن جزائے نیک ملے مولوی سید ہاشمی فریدآبادی کو ' جنکی سعی و التفات سے اِس نایاب مثنوی کے چھپنے کی نوبت پہونچ گئی - خواہ وہ تغلق نامہ ہو خواہ جہانگیر نامہ - سید صاحب نے اس کی

تلاش و جستجو میں یورپ کے کتب خانے بھی چھان ڈالے مگر تغلق نامہ کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوا - موصوف کی اس عنایت و مہربانی اور اُن کی کاوش و جانفشانی اور کتاب کی صحت و نظر ثانی کے ادائے شکر در شکر کے بعد حیدرآباد دکن کی مجلس مخطوطات فارسی ہماری دلی منت پذیری اور سچی سپاسگزاری کی مستحق ہے ' جس نے اپنے سرمایہ و اهتمام سے اس کو چھپوایا اور جیسی نادرالوجود اور پرانی کتاب تھی اُس کے لئے ویسا ہی پرانا اور پرانے قسم کا بدنما ٹائپ بھی تجویز و انتخاب کیا - جس کا پڑھنا باوجود روشن اور جلی ہونے کے لطافت پسند آنکھوں پر گراں گذرتا رہے - بہر کیف مقام مسرت ہے اور موجب نازش کہ آج ہمارے مطالعہ و آگاهی کے لئے آٹھویں صدی هجری کے ربع اول کا وہ تاریخی مواد فراہم ہوگیا ہے - جس کی حرف بحرف اطلاع ہی سے خود معاصرین یا قریب وقت کے مورخ مثلاً مراکش کا مشہور سیاح ابن بطوطہ مغربی صاحب عجائب‌الاسفار اور ضیاء الدین برنی مولف تاریخ فیروز شاہی بھی قاصر رہے تھے آپ اگر مطمئن ہوں تو اس کو خسرو دہلوی کا تغلق نامۂ مانیں اور غیاث‌الدین تغلق اول کے نام معنون ؛ ورنہ حیاتی کاشی کی مثنوی اور نورالدین جہانگیر کے نام سے منسوب ' جہانگیر نامہ ہونے میں تو کسی کو تامل ہو ہی نہیں سکتا - واقعات وہی ہیں ' اوقات وہی - صرف زمانۂ نظم اور حضرت ناظم کا مسئلہ زیر نزاع ہے - اور یہ بحث و تمحیص اُس حد سے تجاوز کرجاتی ہے جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے "کیسی ہی خوب بات ہو حسن کو اختلاف ہے" - بحث طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ کتاب جو ہمارے پیش نظر ہے اصلی تغلق نامہ ہے یا جہانگیر نامہ یا اِن دونوں میں سے کوئی نہیں ' اس کے لئے دوسرے مضمون کی ضرورت ہے جو انشاءاللہ آئندہ حاضر کیا جائیگا -
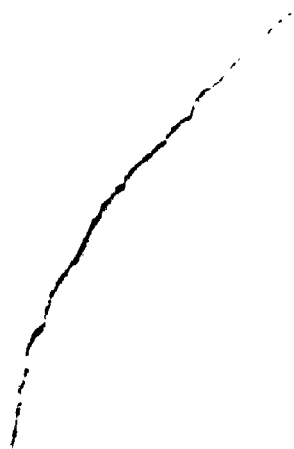
" دنیا کی موجودہ کسا و بازاری کے اسباب "

(از پروفیسر محمد حبیب الرحمان ایم - اے - (علیگ)

(۱)

اب سے کم و بیش ایک صدی قبل بنی نوع انسان کی مادّی خوشحالی میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ تصور کی جاتی تھی ' وہ اضافۂ آبادی کا رجحان تھا - خاص کر مالتھس نے جس شکل میں نظریۂ آبادی کو پیش کیا ' وہ بلاشبہ حوصلہ مند افراد کے لئے بہت ہی مایوس کُن تھی - خیال یہ تھا کہ انسان جدو جہد کر کے جس قدر زیادہ دولت پیدا کرتے ہیں اُسی قدر بلکہ اُس سے زیادہ سرعت کے ساتھ اُن کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے - اور اِس وجہ سے اُن کی معاشی حالت میں کوئی مستقل ترقی اور اُن کے معیار زندگی میں کوئی دیر پا بلندی حاصل نہیں ہو سکتی - ظاہر ہے کہ جب ہماری ترقی ہی میں ہماری پستی کے اسباب مضمر ہوں تو بڑے سے بڑے سورماؤں کا بھی ہمت ہار جانا حق بجانب ہے - لیکن خوش قسمتی سے یہ مالتھس کا ایجاد کردہ بھوت اصلیت سے بہت دور اور محض ایک وہمی تخیل ثابت ہوا - اب ہم یہ جانتے ہیں کہ گو آبادی میں اضافہ ہوتا ہے تاہم یہ ضروری نہیں کہ وہ اُسی رفتار سے ہو جو مالتھس نے فرض کی تھی - یہی نہیں بلکہ موجودہ زمانے میں ایسے ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جہاں آبادی ایک خاص حد تک پہونچ کر رک گئی ہے اور کوئی عجب نہیں کہ آئندہ اس میں اضافہ کے بجائے تخفیف ہونے لگے - اس کے علاوہ گذشتہ سو ڈیڑہ سو سال کے اندر انسان کو قدرتی وسائل پر جو غیر معمولی تصرف حاصل ہوا ہے اور پیدایش دولت کے نئے طریقے ایجاد کرنے میں اُس نے جو

غیر معمولی ترقی کی ھے اس کا لحاظ کرتے ھوئے کوئی وجہ نہیں کہ
ہم اپنے مستقبل سے اِس قدر مایوس ھوں - چنانچہ اُن امور کا خیال
کرکے بعض ذي فہم لوگوں نے مالتھس کے بھوت سے خوف زدہ ھونے کے
بجائے اُسے شیشے میں اُتار نے کی کوشش کی اور حسن اتفاق سے اِس
غرض کے لئے ایک مؤثر عمل بھی اُن کے ھاتھہ لگ گیا - فرانسیسی
زبان کے دو لفظ یعنی Laissez Faire (آزادہ روی) اِس بھوت کو شیشے
میں بند رکھنے کے لئے کم از کم حال تک بہت کار گر ثابت ھوتے رھے -
عملی نقطۂ نظر سے اِس تدبیر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر ملک کی حکومت
اپنے باشندوں کی کاروباری زندگی سے جہاں تک ممکن ھو علیحدہ رھے -
جان و مال کی حفاظت کے لئے ضروری قوانین نافذ کرنے اور کارو بار
کی سہولت کے لئے بعض عام تد بیریں اختیار کرنے کے علاوہ حکومت
ملک کے مختلف طبقوں کی معاشی جدو جہد میں قطعاً دخیل نہ
ھو بلکہ باشندوں کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دے اور ہر شخص کو اِس
بات کی کامل آزادی دے رکھے کہ وہ اپنے ذاتي نفع کے لئے جو کام جس
طور پر کرنا چاھے کرے - خیال یہ تھا کہ صرف اِسی طرز عمل کی
بدولت ملک کے عام مفاد میں زیادہ سے زیادہ ترقی ھو سکتی ھے اور
باشندگان ملک کی مادي خوشحالی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ حاصل
کیا جاسکتا ھے - بظاھر تو یہ نظر آتا ھے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی
نفع کے پیچھے پڑا ھوا ھے ' لیکن بحیثیت مجموعی ملک کے عام مفاد
کو بڑھانے کا بھی در اصل یہي کار گر طریقہ ھے - بالفاظ دیگر کوئی
شخص کسب معاش کا کوئی ایسا راستہ اختیار نہیں کرسکتا جس کی
بدولت دوسرے اشخاص کو کچھہ نہ کچھہ بالواسطہ فائدہ نہ پہونچے -
گویا اِس طور پر محنت و مشقت کا سب سے بڑا محرک یعنی ذاتی
نفع کی خواھش ' مفاد عامہ کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتی

ھے - ایسے نظام معیشت کے تحت یہ ضرورت ھی باقی نہیں رھتی کہ کسی ایک مرکز سے تمام افراد کی جدوجہد پر نگاہ رکھی جائے اور حتی‌الوسع اُسے قابو میں رکھا جائے - جب ھر فرد اپنے محدود دائرۂ عمل کے اندر ذاتی نفع کی راہ پر چل کر غیر محسوس مگر قطعی طور پر مفاد عامہ کو آگے بڑھاتا ھے تو پھر کیا ضرورت ھے کہ کوئی با اقتدار ادارہ ایک مرکز سے تمام ملک کی پیدایش و تقسیم دولت کا انتظام کرے ' خاص کر ایسی حالت میں جب کہ ایسے اجتماعی انتظام سے یہ اندیشہ لگا ھوا ھو کہ اس کی بدولت انفرادی جدو جہد کا عالمگیر اصول اور زبردست محرک کمزور ھوجائیگا -

اُنیسویں صدی کے اکثر و بیشتر حصہ میں انفرادیت کے اس طریقے نے بلا شبہ بڑی شاندار کامیابیاں حاصل کیں - سائنس کی حیرتناک ترقی ' نئی نئی ایجادوں کا لامتناھی سلسلہ ' قدرت پر انسان کا روز افزوں تصرّف ' مادی تہذیب کی وہ عظیم‌الشان عمارت جس کے اندر کروڑوں انسان راحت و آرام کے ایسے ذرائع سے بہرہ ور ھیں جو زمانۂ سابقہ میں اُمراء اور بادشاھوں کو نصیب نہیں تھے ' یہ تمام ترقیاں انسان کو اسی خود بخود چلنے والے ' آزاد ' انفرادی ' غیر مرکزی اور بے ترتیب نظام معیشت کے تحت حاصل ھوئیں -

لیکن جبتک اِس طریقے کی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رھا اور اس کی ناقابل انکار کامیابیاں نظروں کے سامنے آتی رھیں اُسوقت تک کسی کی یہ ھمت نہ پڑسکتی تھی کہ اُسکے تفوّق پر کسی قسم کا کوئی اعتراض یا اسکی صحت اور خوبی کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی چوں و چرا کرسکے - نتیجہ یہ ھوا کہ اُسکے بنیادی نقائص ایک مدت تک نظروں سے پوشیدہ رھے اور کسی کو یہ دریافت کرنے کی ضرورت ھی

محسوس نہ ہوئی کہ آیا اِس طریق معیشت کی یہ صفت کہ وہ بغیر کسي مرکزی ترتیب اور نگرانی کے خود بخود ٹھیک اور مناسب طور پر چلتا رہتا ہے ' اُسکي ذات کے ساتھہ وابستہ ہے یا یہ کہ وہ محض چند اتفاقي ' غیر مستقل اور عارضي حالات کا نتیجہ ہے -

واضح رہے کہ طریق انفرادیت کے عین عروج کے زمانے میں بھي دور رس نگاہیں اُسکے بنیادی مفروضات کي بے حقیقتي اور اسکي کامیابي کے شرائط کے عارضي وجود کو پہچان چکي تھیں ' لیکن اسکي کامیابیاں بہ مقابل اسکے نقائص کے اسقدر کثیر اور ایسي بدیہی تھیں کہ عام نگاہیں نہ خود اِن نقائص کو دیکھہ سکتی نہیں اور نہ دوسرے دیکھنے والوں کے اقوال پر کان دھرنے کیلئے تیار تھیں - ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائي زمانے سے ہي حالات کي بتدریج تبدیلي کے ساتھہ ساتھہ ذاتی منافعہ اور مفاد عامہ کی یکسانیت کا مفروضہ جو کہ اس آزاد طریق معیشت کا سنگ بنیاد ہے ' وقتاً فوقتاً مشتبہ نظر آنے لگا تھا - لیکن جب کبھی کسی آزاد خیال اور منچلے شخص نے اس مقبول عام مسلک کی اضافیت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوششیں کی ' اُسے یہ کہکر خاموش کردیا گیا کہ یہ محض چند مستثنیات ہیں جو اصلی نظریے کو کمزور کرنے کے بجائے اسکي صحت و صداقت کا مزید ثبوت ہیں - توضیح کیلئے ہم دو تین مثالوں پر غور کریں گے - جب صنعتی انقلاب کی بدولت پیدایش دولت کے جدید طریقوں کا آغاز ہوا اور چھوٹے چھوٹے کاریگر اپنا اپنا کاروبار بند کرکے بڑے بڑے کار خانوں میں بحیثیت مزدوروں کے اُجرتوں پر کام کرنے لگے تو طریق انفرادیت کے مطابق افراد کو ان کی کاروباری زندگی میں آزاد چھوڑ دینے اور ذاتی نفع کی رہنمائی میں اپنا ذریعۂ معاش منتخب کرنے کي اجازت

دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کے کارخانوں میں کمسن بچوں اور
ان کے محتاج ماں باپ پر وہ اُفتاد پڑی کہ حکومت کو بہت جلد
مزدوروں اور اجیروں کے باہمی تعلقات میں قوانین کارخانہ جات کے
ذریعہ سے روز افزوں دخل دینے کی ضرورت محسوس ہوئی - اسکے علاوہ
جب مزدوروں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اُن کا افلاس اور انتشار اُن
کو اپنی محنت کے ثمرات سے کما حقہ ' مستفید نہیں ہونے دیتا بلکہ
اُن کی پیدا کی ہوئی دولت کا اکثر و بیشتر حصہ روز افزوں منافعہ کی
شکل میں فریق ثانی کے قبضے میں چلا جاتا ہے تو انھوں نے اپنی
کمزوریوں کے اسباب کو دور کرنے کی کوششیں کیں اور مزدور سبھائیں قائم
کر کے اِس مقصد میں ایسی عظیم‌الشان کامیابی حاصل کی کہ اب نہ
آزاد مسابقت ہی قائم رہی اور نہ افراد کیلئے ' ذاتی منافعہ کی رہنمائی
میں اپنے اپنے حسب منشاء کام کرنے کا امکان باقی رہا - یہی نہیں
بلکہ زمانے کی ترقی اور پرانے حالات کی تبدیلی کے ساتھہ ساتھہ
حکومت اپنی رعایا کی کاروباری زندگی میں براہ راست اور روز افزوں
دخل دینے پر مجبور ہوتی گئی اور برابر ہوتی جارہی ہے - چنانچہ تمام
ترقی یافتہ ممالک میں مفت تعلیم ' مفلسوں کی پرورش ' اور بیکاروں کی
امداد ' ضعیفوں کی دیکھہ بھال اور اسی قسم کے گوناگوں کام حکومت کے سپرد
ہیں جن کی سربراہی وہ اپنے عام محاصل سے بالکل اُسی طریقے پر کرتی
ہے جس طریقے پر کہ وہ ملک کی مدافعت کے لئے فوجیں اور اندرونی
امن و امان کے لئے پولس اور عدالتیں برقرار رکھتی ہے - ایک اور بڑا عامل
جس کی بدولت آزاد مسابقت کا دائرۂ عمل روز بروز تنگ ہوتا جارہا ہے '
وہ وسائل نقل و حمل کی روز افزوں سہولت ہے - آج کل تقریباً ہر ملک
میں ہزاروں بلکہ لاکھوں باشندوں کے ذرائع معاش دوسرے ممالک کے

حالت سے ناگزیر طور پر وابستہ ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی ایک ملک میں کسی وجہ سے کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس کا اثر متعدد دوسرے ممالک پر پڑتا ہے : ہندوستان میں روئی کی فصل خراب ہوتی ہے تو جاپان کے پارچہ باف بیچین نظر آتے ہیں ' کناڈا اور آسٹریلیا میں گیہوں کی کاشت پھیلتی ہے تو امریکہ اور آرجنٹائن کے کاشتکار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ' انگلستان اور اس کی نو آبادیات میں ترجیحی تجارت کے معاہدے ہوتے ہیں تو ساری دنیا میں ایک کھلبلی مچ جاتی ہے ' فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کے کل سونے کی تین چوتھائی مقدار اکھٹی ہوجاتی ہے تو تمام دنیا کی تجارت خارجہ درہم برہم ہو جاتی ہے ' روس اپنی شہرۂ آفاق پنجسالہ اسکیم پر عامل ہوتا ہے تو یورپ و ایشیا کی دوسری حکومتیں اپنی اپنی جگہہ پر سہمی جاتی ہیں ' انگلستان معیار طلاء کو چھوڑ کر اپنے زر کی قدر کو گرا دیتا ہے تو ہندوستان سے سونے کی برآمد کا ایسا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جو کسی طرح منقطع ہوتا نظر نہیں آتا ' انگلستان اور امریکہ اپنے قرضے چکاتے ہیں تو ہندوستان سے لد لد کر چاندی روانہ کی جاتی ہے - غرض اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جن سے ہم یہ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ کیونکر گذشتہ چند سال کے اندر کرۂ زمین کے مختلف حصوں میں رہنے والوں کے اغراض و مفاد ناقابل انفکاک طریقہ پر ایک دوسرے کے ساتھہ وابستہ ہو گئے ہیں - گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے تو یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہوگئی ہے کہ اب کوئی ذي عقل انسان اس کی واقعیت سے انکار نہیں کرتا ' عام ازیں کہ وہ اُسے اچھا سمجھتا ہو یا برا - اِن مثالوں کو پیش کرنے سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے اِس چوتھے عشرہ میں جن جن حالات و کیفیات کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہ Laissez Faire یا اصول غیر مداخلت کے

سراسر منافي هیں - جدید حالات و رجحانات نے اس نظام معیشت کے دونوں اہم مسلمات کو صاف طور پر جھٹلا دیا ہے - ہم بدیہی طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ آج کسی ملک کا نظم معیشت اپنے آپ نہیں چل سکتا - بغیر حکومت کی مداخلت اور مرکزي انتظام اور ترتیب کے خود بخود ٹھیک راستے پر چلنا تو درکنار ' وہ ایک دن کے لئے بھي برقرار نہیں رہ سکتا - دوسرے یہ خیال کہ ذاتی منافعہ کی خواہش میں افراد اپنے اپنے طور پر جو طریق عمل اختیار کرتے ہیں وہ لازماً مفاد عامہ کے مطابق ہوتا ہے ' صریحاً بے بنیاد ہے - مزدوروں اور سرمایہ داروں ' زمینداروں اور کسانوں ' دولتمندوں اور مفلسوں' دولت پیدا کرنے والوں اور صَرف کرنے والوں کے متخالفانہ اغراض و مفاد کے مظاہرے روزانہ ہماری نظروں کے سامنے آتے رہتے ہیں - مزید برآں مختلف ممالک کے معاشی اغراض کا تصادم بھی کوئی مخفي شے نہیں ہے - ایسي حالت میں کیونکر کسی حکومت سے توقع کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے باشندوں کے مفاد کو دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر خود الگ بیٹھی رہیگی - نتیجہ یہ ہے کہ اب اصول غیر مداخلت سے انحراف کی مثالیں ہر ملک میں اس قدر کثیر اور ایسي اہم ہوگئی ہیں کہ انہیں محض مستثنیات کہکر ٹالا نہیں جاسکتا - حقیقت یہ ہے کہ ان مستثنیات نے اصلی نظریئے کی ساری بنیادیں کھوکھلی کردی ہیں اور اس کی ظاہری شکل بھی اس قدر مسخ کردي ہے کہ جو ممالک اپنی دانست میں اُس پر کاربند ہیں ' وہاں بھی مشکل ہی سے اُس کی شناخت کی جاسکتی ہے -

یہانتک ہم نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انیسویں صدی کے مدبرین نے دنیا کے معاشی امراض کے علاج کے لئے Laissez Faire کا جو سیدھا سادہ اور آسان منتر تجویز کرلیا تھا ' وہ محض افسانی تھا - یعنی

اس کی تاثیر چلد خاص حالات کے ساتھ وابستہ تھی ، جب تک وہ حالات برقرار رہے یہ ملتر بھی موثر ثابت ہوتا رہا ؛ لیکن جب سے یہ حالات بدلنے شروع ہوئے لوگ اس تدبیر سے بھی بتدریج دست کش ہونے لگے ، حتیٰ کہ ایک ملک یعنی سوویٹ روس سے تو اب اس ملک کا پورے طور پر اخراج ہو چکا ہے اور بقیہ ممالک میں اگرچہ ابھی تک اس پر عمل جاری ہے تاہم اس کا دائرہ روز بروز تنگ ہوتا جارہا ہے اور اس کا حریف مسلک جسے انگریزی میں Planning System کہا جاتا ہے اس کی جگہہ مسلّط ہو رہا ہے - لیکن اس نئے ملک کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ایک طرف تو ہر ملک اپنے اپنے حدود کے اندر جس قدر جلد ممکن ہوسکے اس کو تکمیل پر پہونچانے کی کوشش کرے اور دوسری طرف ساتھہ ھی ساتھہ تمام ممالک متفق ہوکر اپنے باھمی تعلقات کو بھی اُسی ملک کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں - کیونکہ جب تک مختلف ممالک سونچ بچار کرکے اپنے باھمی اغراض و مفاد میں بجائے تصادم کے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں گے اس وقت تک اس کرۂ ارض کے رہنے والوں کو باوجود قدرت پر روز افزوں غلبہ پانے کے امن اور چین کی زندگی نصیب نہیں ہوسکتی - چنانچہ موجودہ دور میں انسان جن گوناگوں مصائب میں مبتلا ہیں اور باوجود فراوانی دولت کے جو افلاس اُن میں پھیلا ہوا ہے ، اس کی سب سے بڑی ، سب سے اہم اور بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہم سر دست ان دو مسلکوں کے بین بین ہیں ، یا یوں کہئے کہ ہم ان میں سے کسی پر بھی ٹھیک طور پر قائم نہیں ہیں -

اِن میں سے ایک تو وھی اپنے آپ چلنے والا قدیم طریق معیشت ہے جس کے تحت ذاتی نفع کی خواہش ، آزاد مسابقت کے توسط سے تغیرات قیمت کی رہنمائی میں ، خود بخود انسانی ضروریات کی سربراھی کردیتی ہے -

دوسرا وہ جدید نظام معیشت ہے جس کے تحت آئندہ ضروریات کا قبل از قبل تخمینہ کر کے ایک طرف تو دولت کی پیدائش کو اُسی کے مطابق ڈھالا اور قابو میں رکھا جاتا ہے اور دوسری طرف پیدا کی ہوئی دولت کو اپنے آپ تقسیم ہونے کیلئے نہیں چھوڑ دیا جاتا بلکہ اُس کا بھی خاص طور پر انتظام کیا جاتا ہے - اول الذکر یعنی اپنے آپ چلنے والے طریقے کی خاص خوبی یہ ہے کہ اسکے تحت ایک تو انسان کی پیدا آور قوتوں کے لئے ذاتی نفع کی شکل میں ایک زبر دست محرک دستیاب ہو جاتا ہے - دوسرے انسانی خواہشات کی تکمیل کیلئے ' عام ازیں کہ وہ حقیقی ضرورت پر مبنی ہوں یا محض تلون مزاجی کا نتیجہ ' زیادہ گنجائش نکل آتی ہے - لیکن اس طریقے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اُس کے تحت اشیاء ' کی طلب میں کوئی پابندی اور باقاعدگی نہیں رہتی جس کی وجہ سے دولت کی پیدائش اور اس کی نکاسی میں وقتاً فوقتاً سخت خلل واقع ہوتا ہے اور اس طور پر مفید اور ناگزیر وسائل معاش بیدریغ ضائع ہو جاتے ہیں - آخرالذکر طریقہ کی خوبیاں اور نقائص اس کے بالکل برعکس ہیں - نقص تو اس کا یہ ہے کہ اس کے تحت عام طور پر پیدائش دولت کا محرک نسبتاً ضعیف ہوتا ہے ' لیکن اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ جو کچھ وسائل اور پیدا آور قوتیں انسان کو میسر ہوتی ہیں ' ان کو باقاعدگی اور کفایت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور اس طور پر جو کچھ دولت پیدا ہوتی ہے اس کی تقسیم میں حتی الوسع انصاف کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا جاتا - سر دست ہمیں ان دو متضاد طریقوں کی خوبیوں اور نقائص کی تفصیل سے چنداں سروکار نہیں ہے - بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ ہم حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طریقے پر سابقہ مسلک سے تو بہت کچھ ہٹ گئے ہیں لیکن اِس جدید

مسلک کی طرف جس سرعت کے ساتھ قدم بڑھانا چاہئیے ' نہیں بڑھا رہے ہیں - نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس درمیانی دور کے اندر دونوں مسلکوں کے فوائد سے محروم ہوگئے ہیں - قبل از قبل سونچی ہوئی تجویزوں پر عمل کرنے سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ' وہ تو ابھی تک ہماری دسترس سے باہر ہیں لیکن سرکاری نگرانی ' خانگی مراعات اور اِجاروں کی شکل میں ہم نے اِس قدیم ' اپنے آپ چلنے والے طریقہ کی راہ میں بھی ایسی رکاوٹیں پیدا کردی ہیں کہ جو فوائد آزاد مسابقت سے دولت صرف کرنے والوں کو حاصل ہوا کرتے تھے ' وہ بھی ہمارے ہاتھوں سے جاچکے - نتیجہ یہ ہے کہ دنیا آجکل سخت ضغطے میں مبتلا ہے اور اِس پریشانی کے عالم میں انسانوں سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہورہی ہیں - مثال کے طور پر ہم چند واقعات بیان کریں گے جو اُمید ہے کہ دلچسپی کا باعث ہونگے -

ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ چند سال سے دنیا کے سب سے زیادہ دولتمند خطوں یعنی یورپ و امریکہ میں لاکھوں بندگان خدا کو محض اس وجہ سے پیٹ بھر کھانا نہیں مل رہا ہے کہ گیہوں خریدنے کے لئے اُن کے پاس کافی زر موجود نہیں ہے مگر انہیں ممالک میں بہت سے کاشتکار محض اس وجہ سے کہ انہیں اپنے گیہوں کی مناسب قیمت نہیں ملتی ' اس کی کثیر مقدار یا تو گوداموں میں بیکار ڈال رکھتے ہیں یا اگر اِسکے مصارف بھی نا قابل برداشت ہونے لگیں تو اسے یونہی بیکار جلا ڈالتے ہیں اور آئندہ فصلوں کے لئے کاشت کا رقبہ گھٹا دیتے ہیں - کیا یہ تعجب کا مقام نہیں ہے کہ یورپ میں لاکھوں مفلس انسان سردی میں ٹھٹھرتے رہیں اور بریزیل میں اعلیٰ درجہ کی قہوہ ریل کے انجنوں میں جلا دی جائے اور حکومت یہ حکم نافذ کردے

کہ آئندہ تین سال تک قہوہ کا کوئی نیا پودا نہ لگایا جائے ؟ کسقدر حیرت کی بات ہے کہ جرمنی میں لاکھوں مرد اور عورتیں گوشت کو ترستے رہیں اور اس کے پڑوس کے ملک ڈنمارک میں تہائی لاکھ بیل اور گایوں کو صرف اس وجہ سے ہلاک کرکے جلا دیا جائے کہ ڈنمارک کے کسان اُن کا گوشت جرمنی کے ہاتھہ نرخ بخش قیمت پر نہیں فروخت کرسکتے ! ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ ہالینڈ میں ایک لاکھہ سور ہلاک کرکے جلا دئے گئے اور پرتگال میں شراب کی کثیر مقدار موریوں میں بہادی گئی ' مگر اس وجہ سے نہیں کہ وہ لوگ سور کا گوشت کھانا اور شراب پینا حرام تصور کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اِن چیزوں کا کوئی خریدنے والا نہیں - اسی طرح اسپین کے باغوں میں پھل درختوں ہی پر سڑ سڑ کر گر رہے ہیں اور ملایا مشرقی ' جزائر ہند اور جنوبی امریکہ میں ربڑ درختوں سے یونہی بہا جا رہا ہے لیکن کیا مجال کہ کوئی اُسے اکٹھا کرنے کی کوشش کرے - ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تو فوج کے سپاہیوں کو بھیج بھیج کر مزدوروں اور تاجروں کو تیل کے چشموں سے نکلوادیا گیا تاکہ وہ زمین سے تیل نہ نکالنے پائیں - مغربی جزائر ہند میں میلوں نیشکر کے درختوں کی شیرینی کھیتوں پر ہی کھڑے کھڑے ضائع ہوگئی اور ہندستان میں ہزارہا جوٹ کے پودوں کا بھی یہی حشر ہوا - مختلف ممالک میں ٹنوں مردہ مچھلی دوبارہ سمندر کے حوالے کردی گئی مگر بھوکے انسانوں کو کھانے کے لئے نہ مل سکی - غرض اِسی قسم کی بیسیوں مثالیں آپ کے سامنے پیش کیجاسکتی ہیں جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کیونکر یہ تہذیب و تمدن کے علمبردار ' اپنی عقل و ذہانت پر گھمنڈ کرنے والے اور بقیہ ساری دنیا کو بیوقوف سمجھنے والے ' خدا کی اِن بیش بہا نعمتوں کو بیدردی کے ساتھہ ضائع کر رہے ہیں ' اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ اُنہیں کے بھائی بند

سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تلاش معاش میں حیران و پریشان اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں - ہم جانتے ہیں کہ آج دنیا میں بیکاروں کی تعداد کا تخمینہ دس ملین کیا گیا ہے - طرفہ یہ کہ اِس میں سے بارہ ملین صرف اُس ملک کے حصے میں آئے ہیں جو مسلمہ طور پر دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند ہے ' جس کے بنکوں میں ساری دنیا کے سونے کی قریب قریب نصف مقدار محفوظ ہے اور دنیا کے بڑے بڑے ممالک جس کے قرضدار اور باجگزار ہیں - ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بارہ ملین اشخاص جو صرف چار سال پیشتر طرح طرح کے پیدا آور کاروبار میں لگے ہوئے تھے ' آج کام نہ ملنے سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے روٹیوں کو محتاج ہیں - حالانکہ اُنہیں کے حدود عملداری کے اندر لاکھوں من گیہوں گوداموں میں اور کروڑوں روپے کا سونا بنکوں میں بند اور بیکار ہے - ایسی حالت میں اگر کوئی مریخ کا رہنے والا اس کرۂ ارض کو ایک پاگل خانہ اور اس پر بسنے والوں کو ایک پاگلوں کا انبوہ تصور کرے تو کیا ہم انصافاً اُسے متعصب کہہ سکتے ہیں ؟

سوال یہ ہے کہ آخر اِس عجیب و غریب صورت حال کے اسباب کیا ہیں ؟

ہماری رائے میں سب سے اہم اور بنیادی وجہ تو وہی ہے جو ابھی اوپر بیان کی جاچکی ہے ' یعنی سائنس کی ایجادات ' وسائل آمد و رفت کی ترقی اور ہماری روز افزوں معلومات ہمیں بدیہی طور پر یہ بتلا رہی ہیں کہ یہ کرۂ ارض جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں ' دراصل ایک Unit (اِکائی) یا رقبہ ہے اور اسلئے یہ ضروری ہے کہ اسکے گوناگوں معاملات کا انتظام کرتے وقت اِس حقیقت کو نظر انداز نہ کیا جائے -

لیکن حالت یہ ہے کہ ہم نے باوجود ان بدیہی رجحانات کے اپنی اِس چھوٹی سی دنیا کے کوئی ستر چھوٹے بڑے حصے کر رکھے ہیں اور وہ بھی کسی معقول اصول پر نہیں بلکہ محض چند اتفاقی حوادث کی بنا پر اور لطف یہ ہے کہ اِن میں سے ہر ایک حصہ اپنے آپ کو ایک بالکل علیحدہ دنیا بنانے کی فکر میں ہے - وہ اپنے تمام معاملات کا خود فیصلہ کرنا چاہتا ہے اور دوسرے حصوں کے مشوروں کو مداخلت بیجا اور اپنی قومی آزادی کے منافی خیال کرتا ہے - اُسے محض اپنے حدود کے اندر بسنے والوں کے مفاد سے تعلق ہے اور اِس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ اس کے افعال و حرکات کا دوسرے حصوں کے اغراض پر کیا اثر پڑتا ہے بقول مسٹر ولز کے " جن خیالات کے مطابق آجکل معاشی مسلک کی تشکیل ہو رہی ہے ' اُن میں سے کچھہ تو قرون وسطیٰ سے تعلق رکھتے ہیں ' کچھہ قدیم روما کی شاہنشاہی کے زمانے سے چلے آرہے ہیں اور کچھہ تاریخ کا آغاز ہونے کے قبل کے ہیں - لیکن ایسے خیالات پر جو دنیا کے واقعی حالات پر مبنی ہوں ' ہمیں کہیں بھی عمل ہوتا نظر نہیں آتا - کوئی با اقتدار ادارہ آج ایسا نہیں ہے جو دنیا کی تجارت کو ترقی دینے کی کوشش کر رہا ہو یا جسے یہ تحقیق کرنے کا اختیار ہو کہ آیا دنیا میں مناسب اشیا کثیر سے کثیر مقدار میں پیدا اور صرف ہو رہی ہیں - جو حکومتیں ہیں وہ محض جزئی ہیں اور اُن کی صرف یہ کوشش ہے کہ محض اپنی قوم والوں کے لئے کوئی موقع اچھی اشیاء کے استعمال کا نہیں بلکہ نفع کمانے کا حاصل کریں اور وہ بھی ایسا نفع جو اُن کے کوشش نہ کرنے کی صورت میں کسی اور ملک کے باشندوں کے حصے میں آتا - اِن حکومتوں کو اِس سے کوئی سروکار نہیں کہ آیا انکا یہ طرز عمل بہ حیثیت مجموعی خود ان کی تجارت کی مقدار میں اضافہ کرتا ہے

یا تخفیف ' یا یہ کہ اس کی بدولت خود ان کے باشندوں کی حقیقی راحت و خوشحالی میں بھی در اصل کوئی اضافہ ہوتا ہے یا نہیں"
......مختصر یہ کہ قوموں کی باہمی بدگمانی اور ایک دوسرے کے حالات سے لا علمی ' اصول معاشیات پر عمل کرنے سے اُن کا صریح انکار ' یا اس بدیہی حقیقت کو تسلیم کرنے سے اُن کا گریز کہ کوئی قوم اپنے آپ کو تباہ کئے بغیر اپنے گاہکوں کو تباہ نہیں کرسکتی ' یہی امور مسٹر ولز کی رائے میں گذشتہ چار سال کے درد ناک واقعات کی آخری اور قطعی توجیہ ہیں ' قوموں کے اِس طرز عمل کو انگریزی زبان میں Economic Nationalism کے موزوں اور جامع الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے - اُردو میں ہم اُسے "معاشی قومیت" کہہ سکتے ہیں - پس ہمارے اِس تمام استدلال کا خلاصہ یہ ہوا کہ دنیا کے موجودہ حالات تو ہمیں Economic Internationalism یا "معاشی بین‌الاقوامیت" کی تلقین کر رہے ہیں لیکن ہم اپنے قدیم قومی تعصبات ' نسلی امتیازات ' اور مذہبی اختلافات کے زیر اثر سختی کے ساتھہ "معاشی قومیت" پر جمے ہوئے ہیں اور یہی ہٹ دھرمی در اصل ہماری موجودہ پریشان حالی کا بنیادی سبب ہے -

(۲)

اب ہم مختصراً اس اجمال کی تفصیل کیطرف متوجہ ہونگے - یعنی اُن واقعات پر نظر ڈالینگے جو "معاشی قومیت" کے مظاہر ہیں اور موجودہ عالمگیر کساد بازاری کے فوری یا قریبی اسباب تصور کئے جاسکتے ہیں -

یوں تو دنیا کی موجودہ مشکلات کے جراثیم طریق سرمایہ داری کی گذشتہ تیرہ سو سالہ تاریخ میں پھیلے ہوئے ہیں ' تاہم ہمارے

اغراض کے لئے صرف سابقہ پندرہ سال کے واقعات پر نظر ڈالنا کافی ہے - ۱۹۱۸-۱۴ع کی عالمگیر جنگ سے ابھی ہم اسقدر قریب ہیں کہ اُس کے پورے پورے نتائج کا احاطہ کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ' تاہم آثار و قرائن بدیہی طور پر بتلا رہے ہیں کہ نوع انسان کی زندگی کا یہ عظیم‌الشان واقعہ تاریخ عالم میں اسوجہ سے ہمیشہ یادگار رہیگا کہ اُسکی بدولت انسانوں کے تخیلات میں ایسا زبردست ہیجان اور اُن کے گوناگوں تعلقات میں ایسی اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں کہ یہاں سے دنیا کی تاریخ میں ایک بالکل ہی نئے باب کا آغاز ہوتا ہے - سر دست ہمیں اِن تمام تخیلات اور تعلقات کی تبدیلیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے - ہم اس وقت جنگ عظیم کے صرف اُن معاشی نتائج پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو عالم کی موجودہ کساوبازاری پر براہ راست اثر انداز ہوئے ہیں -

یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ جنگ عظیم سے دنیا کو سخت جانی اور مالی نقصان پہونچا لیکن اس مادی نقصان سے کہیں زیادہ شدید وہ تباہی ہے جو قوموں کے باہمی تعلقات میں بدظنی اور بے اعتمادی کے مستقل طور پر جاگزین ہوجانے سے واقع ہورہی ہے - یہ بدگمانی دو امور میں خاص طور پر نمایاں ہے ؛ ایک فوجی قوت کے سلسلے میں ' دوسرے تجارتی لین دین میں - اگرچہ فوجی پالیسی کا دنیا کی معاشی خوشحالی پر بہت زیادہ اور براہ راست اثر پڑ رہا ہے ' تاہم یہاں ہمیں اُس سے بحث نہیں - ہماری بحث کا موضوع اسوقت قوموں کا تجارتی لین دین ہے - جنگ سے پہلے دنیا کی عظیم‌الشان تجارت خارجہ کا مدار زر اور اعتبار کے بہت ہی نازک اور انتہا درجے مکمل انتظامات پر تھا - ان انتظامات کو انگریزی میں Gold

Standard System اور اُردو میں "طریق معیار طلاء" کہتے ہیں - دنیا کی موجودہ کساد بازاری کو سمجھنے کے لئے اس طریق کی نمایاں خصوصیات سے واقف ہونا ضروری ہے -

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت سے اچھے خاصے ذہین اور عقلمند اشخاص نہ صرف ہندستان بلکہ ممالک یورپ میں بھی معیار طلاء کے نام ہی سے خوف زدہ ہوجاتے ہیں اور اس کے طریق عمل کو سمجھنا ایک کار عظیم تصور کرتے ہیں - ممکن ہے یہ خیال ایک حد تک درست ہو لیکن جہانتک اس طریق کی بنیادی خصوصیت کا تعلق ہے ' وہ بہت سیدھی سادی اور بالکل آسان ہے - طریق معیار طلاء دراصل ایک ترکیب ہے جسکا خاص مقصد یہ ہے کہ مختلف ممالک کے قومی زروں کی اضافی قدر کو معین کردیا جائے - ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ہندوستان میں روپیہ رائج ہے اُسی طرح انگلستان میں پونڈ فرانس میں فرانک ' امریکہ میں ڈالر ' جاپان میں ین ' اور ہر ہر ملک میں ایک ایک جداگانہ زر مروج ہے - اب سوال یہ ہے کہ ان مختلف قومی زروں کی اضافی قدر کیا ہے - بہ الفاظ دیگر ایک پونڈ کتنے فرانک ' کتنے ڈالر ' کتنے ین ' اور کتنے روپیوں کے مساوی ہے ' کیونکہ جب تک اس بات کا قطعی علم نہ ہو ان مختلف ممالک کے مابین جدید پیمانے پر تجارتی لین دین اگر ناممکن نہیں تو کم از کم بہت دقّت طلب ہوجائیگا - چنانچہ اسی دقّت کو رفع کرنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی گئی کہ ہر ملک اپنے قومی زر کو سونے کی ایک معینہ مقدار کا ہم قدر قرار دے اور اپنی عملداری کے اندر ایسا انتظام کردے کہ لوگ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق مقرر کردہ شرح سے جس وقت چاہیں زر کے عوض سونا اور سونے کے عوض زر حاصل کرسکیں -

اب اگر هر ایک زر سونے کی کسی معینہ مقدار سے هر وقت بدل پذیر رهے تو ظاهر هے کہ ان مختلف زروں کی قدریں نہ صرف ایک دوسرے کے مقابلے میں معین هوجائینگی بلکہ اُن میں وقتاً فوقتاً بڑے بڑے تغیرات بھی واقع نہ هونگے -

اب رها یہ سوال کہ اس استقامت اور تعین کی ضرورت کیا هے ؟ اس کا جواب بالکل بدیہی هے - وہ یہ کہ تجارت بین الاقوام کے لئے مختلف قومی زروں کی باهمی قدر کا معین رهنا بڑے فائدے اور سہولت کی بات هے ' کیونکہ ایسی حالت میں مختلف ممالک کے تاجر پورے اطمینان اور بھروسے کے ساتھہ ایک دوسرے کے زروں کے عوض میں اشیاء کا لین دین کرتے هیں - وہ قبل از قبل یہ جان لیتے هیں کہ اُنہیں خود ملکی زر کے حساب سے مال تجارت کا کس قدر معاوضہ دینا یا لینا پڑے گا اور چونکہ اکثر و بیشتر تجارت کی بنیاد قرضے پر هوتی هے ' اس لئے اس بات کا قبل از قبل علم هونا بے حد ضروری هے - تجارت میں معمولاً یونہی بہت سے خطرات هوتے هیں ' اب اگر قوموں کے زروں کی باهمی قدریں بھی هر وقت کم و بیش هوتی رهیں تو ظاهر هے کہ اس سے تجارت میں ایک اور جدید اور خطرناک بے اطمینانی کا اضافہ هوجاتا هے -

مختصر یہ کہ اسی غیر معمولی سہولت کو پیش نظر رکھکر مختلف ممالک نے ' جو جنگ کے دوران میں بدرجۂ مجبوری معیارطلاء ' کو چھوڑ چکے تھے ' جنگ کے بعد دوبارہ اُس کو اختیار کرنے کی سخت کوشش کی اور موجودہ عالمگیر کساد بازاری شروع هونے سے پیشتر اُن میں سے اکثر اس کوشش میں کامیاب بھی هوچکے تھے - لیکن اس مرتبہ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اب معیارطلاء میں وہ بات نہیں جو جنگ سے پہلے نظر آتی تھی - جس خوبی اور سہولت کے

ساتھہ پہلے یہ معیار اپنا کام انجام دیتا تھا وہ اب اس میں باقی نہیں رھی - مختلف زروں کی باھمی قدر میں استقامت '- تو حسب سابق اُس کی بدولت پھر حاصل ہوگئی اور اگر یہ بھی حاصل نہ ہوتی تو پھر اُس کا فائدہ ھی کیا تھا ؟ لیکن مختلف ممالک کو اول تو دوبارہ معیارطلاء پر لوٹنے کے لئے اور دوسرے لوٹنے کے بعد اس پر قائم رھنے کے لئے جو جان توڑ کوشش اور متواتر جد و جہد کرنی پڑی ' ان کی بدولت اُنھیں سخت دقتوں بلکہ تباہ کن نتائج سے دو چار ہونا پڑا - تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ' البتہ یہ بدیہی ھے کہ سود کی شرحوں میں غیر معمولی اضافہ ' کاروبار کے لیے قرض دینے میں غیر معمولی رکاوٹ اور اشیاء کی قیمتوں میں جلد جلد تخفیف ' یہ ھیں وہ ثمرات جو گذشتہ چند سال سے معیار طلاء کے طفیل میں دنیا کو مل رھے ھیں - قدرتی طور پر سوال کیا جائیگا کہ کیوں ؟ آخر جنگ کے بعد وہ کونسی تبدیلی واقع ہوئی ھے جس نے معیارطلاء جیسے منید انتظام کو قوموں کے حق میں اس قدر مضر بنا دیا ھے ؟ اس کا مختصر جواب یہ ھے کہ معیار طلاء کی مثال ایک کھیل کی سی ھے اور ھر کھیل کے کچھہ قواعد و ضوابط ہوا کرتے ھیں - جب تک تمام کھلاڑی اپنے آپ کو ان قواعد کا پابند نہ کریں ' کھیل جاری نہیں رہ سکتا اور اگر پھر بھی اس کو جاری رکھنے کی کوشش کی جائیگی تو سوائے اس کے کہ طاقتور کھلاڑی کمزوروں کو پیٹیں ' اور کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوگا - یہی حال معیارطلاء کا ھے - جنگ کے بعد اکثر قوموں نے اُسے دوبارہ اختیار تو کرلیا لیکن بدقسمتی سے بعض نے اُس کے قواعد کی پابندی اپنے اوپر لازم نہ سمجھی ' نتیجہ یہ کہ اولاً اُنھوں نے دوسروں کو پریشان کیا اور بعد ازاں خود بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے - بات یہ ھے کہ معیارطلاء کو

کامیابی کے ساتھہ چلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا کو سونے کی جس قدر مقدار حاصل ہے اور ہوتی جارہی ہے وہ بڑی بڑی تجارتی قوموں میں کم و بیش ہر ایک کی ضروریات کے تناسب سے تقسیم ہوجائے - لیکن جنگ عظیم کے بعد سے کبھی بھی پورے طور پر اس شرط کی تکمیل نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ یہ اندیشہ لگا رہا کہ کہیں پورے طور پر اُس کی خلاف ورزی نہ ہوجائے - اولاً ریاستہائے متحدہ میں اور بعد ازاں فرانس میں دنیا کا سارا سونا کھنچ کھنچ کر جانے لگا اور یہ سلسلہ اب تک برابر جاری ہے - نتیجہ یہ کہ ان دو ملکوں میں تو سونے کے ذخائر اُن کی ضروریات سے کہیں زیادہ جمع ہوگئے ہیں اور بقیہ ممالک اپنے کاروبار کے لئے اس کی سخت قلت محسوس کر رہے ہیں -

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں ساری دنیا کا سونا کھنچ کھنچ کر امریکہ اور فرانس میں جمع ہوتا جارہا ہے اور کیوں دوسرے ممالک اپنی " اپنی ضرورت کے لائق سونا حاصل کرنے سے معذور ہیں - امریکہ کی بابت تو اس سوال کا جواب ظاہر ہے - جنگ سے پیشتر ریاستہائے متحدہ کا شمار دنیا کے قرضدار ممالک میں تھا یہاں کے باشندوں نے اپنے ملک کے وسیع قدرتی وسائل کو کارآمد بنانے کی غرض سے برطانیہ عظمیٰ اور دوسرے یورپی ممالک سے کثیر قرضے لے رکھے تھے اور اُن قرضوں پر وقتاً فوقتاً جو سود واجب‌الادا ہوتا تھا اُسے وہ زیادہ تر اشیائے خوراک اور خام پیداواروں کی بر آمد سے ادا کیا کرتے تھے - جنگ کے آغاز تک یہ سلسلہ برابر اسی طرح جاری تھا البتہ باہر سے جدید قرضے حاصل کرنے کی رفتار گھٹتی جارہی تھی - لیکن جنگ کے دوران میں یہ کیفیت بالکل بدلگئی - اول تو یورپی ممالک کے تمام تجارتی کاروبار یک‌لخت بند ہوگئے - دوسرے جنگ جاری رکھنے کے لئے ان ممالک کو

اور اِن میں بھی خاص کر اتحادیوں کو اشیائے خوراک اور گوناگوں ضروریات جنگ کی شدید اور روز افزوں ضرورت ہونے لگی - ریاستہائے متحدہ کو اپنی مالی حالت سدھارنے کا اِس سے بہتر کون موقع مل سکتا تھا ؟ اول تو اِس ملک نے نہایت احتیاط کے ساتھہ اپنے آپ کو یوروپی جھگڑوں سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی اور ایک مدت تک کامیابی کے ساتھہ غیر جانبداری پر قائم رہا ' دوسرے اہل امریکہ نے نہایت مستعدی کے ساتھہ غیر ملکی اشخاص کا جس قدر سرمایہ امریکہ کے کاروبار میں لگا ہوا تھا ' اُسے خریدنا شروع کیا حتیٰ کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے تمام کاروبار کے خود مالک بن گئے ' تیسرے مصیبت زدہ اہل یورپ کے آڑے وقت سے فائدہ کمانے میں انہوں نے ذرا بھی تامل نہیں کیا - اشیائے خوراک اور ضروریات جنگ کثرت سے تیار کرکے وہ منھہ مانگی قیمتوں پر یورپ والوں کے ہاتھہ فروخت کرنے لگے اور اپنے خریداروں کو اس قابل بنانے کے لیے کہ وہ قیمت ادا کرسکیں ' اعلیٰ اعلیٰ شرحوں سے کثیر رقمیں قرض دیں - ان تمام واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب جنگ ختم ہوئی تو ریاستہائے متحدہ کی حیثیت بالکل بدلی ہوئی تھی - اب وہ قرضدار نہیں بلکہ دنیا کا بہت بڑا قرض خواہ ملک تھا - یوروپی اقوام اور خاص کر برطانیہ عظمیٰ سے سود کی بابتہ سال بہ سال کثیر رقمیں اُس کو واجب الوصول ہونے لگیں - لہذا سوال یہ پیدا ہوا کہ اِن رقموں کی ادائی کی کیا سبیل نکالی جائے - بدیہی طور پر اِس کا بہترین ذریعہ یہ تھا کہ یورپ والے اپنا مال ریاستہائے متحدہ کو زیادہ روانہ کریں اور خود اُن سے جس قدر ہوسکے کم مال خریدیں - لیکن دو وجوہ سے اس کا امکان نہ تھا - ایک تو اختتام جنگ کے بعد اہل یورپ میں یہ سکت نہیں رہی تھی کہ وہ فوراً کثرت سے مال تیار کرکے امریکہ روانہ کریں ' اِس کے

برعکس وہ اپنی ضروریات کے لئے خود امریکہ کے محتاج تھے اور اِس وجہ سے جنگ کے بعد بھی امریکہ سے بہ کثرت مال خریدتے رہے - دوسرے یہ کہ ریاستہائے متحدہ نے خوب محصول لگا لگا کر خاص کر اُنھی اشیاء کو اپنے ملک میں داخل ہونے سے روک دیا جن کے توسط سے اہل یورپ اپنے قرضے ادا کرسکتے تھے - نتیجہ یہ کہ یورپ والوں کو نہ صرف اپنے قرضوں پر سود ادا کرنا پڑتا تھا بلکہ زیادہ مال خریدنے اور کم مال فروخت کرنے کی وجہ سے بھی اُن پر مزید رقموں کی ادائی واجب ہوتی تھی - غرض اِس غیر متوازن صورت حال کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ریاستہائے متحدہ میں سونے کی کثیر مقدار اکٹھی ہوجائے - چنانچہ ۱۹۲۳ ع میں امریکہ کے سونے کی مقدار فرانس کو چھوڑ کر بقیہ تمام ممالک کے سونے کی مجموعی مقدار کے برابر تھی -

دوسرا بڑا ملک جہاں آج کل سونے کی مقدار ضرورت سے زیادہ جمع ہوگئی ہے ' وہ فرانس ہے ' لیکن یہاں اس صورت حال کے اسباب کسی قدر مختلف ہیں - اُن کو سمجھنے کے لئے ہمیں چند باتیں خاص طور پر یاد رکھنی چاہئیں :—ایک یہ کہ فرانس جنگ کے پہلے ہی سے ایک بڑا قرض خواہ ملک ہے - دوسرے یہ کہ جنگی قرضوں کی بابت جو رقمیں اُسے ادا کرنا پڑیں اُن سے کہیں زیادہ رقوم تاوان جنگ کی صورت میں اُسے جرمنی سے وصول ہوئیں - تیسرے یہ کہ جنگ کے بعد فرانس کی صنعتوں میں تو بہت تیزی سے ترقی ہوئی لیکن صرف دولت اور اُجرتوں کی شرح میں اُسی مناسبت سے توسیع نہیں ہوئی - چوتھے یہ کہ فرانس بہت بڑی حد تک اپنی ضروریات کا آپ کفیل ہے ' یعنی برطانیہ اور جرمنی کے مقابلے میں تجارت درآمد و برآمد پر اُس کی زندگی کا کم مدار ہے - مزید برآں جنگ کے بعد فرانس نے اپنی تجارت برآمد کو خوب وسعت دی لیکن اپنے

قدیم تجارتی مسلک کے مطابق مال درآمد کو ملک میں داخل ہونے سے روکتا رہا - نتیجہ اِن تمام امور کا یہ ہوا کہ فرانسیسی سرمایہ داروں کے پاس کثیر رقمیں سونے کی شکل میں پس انداز ہونے لگیں -

اب جنگ کی بدولت اور ممالک کی طرح فرانس کے انتظامات زر بھی درہم برہم ہوگئے تھے اور جنگ کے بعد اُن کو ازسرنو درست کرنے سے قبل بعض اور اسباب کے زیر اثر فرانک کی قیمت اِس قدر گھٹ گئی کہ ہر شخص اُس سے الحذر کرنے لگا - خود فرانسیسی سرمایہ دار کثرت سے اپنا سرمایہ دوسرے ممالک اور خاص کر برطانیہ کو روانہ کرنے لگے جہاں پونڈ اِسٹرلنگ کی قیمت ایسے متواتر اور حیران کُن تغیرات سے محفوظ تھی - نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ فرانسیسی سرمائے کی ایک کثیر مقدار قلیل المیعاد قرضوں کی شکل میں لندن کے بنکوں میں جمع ہوگئی - اب برطانیہ کے لئے یہ ایک طرح کی زبردستی غیبی امداد تھی کیونکہ امریکہ کو متواتر سونا روانہ کرنے سے انگلستان بنک کے ذخائر میں جو خطرناک کمی واقع ہو رہی تھی ' اُس کی تلافی ایک حد تک اس فرانسیسی سونے سے ہوگئی - دوسرے یہ کہ برطانیہ نے ان فرانسیسی رقوم کے بھروسے پر کچھہ تو اعلیٰ شرح سود کے لالچ میں اور کچھہ سیاسی وجوہ کی بناء پر کثیر رقمیں جرمنی کو قرض دیدیں اور بعد کے حالات کی روشنی میں ہم یہ محسوس کررہے ہیں کہ یہ برطانیہ کی بڑی غلطی تھی - کیونکہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں ' فرانسیسی رقمیں صرف قلیل المیعاد امانتوں کی شکل میں برطانیہ کو روانہ کی گئی تھیں ' برطانیہ کے لئے یہ بات قرین عقل نہیں تھی کہ وہ ایسی رقموں کو لیکر خاص کر جرمنی جیسے ملک میں پھنسادے جسکی مالی حالت کسی طرح سے تشفی بخش نہیں تھی - ہمیں فی الحال ان اختلافی مباحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں -

واقعات کا جہاں تک تعلق ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ جیسے ہی فرانسیسی زر کے انتظامات درست ہوگئے اور فرانک کی قدر میں استقامت پیدا ہوگئی ' فرانسیسی سرمایہ دار بتدریج اپنی امانتیں لندن سے واپس منگوانے لگے جسکی وجہ سے سونا انگلستان بنک سے نکل نکل کر پیرس جانے لگا - برطانیہ کے مالی نظام کے لئے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا - امریکہ کی جانب تو سونے کی روانگی کا سلسلہ بدستور جاری ہی تھا · اب جو پیرس والوں کے مطالبات شروع ہوئے تو صورت حال روز بروز خطرناک ہونے لگی کیونکہ برطانیہ کے لئے یہ بات قطعی ناممکن تھی کہ وہ فرانس کی رقمیں ادا کرنے کے لئے اپنے قرضداروں اور خاص کر جرمنی سے اپنے قرضوں کی فوری واپسی کا مطالبہ کرے - اگر ایسا کیا جاتا تو جو عالمگیر مالی مرحلہ ۱۹۳۱ ع تک رکا رہا وہ فوراً شروع ہوجاتا اور جرمنی کی ساکھ اور اُس کے اعتبار کا تو یقیناً خاتمہ ہوجاتا -

واضح رہے کہ اس صورت حال کے پیدا کرنے میں سیاسی مصلحتیں بھی پس پردہ بہت کچھ کار فرما رہیں - یوروپی سیاسیات کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ جنگ عظیم کے بعد سے برطانیہ کی خارجی پالیسی کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ جرمنی کی معاشی حالت کو پورے طور پر تباہ نہ ہونے دیا جائے تاکہ ایک طرف تو وہاں اشتراکیت کی حمایت اور روسی تجربے کی تقلید کا خیال جڑ نہ پکڑنے پائے اور دوسری طرف فرانس کی قوت ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہو سکے - برطانیہ کا بلا روک ٹوک جرمنی کو قرضے دینا اور فرانس کا اپنی قلیل المیعاد امانتوں کو اس قدر اصرار کے ساتھ واپس لینا در اصل انہی سیاسی احساسات کے مظاہر ہیں -

اس توضیح سے ناظرین کو یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ کیوں جنگ کے بعد اور جنگ ہی کے نتیجے کے طور پر مختلف ممالک کے درمیان سونے کی تقسیم میں یہ حیرت انگیز سقم پیدا ہوگیا ہے - لیکن بات جو قابل توجہ ہے ' وہ یہ ہے کہ اس خرابی کا وبال فی نفسہ معیارطلاء کے طریقے پر ڈالنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری در اصل اُن ممالک پر عائد ہوتی ہے جو اس کھیل کے قواعد کی برابر پابندی نہیں کر رہے ہیں - اگر ریاستہائے متحدہ اور فرانس بنک کاری کے ناگزیر اصولوں پر عامل رہتے تو سونے کی یہ نا مناسب تقسیم اس قدر دیر پا ثابت نہ ہوتی ' بلکہ معیارطلاء کے اٹل اصولوں کے مطابق خود بخود اس کی اصلاح ہوجاتی - اس معیار پر عامل رہنے کا اقتضا یہ تھا کہ یہ ممالک سونے کے ذخیروں میں اضافہ ہوتا دیکھکر اپنے قومی زر کی مقدار بھی اُسی تناسب سے بڑھا دیتے - اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا کہ ان ملکوں میں اشیاء کی قیمتیں دوسرے ممالک کے مقابلے میں چڑھ جاتیں جسکی وجہ سے اُن کے مال کی برآمد گھٹ جاتی اور دوسرے ممالک کا مال اِن کے یہاں زیادہ مقدار میں در آمد ہونے لگتا اور اس روز افزوں درآمد کی قیمت ادا کرنے کے لئے سونا یہاں سے نکل نکل کر حسب ضرورت دوسرے ممالک میں تقسیم ہوجاتا اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا جبتک کہ اُن ممالک میں بھی قیمتیں اُسی سطح پر نہ اُتر آتیں جو دنیا کی قیمتوں کی عام سطح کہلاتی ہے - بدقسمتی سے نہ امریکہ نے اس اصول کی پابندی کی اور نہ فرانس نے بلکہ دونوں نے علی‌الاعلان اُس کی خلاف ورزی کی اور وہ اِس طور پر کہ جو سونا اُنہیں وصول ہوتا گیا اُسے قاعدے کے مطابق اپنے قومی زر کی بنیاد بنانے کے بجائے اپنے بنکوں میں یونہی بیکار ڈال رکھا - انگریزی اصطلاح میں انہوں نے اُسے Sterilize کر دیا یعنی اُسے اپنا فطرتی فرض انجام دینے سے باز رکھا - فرانس اور

امریکہ کی طرف سے الزام کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اگر ہم اِس قدر کثیر سونے کی مقدار کے تناسب سے اپنے زر کی مقدار میں اضافہ کر دیتے تو اسکی وجہ سے ہماری اندرونی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوکر ہماری صنعت و حرفت اور دوسرے کاروبار تباہ ہو جاتے اور ظاہر ہے کہ کسی ملک سے ایسے ایثار کی بجا طور پر توقع نہیں کیجاسکتی - تفصیل میں پڑے بغیر ہم اِسکے جواب میں صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا بعد کے واقعات ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ فرانس اور امریکہ نے سونے کو اسطرح بچا بچا کر در اصل کوئی فائدہ حاصل کیا ہے ؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ باوجود سونے کی تین چوتھائی مقدار اپنے پاس دبارکھنے کے یہ دونوں ملک بھی عالمگیر کساد بازاری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے ؟ اب رہا یہ سوال کہ آیا قواعد کی پابندی کی صورت میں اُنھیں اِس سے زیادہ نقصان پہنچتا یا کم ' اِسکا جواب نہ ممکن ہے اور نہ مفید - لہذا ہمیں اُسکی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرنیکی کوئی ضرورت نہیں - سونے کی تقسیم کی اِس خرابی کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ امریکہ اور فرانس ضرورت مند ممالک کو اور قرضے عطا کریں تاکہ اسطرح پر سونا اُن کے یہاں سے نکل نکل کر دوسرے ممالک میں پہنچے اور اُس کی تقسیم درست ہونے سے پھر معیار طلاء کا عمل حسب سابق جاری ہوسکے - بلا شبہ اِس ترکیب سے امریکہ اور فرانس میں جو سونے کے انبار لگ گئے ہیں ' وہ دوسرے ممالک میں پھیل جائینگے اور اِس طور پر ممکن ہے کہ جو دقتیں معیار طلاء کے بگڑ جانے سے پیدا ہوگئی ہیں وہ رفع ہوجائیں - لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک محض عارضی علاج ہے - اِس سے مرض کی بیخکنی ہونے کے بجائے اس میں آئندہ اور شدت پیدا ہونے کا

قریںہ ھے - کیونکہ اول تو قرضوں کا وقتاً فوقتاً سود ادا کرنا ہوگا ' دوسرے کچھہ مدت بعد خود اصل کی واپسی بھی ضروری ھے - سوال یہ ھے کہ آخر یہ مطالبات کیسے ادا ہوں ؟ مال و اسباب لینے سے تو قرضخواہوں کو انکار ھے ' لہذا ضروری ہوا کہ سونا واپس کیا جائے - اس طرح ہم پھر اُسی نقطہ پر پہنچگئے جہاں سے آغاز کیا تھا - اگرچہ اس ترکیب سے مرض کا مستقل علاج نہیں ہوسکتا ' تاہم یہ صحیح ھے کہ اُسکی بدولت موجودہ تکلیف و مصیبت سے کچھہ آرام ضرور مل سکتا ھے مثلاً ۱۹۲۴ع کے بعد ایک مدت تک امریکہ میں سونے کی مقدار میں مزید اضافہ رکا رہا بلکہ اس میں کچھہ تخفیف ھی ہوگئی - اِس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُس زمانے میں امریکہ والے اپنا سرمایہ کثرت کے ساتھہ دوسرے ممالک اور خاصکر جرمنی کو قرض دے رہے تھے - جرمنی اس سرمائے سے کچھہ تو اپنی شکستہ حالت درست کرنے اور کچھہ تاوان جنگ ادا کرنے میں مدد لے رہا تھا - لیکن جب ۱۹۲۹ع میں امریکہ والوں نے یہ دیکھا کہ وہ اپنے ھی ملک میں سرمایہ لگاکر زیادہ منافعہ کما سکتے ہیں تو انہوں نے نہ صرف مزید قرضوں کا سلسلہ بند کر دیا بلکہ اپنے سابقہ قرضے بھی واپس لینے لگے - اور چونکہ مال و اسباب کی شکل میں قرضہ واپس نہ لینے کی اُنہوں نے گویا قسم کھا رکھی تھی اسلئے یورپ اور ساری دنیا کا سونا نہایت سرعت کے ساتھہ پھر امریکہ میں جمع ہونے لگا - جہاں تک فرانسیسی سرمایہ داروں کا تعلق ھے ' انہیں بیرونی ممالک اور خاص کر روس میں قرض دیکر کچھہ ایسے تلخ تجربے ہوئے ہیں کہ اب وہ اس طور پر اپنے سرمائے سے کام لینے میں بہت تامل کرتے ہیں - روسی انقلاب میں فرانس کے سرمایہ داروں کی کثیر رقمیں ڈوب گئیں - اُس کے بعد سے وہ ایسے خوفزدہ ہوگئے ہیں کہ اپنا سرمایہ باہر بھیجنا بہت کم کردیا ھے اور جو کچھہ روانہ کرتے بھی

هیں تو وہ قلیل المعیاد قرضوں کی شکل میں یا بیرونی ممالک کے بنکوں میں امانتوں کے طور پر تاکہ جیسے ہی انہیں کوئی خطرہ محسوس ہو' وہ اپنی رقمیں واپس منگواسکیں - مختصر یہ کہ موجودہ معاشی بدنظمی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے دو بڑے قرضخواہ ملک فرانس اور ریاستہائے متحدہ نہ تو مال و اسباب کی شکل میں اپنے قرضے واپس لینا چاہتے میں اور نہ سر دست قرضدار ممالک کو وصول طلب رقمیں کچھہ اور مدت کے لیے قرض دینے پر آمادہ هیں - نتیجہ یہ ہے کہ سونے کی کثیر مقدار صرف ان دو ملکوں میں بیکار پڑی ہوئی ہے اور بقیہ ممالک میں سونے کی سخت قلت محسوس ہو رہی ہے - اس قلت کی وجہ سے ان ممالک کو معیارطلاء کے اصولوں کے مطابق زر کی مقدار گھٹانی پڑی ' شرح سود میں اضافہ کرنا پڑا اور کاروبار کے لیے قرضے دینے میں غیر معمولی طور پر هاتھہ روکنا پڑا ' ان انتظامات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عام اشیاء کی قیمتوں میں تخفیف ہو - چنانچہ یہ تخفیف شروع ہوئی اور ۱۹۲۹ع کے بعد سے وہ اس قدر شدید اور عالمگیر ہوگئی کہ دنیا کی تاریخ میں اس کساد بازاری کی کہیں نظیر نہیں ملتی -

(۳)

هم اس مضمون کے پہلے حصے میں یہ معلوم کر چکے هیں کہ هماری موجودہ مشکلات کا بنیادی سبب هماوا وہ طرز عمل ہے جسے "معاشی قومیت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے - کیونکہ اس طرز عمل نے جنگ کے بعد معیار طلاء کے سارے انتظام کو درهم برهم کر دیا ' اس کی بھی مختصر کیفیت هم اوپر معلوم کر آئے هیں اب هم اسی طرز عمل کی دو اور مثالیں پیش کریں گے جنہیں موجودہ کساد بازاری

سے بہت گہرا تعلق ہے - ان میں سے پہلی مثال تاوان جنگ کی ہے اور دوسری قوموں کے تجارتی مسلک کی -

تاوان جنگ کے متعلق یہ سوال کہ وہ فی نفسہ کہاں تک حق بجانب ہے ' در اصل ایک بے سود سوال ہے - آپ قیامت تک اس مسئلے پر بحث کرتے رہئے لیکن اس پر فریقین میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکتا - اس لئے مناسب یہ ہے کہ ہم صرف واقعات سے اپنا سروکار رکھیں اور یہ دیکھیں کہ یہ واقعات کس حد تک موجودہ صورت حال کے پیدا کرنے میں معاون ہوئے ہیں - واقعات یہ ہیں کہ جن قوموں نے گذشتہ جنگ میں فتح حاصل کی اُنہی کو اور اُن میں بھی خاصکر فرانس اور بلجیم کو دوران جنگ میں سب سے زیادہ مالی نقصان پہنچا - اُن کے بیسیوں شہر تباہ ہوگئے : عمدہ عمدہ عمارتیں جل کر خاکستر ہو گئیں : کارخانے اُجڑ گئے : کاروبار برباد ہوگئے ' سیکڑوں میل کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں جل کر سیاہ ہوگئیں ' لاکھوں ایکڑ زمین ناقابل کاشت بن گئی ' اور ہزاروں پُر امن زندگی بسر کرنے والے اور گاڑھے پسینے سے روٹی کمانے والے دیہاتی بے خانماں ہوگئے - مزید براں قوم کے لاکھوں نوجوان ہلاک ہوئے اور جو بچ رہے ان میں سے اکثر و بیشتر اپاہج اور آئندہ روٹی کمانے سے معذور ہوگئے - جس قوم کو فتح حاصل کرنے میں ایسے کثیر جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑیں ' مفتوح دشمن کے خلاف اس کے غیظ و غضب کی بھلا کیا حد و انتہا ہو سکتی ہے - نتیجہ یہ کہ جب جرمنی اور دوسری شکست خوردہ قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لئے فتح مند لیکن تباہ حال متحدین کی کونسل بیٹھی تو ان میں سے ہر ایک رکن اس بات پر تلا ہوا تھا کہ نہ صرف اپنے اپنے نقصانات کی پوری پوری تلافی کرے بلکہ جرمنی کو اس عظیم‌الشان

قتل و غارت کا تنہا مجرم قرار دیکر اُس کی بھی خاطر خواہ سزا دے -
جہاں تک کہ جرم کی ذمہ داری کا تعلق ھے ' صرف جرمنی پر اُس کا
بار ڈالنا ایسا ھی ھے جیسا کہ کسی فٹ بال کے مقابلے میں صرف اُس
کھلاڑی کو مقابلے کا باعث قرار دینا جو سب سے پہلے گیند آگے بڑھاتا ھے -
جس دنیا میں قوموں کے باھمی تنازعات کے فیصلے کا بجز جنگ کے
کوئی اور ذریعہ نہ ھو ' جہاں جنگ و جدال اور قتل و غارت کو انسانی
ترقی کا ناگزیر عامل بلکہ خود تہذیب و تمدن کا مظہر خیال کیا جاتا
ھو ' وھاں کسی ایک قوم کو ایک بڑی عالمگیر جنگ کا تنہا ذمہ دار
ٹھیرانا محض ایک طفلانہ حرکت ھے - لیکن یہ بحث ھمارے مضمون
سے غیرمتعلق ھے - جو بات ھمارے لئے خاص طور پر قابل لحاظ ھے '
وہ یہ ہے کہ جب متحدین کے نمائندے جرمنی کو سزا دینے کے لئے
بیٹھے تو وہ جنگ کے بھڑکائے ھوئے رنج اور غصہ کے جذبات سے بیحد
مغلوب اور واقعات کو اُن کی اصلی حالت میں دیکھنے سے بالکل معذور
تھے - فرانس اور بلجیم کے اغراض اس مسئلے سے خاص طور پر وابستہ
تھے کیونکہ انسانی جماعتوں کی اس بےنظیر کشتی کے لئے انھی قوموں
کی سر زمین کو دنگل بنایا گیا تھا اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ مالی
نقصان اُنھیں کو برداشت کرنا پڑا تھا - لہذا کوئی وجہ نہ تھی کہ اُن کے
نقصانات کی تلافی نہ کیجائے چنانچہ فرانس اور بلجیم نے اپنے مطالبات
پیش کئے اور ان کی انتہائی مقداریں تجویز کیں - برطانیہ عظمی نے اپنے
کثیر بحری نقصانات کو مدنظر رکھکر جرمنی کے تمام تجارتی جہاز ضبط
کر لئے اور جنگی وظائف کا ایک علیحدہ مطالبہ پیش کیا - ریاست ھائے
متحدہ نے بیشک نرمی کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی لیکن چونکہ وہ خود
جنگی قرضوں کے معاملے میں کسی قسم کی رعایت پر آمادہ نہیں تھا
لہذا اس کی نصیحت کا نہ کوئی اثر ھوسکتا تھا اور نہ ھوا - نتیجہ یہ

که ان تمام نقصانات کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کی گئی اور جرمنی سے یہ مطالعہ کیا گیا کہ وہ (۱۳۲) ملیارڈ طلائی مارک جو (۶۶۰۰) ملین پونڈ کے مساوی ہوتے تھے متحدین کو بطور تاوان ادا کرے - نفرت و حقارت کے جذبات سے متاثر ہوکر فاتحین نے تاوان کی یہ مضحکہ خیز مقدار تو مقرر کردی لیکن ایک لمحے کے لئے یہ نہ سوچا کہ آخر یہ کثیر رقم ادا ہو تو کیسے ہو - کیونکہ اگر جرمنی یہ ساری رقم سونے کی شکل میں ادا کرنے کی کوشش کرتا تو دنیا میں سونے کی جو کل مقدار موجود ہے ' اُس کی کم از کم سہ‌گنی مقدار اس غرض کے لئے درکار ہوتی اور اگر یہ خیال تھا کہ جرمنی سے اس رقم کے هم مقدار مال و اسباب وصول کیا جائے ' تب بھی یہ ایک لاحاصل کوشش تھی کیونکہ ایک ایسے ملک سے جس کے سارے باشندے قحط کی مصیبتوں میں مبتلا ہوں ' جس کی نو آبادیات چھین لی گئی ہوں ' جس کے جہازات ضبط کر لئے گئے ہوں' اور جو اپنے معدنیات اور دولت کے سر چشموں سے محروم کر دیا گیا ہو ' یہ کیونکر توقع کیجاسکتی تھی کہ وہ اس قدر کثیر مقدار میں مال و اسباب تیار کرے - مختصر یہ کہ سونے کی شکل میں تو اس تاوان کا ادا ہونا صریحاً محال تھا اور اگر بالفرض بہ‌دقت تمام مال و اسباب کی شکل میں اُس کا امکان تھا بھی تو وہ یہاں خارج از بحث ہے ' کیونکہ یہ متحدین کا منشا ھی نہ تھا - انگلستان کے مشہور ماہر معاشیات ' پروفیسر کینس نے اپنی معرکۃ‌آلار کتاب " صلح و رسائی کے معاشی نتائج " میں نہایت خوبی اور تحقیق کے ساتھہ اِن مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور انہوں نے نیز دوسرے ماہرین نے حکومت وقت کو اس حماقت کی طرف متوجہ بھی کیا - لیکن جہاں جذبات بھڑکے ہوئے ہوں ' وہاں بھلا غریب پروفیسروں کی باتوں پر کون دھیان کرتا ؟ یہ کہکر کہ ان بچے پڑھانے والوں کو عملی سیاسیات کے

پر پیچ اور بلند مسائل سے کیا واسطہ انگلستان اور اس کے حلیف اپنے اِن عجیب و غریب مطالبات پر برابر اڑے رہے اور اپنے اصرار سے یورپ بلکہ ساری دنیا کے سیاسیات میں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتے رہے -

اب سوال یہ ہے کہ یورپ کے ماہرین سیاست کے اِس تدبر کا دنیا کی موجودہ کساد بازاری کے پیدا کرنے یا کم از کم اُسے اور زیادہ سخت بنانے میں کیا حصہ ہے - اِس غرض کے لئے ہمیں اولاً تاوان جنگ کی بعض خصوصیات پر نظر ڈالنا چاہئے - تاوان کی سب سے نمایاں خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ ادا کرنے والے ملک کے حق میں محض ایک بار ھی بار ہے - قومیں یوں تو ہمیشہ ایک دوسرے کی قرضدار رہتی ہیں لیکن تاوان جنگ ایک ایسا قرضہ ہے جو کسی پیدا آور کاروبار کے لئے نہیں لیا گیا ' بلکہ جو کسی سابقہ نقصان کی تلافی کے لئے ادا کیا جاتا ہے - جو قرضے کاروبار میں لگائے جاتے ہیں ' وہ اپنی ادائیگی کی آپ سبیل نکال لیتے ہیں اور اس وجہ سے لینے والے اور دینے والے دونوں کے حق میں مفید ہیں - تاوان جنگ کی یہ نوعیت نہیں ہے - لینے والے کے حق میں تو وہ محض ایک سابقہ نقصان کا معاوضہ ہے لیکن دینے والے کے حق میں وہ سراسر ایک بوجھ ہے - اُسکو ادا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ باشندوں پر روز افزوں ٹیکس لگائے جائیں جس کی بدولت اُن کا معیار زندگی پست ہوتا جاتا ہے اور مختلف اشیاء خریدنے کی قوت سلب ہوتی جاتی ہے ' اور جیسے جیسے یہ قوت سلب ہوتی ہے اُسی مناسبت سے تجارتی چہل پہل میں کمی ہوتی جاتی ہے ' مال فروخت نہیں ہوتا اور کاروبار سرد پڑ جاتے ہیں - یوں تو ہر حکومت اپنی رعایا سے ٹیکس وصول کرتی ہے لیکن اُن محاصل کا ایسا برا اثر نہیں پڑتا کیونکہ اگر ایک طرف ادا کرنے والوں کی جیبیں خالی ہوتی ہیں تو دوسری طرف تحفظ جان و مال ' تعلیم و حفظان

صحت اور دوسری گوناگوں خدمات کی شکل میں اُنھیں معاوضہ بھی مل جاتا ہے - تاوانی محاصل کا بدیہی طور پر یہ اثر نہیں ہو سکتا ـ تاوان ایک غیر پیدا آور قرضہ تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی وہ ایک خارجی قرضہ بھی ہے ' یعنی اس کے پانے والے خود باشندگان ملک نہیں ہیں بلکہ ایک غیر حکومت ہے اور یہ خصوصیت بجائے خود ادا کرنے والی حکومت کے لئے کئی طرح سے ضرر رساں ہے - ایک یہ کہ جب حکومت کے قرض خواہ خود ملک ہی کے باشندے ہوتے ہیں جیسے کہ جنگی تمسکات کی صورت میں تو حکومت پر اگر ایک طرف قرضے کے ادا کرنے کا بار پڑتا ہے تو دوسری طرف اسے مزید آمدنی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بھی حاصل ہو جاتا ہے - تاوان میں یہ بات نہیں - دوسری دقت یہ ہے کہ ادا کرنے والی حکومت کو نہ صرف اپنی رعایا پر ٹیکس لگاکر رقم مہیا کرنی پڑتی ہے بلکہ وہ اِس رقم کو دوسرے ملک کے زر میں بدلنے کی بھی ذمہ دار ہے - جرمنی کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے زر یعنی مارک کی شکل میں ایک معینہ رقم مہیا کردے بلکہ اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ خاص خاص شرحوں کے حساب سے حسب ضرورت ' فرانک ' پونڈ ' اور دوسرے زر حاصل کرے یا اُن کے ہم مقدار سونا فراہم کرے اور یہ کوئی آسان کام نہیں - خارجی قرضے کی تیسری دقت یہ ہے کہ گرتی ہوئی قیمتوں کے زمانے میں اُس کا بار اور بھی زیادہ ہوجاتا ہے چنانچہ اِس بناء پر بھی جرمنی کے بار میں گذشتہ چند سال کے اندر غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے - تاوان جنگ کی چوتھی اور آخری خصوصیت یہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے ' ادا کرنے والے ملک میں اُس کی مخالفت بڑھتی جاتی ہے ' اُس کو خلاف انصاف تصور کیا جاتا ہے ' اور اُس کی بدولت سیاسی تعلقات میں پیچیدگیاں اور بین الاقوامی کار و بار میں ساکھ اور اعتبار مفقود ہوجانے سے گوناگوں رکاوٹیں

پیدا ہوجاتی ہیں - جرمنی میں اڈولف ہٹلر کی ترقی کا راز بہت بڑی حد تک تاوان جنگ کے انہی ناگزیر نتائج میں مضمر ہے -

اگر فاتح ملکوں کے مدبرین واقعی تدبر سے کام لیتے تو اولاً وہ تاوان کی ایسی مضحکہ انگیز مقدار مقرر نہ کرتے ' دوسرے وہ اس بات پر اصرار نہ کرتے کہ اُن کے مطالبات نقد سونے کی شکل میں ادا ہوں فرانس اور بلجیم کو در حقیقت جو چیز مطلوب تھی وہ سونے کی غیر ضروری مقدار نہیں بلکہ اپنے تباہ شدہ علاقوں کی دوبارہ تعمیر تھی - ایسی حالت میں کیا یہ بات زیادہ قرین عقل نہ تھی کہ تاوان جنگ کا حساب مارک ' فرانک یا پونڈ میں کرنے کی بجائے جرمنی کو اس بات پر مجبور کیا جاتا کہ وہ متحدین کی نگرانی میں اپنے مزدوروں اور اپنے مال و اسباب سے تمام تباہ شدہ علاقوں کی تعمیر کر دے - جرمنی سے اس قسم کا تاوان فوراً وصول کیا جاسکتا تھا کیونکہ اُس کے پاس نہ مزدوروں کی کمی تھی اور نہ اشیائے تعمیر کی - قابل ستائش ہیں فرانس کے وہ مزدور جنہوں نے بے مثل فراخدلی اور متانت سے کام لیکر اپنے مشہور ادارے کے توسط سے حکومت پر پورا زور ڈالا کہ وہ تاوان وصول کرنے کا یہی قرین عقل طریقہ اختیار کرے - لیکن فرانس کے پیٹ بھرے سرمایہ دار یہ کیونکر گوارا کرسکتے تھے کہ دوسروں کی تباہی سے روپیہ کمانے کا یہ زریں موقع اُن کے ہاتھ سے نکلجائے - جرمنی سے عام تنفر کی حالت کا اقتضاء ہی یہ تھا کہ متانت اور معقولیت کو شکست اور تنگدلی اور بے عقلی کو فروغ ہو - مختصر یہ کہ کانفرنسیں ہوئیں ' کمیشن مقرر ہوئے ' کمیٹیاں بیٹھیں اور برخاست ہوئیں ' لیکن جرمنی سے اُس کی حقیقی قابلیت سے زیادہ ایک پائی وصول نہ کیجاسکی - اولاً کچھہ مدت تک تو جرمنی کا تاوان جنگ دنیا کے دوسرے ممالک

کے باشندوں نے ادا کیا - مثلاً جرمن مارک کی قیمت گرتی دیکھکر خود ہمارے ملک میں ہزاروں اشخاص نے اپنا روپیہ جرمنی کے حوالہ کردیا یا یوں کہئیے کہ جرمنی کے توسط سے اُس کے قرضخواہوں کی نذر کردیا - بعد ازاں جب جرمنی نے سابقہ زر کو منسوخ کرکے جدید زر معیارطلاء کے اُصول پر جاری کیا اور جرمن مارک میں استقامت پیدا ہوئی تو دوسرے ممالک اور خاصکر ریاستہائے متحدہ سے قرضہ لیکر تاوان کی ادائی ہوتی رہی - لیکن جب بعض اور وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر آئندہ آئیگا ' ریاستہائے متحدہ سے مزید قرضے حاصل کرنے کا امکان جاتا رہا تو حالت بگڑنی شروع ہوئی - کچھہ دنوں تک برطانیہ نے مدد دی لیکن جب خود برطانیہ کی مالی حالت کی طرف سے بے اطمینانی پھیلی تو اِس حیران کن سلسلے کے اور جاری رہنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ' حتیٰ کہ گذشتہ سال لوزان کانفرنس میں متحدین کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تاوان سے دست بردار ہوجانا پڑا - نتیجہ وہی ہوا جو اس طرز عمل کی بدولت ہونا چاہئیے تھا لیکن اس اثناء میں ایک طرف تو جرمنی میں سخت تباہی پھیلی ' اور اِسٹریزے مان اور برونگ جیسے مدبرین کی جگہہ گوئرنگ اور ہر ہٹلر جیسے اشخاص نے حاصل کی اور دوسری طرف معیارطلاء کابین‌الاقوامی انتظام جس پر ساری دنیا کی تجارت خارجہ کا مدار تھا ' ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا -

تاوان جنگ کے سلسلے میں خود متحدین کے باہمی جنگی قرضوں کا مختصر ذکر بھی ضروری ہے - صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف جرمنی ' آسٹریا ' ہنگری اور بلگیریا سے تاوان جنگ وصول ہوتا ہے اور جن ممالک کو یہ تاوان وصول طلب ہے وہ برطانیہ ' فرانس ' اٹلی ' جاپان ' بلجیم ' زیکو سلواکیا ' رومانیا ' یوگو سلاویا ' یونان ' پرتگال ' اور برطانوی نوآبادیات ہیں - دوسری طرف تاوان جنگ کے یہ تمام

امیدوار خود یا تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے قرضدار ہیں یا برطانیہ عظمی کے یا اکثر و بیشتر صورتوں میں دونوں کے - اب اِن جنگی قرضوں کی بھی وہی نوعیت ہے جو تاوان جنگ کی ہے یعنی یہ قرضے پیدا آور اغراض کے لئے نہیں لئے گئے تھے ' بلکہ اِسی کرۂ ارض کے خاص خاص حصوں پر بسنے والوں کو ہلاک اور اُن کے املاک کو تباہ کرنے کے سامان فراہم کرنے کے لئے حاصل کئے گئے تھے - ظاہر ہے کہ تاوان کی رقوم کی طرح ان کا بار بھی براہ راست قرضدار ممالک کے مالیات پر پڑتا ہے - جنہیں بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ ایک طرف تو اپنے اپنے باشندوں پر خوب ٹیکس لگاکر اُن کی ادائی کی سبیل نکالیں اور دوسری طرف حتی الوسع اِس بات کی کوشش کریں کہ اپنا مال روز افزوں مقداروں میں دوسرے ممالک کے ہاتھہ فروخت کریں لیکن دوسرے ممالک کا مال حتی الوسع اپنے ملک میں نہ آنے دیں ' تاکہ اس طور پر جو ماحصل زائد سونے کی شکل میں حاصل ہو اُس سے اپنے قرضے ادا کر سکیں - لیکن جب ہر ملک بیچنا چاہے اور کوئی خریدنا نہ چاہے تو اس سے ماحصل زائد تو دستیاب نہ ہوگا ' البتہ مدبرین سیاست کے تدبر کا ایک دلچسپ منظر ضرور پیش نظر ہوجائیگا - تاوان جنگ کی دوسری خصوصیات بھی متحدین کے ان باہمی قرضوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں یعنی وہ اندرونی نہیں بلکہ خارجی قرضے ہیں اور اِسوجہ سے منتقلی رقوم کا عقدۂ لاینحل اور خارجی غیر پیدا آور قرضوں کی دوسری خرابیاں یہاں بھی نمایاں ہیں' تیسرے یہ کہ قیمتوں کی تخفیف کیوجہ سے ادا کرنےوالے ممالک کے حق میں یہ قرضے بھی بہت بڑا بار ہوگئے ہیں -

تاوان جنگ اور جنگی قرضوں کے متعلق ' ہمارے اِس تمام اِستدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ آجکل مہذب دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک کثیر غیر پیدا آور قرضوں میں مبتلا ہیں - اِن میں سے بعض صرف قرضدار ہیں'

بعض صرف قرضخواہ اور اکثر قرضدار بھی ہیں اور قرضخواہ بھی - چونکہ یہ تمام قرضے صرف غیر پیداآور کاموں میں صرف ہوئے ہیں اسلئے ادا کرنے والوں کے حق میں وہ بہت بڑا بار ہوگئے ہیں - خصوصاً جب سے تجارت خارجہ والی اشیاء کی قیمتوں میں تخفیف ہوگئی ہے اُنکا بار بالکل ناقابل برداشت ہو گیا ہے - تاوان جنگ اور جنگی قرضے ادا کرنے کی فکر میں ہر مُلک یہ کوشش کر رہا ہے کہ اپنا مال تو فروخت کرے لیکن دوسروں کا مال نہ خریدے - نتیجہ یہ کہ کسیکا مال فروخت نہیں ہو رہا ہے - اگر ہر ملک کے اثاثے اور ذمہ داریوں کا حساب کیا جائے تو صرف دو ملک ایسے باقی رہتے ہیں جنہیں بحیثیت مجموعی کثیر رقمیں واجب الوصول رہتی ہیں : ایک ریاستہائےمتحدہ دوسرے فرانس - نتیجہ یہ کہ جیسے ہی قرضے ادا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے دوسرے ممالک سے سونا نکل نکلکر اِن دو ملکوں میں جمع ہونے لگتا ہے - اور اِسکی وجہ سے بین الاقوامی انتظامات زر میں سخت پیچیدگی اور ناقابل حل مشکلات پیدا ہوجاتی ہیں اور جیسے جیسے یہ پیچیدگیاں اور مشکلات بڑھتی جاتی ہیں، قرضداروں کی مالی حالت اور تباہ ہوتی جاتی ہے اور وہ اپنے قرضے ادا کرنے کے اور ناقابل بنتے جاتے ہیں - ان حالات میں اِصلاح کی بجز اِسکے اور کیا تدبیر ہوسکتی ہے کہ ان تمام غیر پیدا آور قرضوں کا یک لخت خاتمہ کردیا جائے، عام ازیں کہ وہ تاوان کی شکل میں ہوں یا جنگی قرضوں کی شکل میں ؟ تاوان کی حد تک تو یہ تدبیر بصد جبر و اکراہ اور بہ دقت تمام اختیار کیجا چکی ہے - رہے جنگی قرضے، تو اکثر ملکوں نے اُس کے ادا کرنے سے انکار کردیا ہے، جنمیں سب سے نمایاں مثال فرانس کی ہے - برطانیہ بھی اُن کے ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہے اور اِس بارے میں ریاستہائے متحدہ سے گفت و شنید جاری ہے - حالات و قرائن صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ تاوان جنگ کی طرح یہ جنگی قرضے بھی بہت جلد بین الاقوامی سیاسیات سے نا پید ہو جائینگے -

اردو کا پہلا رسالہ

از محمد اظہارالحسن - بی - اے ' ایل ' ایل بی (علیگ)

جنوری سنہ ۱۹۳۳ع کے " ہندستانی " - میں میلے " اردو کا ایک قدیم رسالہ " کے عنوان سے " خیر خواہ ہند " کی ایک اشاعت کا ذکر کیا تھا اور ادارہ کی جانب سے بھی اس کے متعلق ایک تشریحی نوت " تتمہ " کے نام سے شایع ہوا تھا جو غالباً ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے رشحات قلم کا نتیجہ تھا - میرے مضمون اور اس تتمہ میں بعض امور تشنۂ تحقیق تھے -

(۱) آیا " خیر خواہ ہند " اردو کا پہلا ماہانہ رسالہ تھا یا اس سے قبل کوئی اور رسالہ بھی جاری ہو چکا تھا ؟

(۲) گارساں دتاسی نے اپنے تیسرے خطبے (دسمبر ۱۸۵۲ع) میں ماسٹر رام چندر کے متعلق لکھا تھا کہ " یہ پروفیسر دو رسالوں کا ایڈیٹر بھی ہے - ان میں سے ایک خاص طور سے ذکر کے قابل ہے جس کا نام " محب ہند " ہے - یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے جس میں اہم ملکی معاملات پر دیسیوں کی تعلیمی حالت پر اور ہندستانی زبان کی ترقی پر مضامین ہوتے ہیں " - پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کو بھی " محب ہند " کے سات شمارے (بابتہ ۱۸۴۹ ' ۱۸۵۰ع) دستیاب ہوئے ہیں اور موصوف کا خیال ہے کہ " یہ رسالہ جون ۱۸۴۷ع سے نکلنا شروع ہوا " - دتاسی نے " خیر خواہ ہند " کا ذکر نہیں کیا اور " محب ہند " کے علاوہ جو دوسرا رسالہ ماسٹر رام چندر نکالتے تھے اس کا بھی نام نہیں لیا - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرا رسالہ " خیر خواہ ہند " ہی تو نہیں تھا ؟

ان تمام امور پر "مخزن" مرحوم کي ایک اشاعت سے روشنی پڑتی ہے - مئی ۱۹۰۹ع کے پرچہ میں ایک صاحب انعام الحق حقی دهلوی بی اے نے " خیر خواہ ہند " کے اکتوبر ۱۸۴۷ع والے نمبر کا مضمون ' تربیت اهل هند کے بیان میں " اپنی تمهید کے ساتھ " پراني چاشنی " کے عنوان سے شایع کرایا تھا - حسن اتفاق سے مجھے بھی " خیر خواہ هند " کا یہی پرچہ دستیاب ہوا ' چنانچہ جنوری سنہ ۱۹۳۳ع کے " هندستاني " میں اسي کا ذکر کیا گیا تھا اور اسی مضمون کے اقتباسات دئے گئے تھے - بہر حال حقی صاحب اپني تمہید میں فرماتے هیں -

" انیس سو ایک یا دو ٹھیک یاد نہیں مگر اسي زمانہ میں دلي میں ایک مجلد تھوڑي سی دیر کے لئے میرے ہاتھہ لگ گیا تھا - صرف یہي ایک مضمون نقل کر سکا مگر چونکہ اردو ناگری کا جھگڑا اس وقت در پیش تھا اس کا چھپوانا مناسب نہ معلوم ہوا اس وقت سے اب تک یونہي بلکہ مجھسے دور پڑا رہا - یہ مضمون دهلي کے رسالہ " خیرخواہ هند " میں جو دهلی کیا سارے هندوستان میں سب سے پہلا اُردو کا رسالہ تھا اکتوبر ۱۸۴۷ع میں شایع ہوا تھا - گویا آج سے باسٹھہ برس پہلے - میرا اس وقت کا علم یہ تھا کہ یہ مضمون مولوی محمد حسین آزاد کے والد کا ہے مگر اس وقت مطلق یاد نہیں کہ کس سے سنا تھا - شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب کي زباني یہ ہے اور ان کي رائے جو وہ ذاتی علم و یقین کی طرح بیان کرتے ہیں وثوق کے لایق ہے کہ " خیر خواہ هند " پہلا رسالہ ہے جو اردو زبان میں پروفیسر رام چندر نے نکالا تھا - وهي اس مضمون کے مصنف تھے - ان کی عادت تھی کہ وہ خود کوئی مضمون اپنے قلم سے

نہیں لکھتے تھے مگر ان کے طلبا جو عربی کی اول جماعت کے تھے وہ جو کہتے جاتے اس کو لکھتے جاتے - اس رسالہ میں اکثر مضامین ان کے اس طرح کے لکھوائے ہوئے ہیں - یہ مضمون انہی کا ہے " - تو گویا اب یہ ثابت ہے کہ یہ مضمون پروفیسر رام چندر کا ہے جو دھلی کے ایک مشہور عالم سمجھے گئے ہیں اور ان کے کمالات کا دلچسپ نمونہ ہے " -

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ' اردو کے جن قدیم ماہانہ رسایل کا علم اب تک حاصل ہو چکا ہے ان میں یہ نمبر قدیم ترین ہے ' - مولوی ذکاء اللہ کے اس بیان کے بعد اس رائے کی صحت میں کوئی شبہ نہیں رہتا - مولوی صاحب پروفیسر رام چندر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور یقیناً اس مسئلہ پر ان کا بیان قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اور اب یہ امر طے سمجھنا چاہئے کہ اردو کا پہلا اخبار مولوی محمد باقر نے دھلی سے ۱۸۳۶ع میں نکالا اور اردو کا پہلا ماہانہ رسالہ پروفیسر رام چندر نے مولوی محمد باقر کے مکان سے شایع کیا - اخبار کے لئے شمس العلما مولانا آزاد کی سند ہمارے پاس ہے اور رسالہ کے لیے شمس العلما مولانا ذکاءاللہ کی -

مضمون کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے " اول جلد اس رسالہ میں کچھ حال طریقہ تربیت کا جو ہندوستان میں قدیم سے آج تک جاری ہے بیان کیا ہے اب ہم وہ طریقہ تربیت کا جو انگریزوں نے واسطے فائدۂ خلق ہند کے جاری کیا ہے بیان کرتے ہیں " - اس کے متعلق حقی صاحب ایک فٹ نوٹ میں فرماتے ہیں -

" اس رسالہ کا پہلا نام " خیر خواہ ہند " تھا پھر اس کا نام بدل کر "محب ہند " رکھا گیا پہلی جلد اس رسالہ کی ماہ ستمبر ۱۸۴۷ع

کی تھی جس میں ' باعث کم شیوع ہونے علوم مفیدہ کا ہندستان میں ' کے عنوان سے ایک بسیط اور کار آمد مضمون ہے - یہاں اسی مضمون کا حوالہ ہے'' -

اس فٹ نوٹ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں - ایک تو یہ کہ پروفیسر رام چندر جلد کو اس معنی میں استعمال کرتے تھے جس میں آج کل نمبر یا شمارہ استعمال ہوتا ہے اور اس لئے یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ ''خیر خواہ ہند'' پہلے پہل ستمبر سنہ ۱۸۴۷ع میں نکلا یعنی اردو میں ماہانہ رسالہ اخبار سے گیارہ سال بعد جاری ہونا شروع ہوا - معلوم ہوتا ہے کہ حقی صاحب نے ستمبر ۱۸۴۷ع کی اشاعت بھی دیکھی تھی -

دوسرا یہ امر بھی طے ہو جاتا ہے کہ ''محب ہند'' ''خیرخواہ ہند'' کا بدلا ہوا نام تھا - اسی لئے غالباً دتاسی نے ''خیرخواہ ہند'' کا ذکر نہیں کیا - دتاسی نے ''محب ہند'' میں جس قسم کے مضامین کا شایع ہونا بیان کیا ہے اس قسم کے مضامین ''خیرخواہ ہند'' میں پائے جاتے ہیں - کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ پروفیسر رامچندر ایک ہی قسم کے دو رسالے جن کے نام بھی اتنے قریب المعنی ہوں کیوں نکالتے - اس لئے حقی صاحب کا بیان قابل قبول نظر آتا ہے اور گو انہوں نے تحریر نہیں فرمایا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ بھی بیان شمس العلما مولانا ذکاالله ہی کی اطلاع پر مبنی ہے جن سے مسلمہ طور پر اس موضوع پر ان کی گفتگو ہوئی تھی جس طرح میر تقی میر کی وجہ سے سوز نے اپنا تخلص بدل لیا تھا شاید اسی طرح مرزا پور والے ''خیرخواہ ہند'' کی وجہ سے پروفیسر رامچندر نے اپنے رسالہ کا نام بدل کر ''محب ہند'' کردیا جو قریب قریب ہم معنی ہے - پلنت کیمی کے اس خیال میں کہ محب ہند جون ۱۸۴۷ع سے نکلنا شروع ہوا تھا خفیف سی غلطی ہوسکتی ہے - جون اور ستمبر میں صرف تین ہی مہینہ کا فرق ہے -

تبصرے

"ریاست"— مترجمۂ ڈاکٹر ذاکر حسین خان ایم - اے ' پی ایچ - ڈی
شیخ الجامعہ ' جامعیہ ملیہ اسلامیہ دھلی -
(از ڈاکٹر تارا چند ' ایم - اے ' ڈی - فل)

افلاطون ۴۲۷ ق - م میں پیدا ہوا اور اَسّي (۸۰) سال کی عمر میں اس نے وفات پائی - وہ ابتدائے شباب میں غالباً اپنے شہر کے سیاسی معاملات میں حصہ لینے کي خواهش رکھتا تھا ' لیکن حالات نے موافقت نہ کی اور وہ ایتھنز کے سیاسی تگ ودو میں شریک نہ ہوسکا - میدان عمل میں اُسے کامیابی ہوتی یا نہ ہوتی اس کا فیصلہ دشوار ھے ' لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دنیائے تخیل میں اس کا نام آفتاب کی طرح درخشاں ھے اور ہمیشہ درخشاں رھے گا - یورپ کے فلسفے کی تاریخ اس کے عالمگیر اثر کی شاھد ھے - شاید ھی کوئی زمانہ ایسا گذرا ھو جب کہ افلاطون کے خیالات کی صحیح یا غلط تعبیر اُس دور کے تخیلی تعمیر و تشکیل کے بنیادی اصولوں میں کار فرما نہ رھی ھو - ارسطو تو افلاطون کا شاگرد ھی تھا لیکن روما کے سٹوک ' اسکندریہ کا پلوٹائی نس ' زمانۂ متوسط کے فلسفی ' پندرھویں صدي میں فلارنس اور سترھویں میں کیمبرج کے حکما بھی اسی کے پیرو تھے -

جرمنی میں ھیگل اور انگلستان میں بریڈلے اور بوسن کوٹ اسی کے مقلدوں میں سے ھیں - یہی نہیں بلکہ عیسائی الٰہیات اور عربي فلسفہ پر بھی اسی کی مہر لگی ہوئی ھے - آج یورپ میں ھر

فلسفی خواہ وہ افلاطون کا ہم مذہب ہے یا نہیں اس کا دم بھرتا ہے - ان میں سے ایک کا قول ہے کہ " افلاطون کی صحیح تعبیر ہی سچا فلسفہ ہے اور افلاطون کی غلط تعبیر جھوٹا فلسفہ " -

افلاطون کی تصانیف کا سلسلہ ۳۸۸ ق-م میں شروع ہوا اور مرتے دم تک جاری رہا - چالیس سال کے عرصہ میں اس نے بہت سی کتابیں لکھیں اور فلسفہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی - لیکن یہ بڑی غلط فہمی ہوگی اگر افلاطون کو ایک خشک فلسفی یا عالم بے عمل سمجھا جائے - وہ ایک ریفارمر تھا جس کے زخم رسیدہ اور درد مند دل میں انسانوں کو سنوارنے کی زبردست خواهش تھی - جب وہ پیدا ہوا تو اس کا وطن اپنے پرانے حریف سپارٹا سے جنگ میں مشغول تھا اور اس کی جوانی اسی جنگ کی هیبت ناک فضا میں کٹی - اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے وطن کی ذلت دیکھی - ایتھنز کو پس پا ہوتے دیکھا اور برسوں کی بنی بنائی سلطنت کو اُجڑتے دیکھا - قوم کی حالت خراب ہو رہی تھی اس کے رهبروں کی ملکی تدابیر میں خود غرضی اور انانیت شامل تھی ' قومی مزاج میں سنجیدگی اور تحمل کم اور تلون بڑھ رہا تھا - دولت اور سلطنت نے انسانوں کو دنیوی کامیابی کا متوالا بنا دیا تھا ' پرانے رسم و رواج ٹوٹ رہے تھے ' مذهبی عقیدوں کی بنیادیں کمزور ہوگئی تھیں ' نیک و بد کی تمیز شخصی پسند کے ساتھ وابستہ ہو رہی تھی - اخلاقی زندگی تو یوں ڈانواں ڈول تھی ' سیاسیات کی حالت یہ تھی کہ تیس برس کے عرصہ میں تین مرتبہ ریاست کا نقشہ بدلا - جنگ کی ابتداء کے وقت ایتھنز میں جمہوری ریاست تھی ' عنان حکومت عوام کے هاتھوں میں تھی - ایتھنز کا ہر باشندہ خواہ امیر ہو یا غریب پڑھا لکھا ہو یا جاهل ' مجلس مقننہ کا ممبر اور عدالت کارکن تھا '

وہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ کے لئے منتخب ہوسکتا تھا - جنگ کے بیسویں برس اس دولت عامہ کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہہ چندسری حکومت قائم کردی گئی جو خود چند مہینوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی - اس انقلاب کے سات برس بعد جنگ کے خاتمہ پر ایتھنز خانہ جنگی کا شکار ہوا ' حکومت کی باگ تیس آدمیوں کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی - انہوں نے ہر طرح کا تشدّد کیا اور جمہوریت کے طرفداروں کو سخت سزائیں دیں - لیکن سال دو سال سے زیادہ یہ بھی نہ چلی - اور آخرکار دو زبردست دھکّے سہنے کے بعد جمہوریت کا نیا دور شروع ہوا - نئی ریاست کے کارناموں نے افلاطون کے دل و دماغ میں شدید تلاطم بپا کردیا - ان میں سے خاص طور پر جمہوری عدالت کے اُس غیر منصفانہ فیصلے نے جس کی وجہ سے افلاطون کے اُستاد سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا - ان کارناموں نے یہ ثابت کر دیا کہ جمہوریت عدل کی مترادف نہیں ہے اور یہ ممکن ہے کہ جمہور سراسیمگی اور خوف سے مغلوب ہوکر سقراط جیسے دانشمند ' فرشتہ خصلت اور نیک سیرت انسان پر موت کا حکم صادر کردے -

اخلاقی اور سیاسی ہیجان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انسانی ذہن انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اصولوں کی تحقیق کی جانب متوجہ ہو - افلاطون کی پیدائش سے پہلے یونانی حکماء میں سوفسطائیوں نے ان مسئلوں پر کچھہ غور کیا تھا - لیکن ان کے نظریوں کی کیفیت وہی ہے جو اس مسافر کے بیانات کی ہوتی ہے جو پہلی مرتبہ کسی ملک میں داخل ہوکر اس کے حالات کا مشاہدہ کرتا ہے - ان کا غیر مربوط فلسفہ انسان کے احساس کی کمزور بنیادوں پر قائم ہوا - اور انہوں نے نیک و بد کی تمیز اور حق و علم کا تعین حواس خمسہ کی شہادت پر ٹھہرایا -

ان خیالات کی تہ میں جو فلسفہ پوشیدہ ہے اس کو سقراط اور اس کے شاگرد افلاطون نے انسان کے علمی اور عملی زندگی کے لئے سم قاتل سمجھا - یہ ظاہر ہے کہ جس فلسفہ کا انحصار محسوسات پر ہو وہ تلون اور تعیش کو زندگی کا مطمح نظر، نیکی کو حواس کی سیری اور علم و حق کی تلاش کو سعی لا حاصل قرار دیگا - یہ فلسفہ نہ صرف خود انسان کو زندگی کی اندھیری رات میں بلا شمع ہدایت کے اِدھر اُدھر بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے بلکہ قومی زندگی کو انانیت اور خود غرضی کے سپرد کر دیتا ہے - قوم اور فرد دونوں کی بھلائی کے لحاظ سے اس کی تردید امر ضروری ہے - افلاطون کی زندگی کا اصلی مقصد یہی تھا کہ سوفسطائیت کا مقابلہ کرے اور عمل کی راہ میں جو رکاوٹیں انسانی کوتاہ نظری کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں انھیں دور کرے -

گو افلاطون کی وفات کو قریب ۲۲۰۰ برس گذر گئے لیکن اس کے فلسفیانہ اصول بیسویں صدی کے لئے اتنے ہی کارآمد اور مفید ہیں، جتنے کہ وہ ۲۲ صدی پہلے تھے - آج بھی دنیا میں سوفسطائیت کی ذہنی قوتیں انسان کی زندگی کو راہ مستقیم سے دور ہٹانے میں سر گرم اور کوشاں ہیں - اسی لئے آج تہذیب اور تمدن کا مستقبل ڈگمگاتا نظر آتا ہے - دنیا کے ہر براعظم میں آدمیوں اور گروہوں کے سامنے وہی پرانے سوال زیادہ مہیب صورت اختیار کئے کھڑے ہیں اور جواب کے طالب ہیں - ایسی حالت میں اگر کوئی چیز واقعی دنیا کو خطرناک مستقبل سے بچاکر محفوظ اور پر امن راستے پر چلا سکتی ہے تو وہ انسانی زندگی کے اصلی اور اٹل اصولوں کا واسع اور پختہ علم اور ان پر عمل ہے - افلاطون کے فلسفہ کا مطالعہ یقینی اُن اصولوں کی طرف ہماری توجہ کو مائل کرتا ہے -

افلاطوں کے فلسفہ کی تہ میں جو اصول کار فرما ہے وہ اس کا مشہور نظریۂ تخیلی یا مثالی ہے - اِس نظرئے کا خلاصہ یہ ہے کہ اضافی علم کے اس عالم ظہور کے پس پشت ایک حقیقی عالم ہے جو تعقل کا محصول ہے -

اول الذکر عالم جسمانی ' حسّی ' متغیر ' کثیر ' ظلی اور حادث ہے - دوسرا عالم ' غیر مادی ' عقلی ' غیر متغیر ' مجرد ' حقیقی اور اصلی ہے - اول الذکر کا دوسرے سے تعلق وہ ہے جو اصل کو سائے سے ہے - عالم طبیعی ' اس تخیلی یا مثالی عالم کی نقل ہے - لیکن یہ عالم مظاہر ' عالم مثال کی بنیاد پر قائم ہے - عالم مثال انجام اور مقصود کی حیثیت رکھتا ہے اور عالم فطرت کی علت غائی ہے - عالم مثال علم مطلق کا موضوع ہے اس وجہ سے کہ علم اضافی کا تعلق محسوسات سے ہے اور علم مطلق کا تخیل سے - عالم مثال میں ہی عالم مظاہر کی تکمیل ہوتی ہے - تمام قدرتی مناظر اس تخیلی یا مثالی عالم سے اپنا جوہر اور اپنی قوت حاصل کرتے ہیں - فطرت کی ہر شے ترقی پذیر ہے اس ترقی کا رجحان ایک منزل مقصود یا کمال کی جانب ہے - دوسرے لفظوں میں یہ کمال خیر محض ہے - اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیر محض ' ہر شے کی نشو و نما میں پوشیدہ اور ساری ہے اور ہر شے کی علت و تشریح ہے - فطرتی اشیاء کا علم اُن کی تخیل پر منحصر ہے ' تخیل کسی شے کا کمال یا خیر اضافی ہے - خیر محض تمام اضافی خیروں کا مرکز واحد اور مجموعہ ہے - اس طرح خیر محض علم کا بنیادی اصول اور خیالات کا ربط ہے اس لئے اشیاء کی تشریح پر منحصر ہے -

انسانی زندگی انہیں دونوں عالم پر مشتمل ہے - دنیائے ظاہر اور دنیائے حقیقت ' دنیائے حواس ' اور دنیائے تعقل ' خواہش اور علم - فطرت انسانی کے بھی اسی طرح دو پہلو ہیں - عقلی و غیر عقلی

انسان کے غیر عقلی پہلو کے پھر دو حصے ہیں ' ارادہ اور اشتہا ۔ اس طرح انسان کی روح کے تین حصے ٹھیرتے ہیں استدلال ' ارادہ اور اشتہا ۔

چونکہ تمام چیزیں خیر اور کمال کیطرف حرکت میں ہیں جو اُن کا پنہاں مفہوم و مقصود ہے اس لئے انسان بھی اُسی طرف گرم عناں ہے ۔ کمال تک رسائی نوع انسانی کا انجام و منتہیٰ ہے اور اس کا کمال اس کی روح کی خوبی ۔ چنانچہ استدلال کی خوبی عقلمندی ' ارادے کی جرائت اور اشتہا کی اعتدال ہے ۔ اس لئے انسانی کمال کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عقلمندی ' جرائت و اعتدال یا انضباط نفس کا حامل ہو ' اس طرح روح کے ہر سہ حصوں میں ہم آہنگی یعنی عدل پیدا ہو جو نیکی کا بلند ترین مقام ہے ۔

لیکن انسان تنہا اور مجرد فرد نہیں ہے ۔ اس کی زندگی کا مدار جماعت پر ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ فرد ایک شے واحد ہے اور انفرادیت اور اجتماعیت در اصل اُسی ایک حقیقت کے دو لازم و ملزوم پہلو ہیں ۔ لہذا انسان کی تکمیل بغیر جماعت کے وجود کے ناقابل تصور ہے کیونکہ افلاطون کے الفاظ میں " جماعت ' فردیت کی ایک وسیع شکل ہے " ۔ خیر محض کی طرف ترقی کا اصول جو ایک انسان پر صادق آتا ہے وہ اس کے انفرادی اور جماعتی دونوں حیثیتوں پر صادق آتا ہے ۔

افلاطون کی کتاب ریپبلک جس کا ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کیا ہے وہ انسان کے دونوں پہلوؤں سے بحث کرتی ہے ۔ لیکن ریپبلک جماعتی علم یا عمرانیات پر ایک عام بحث نہیں ہے ۔ یہ در اصل فلسفے کی ایسی ایک اعلیٰ ترین کتاب ہے جیسی اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی جاسکی ہے ۔ اخلاقیات ' نفسیات ؛ مابعدالطبیعیات ' طبعیات ' تعلیمات ' حسن کاری ' مذہبیات ' سیاسیات غرضکہ سبھی کچھ اس میں

موجود ھے - اس کا موضوع مصنف کے الفاظ میں یہ ھے کہ " اس امر کو تسلیم کرکے کہ سب سے اچھا اور سب سے برا آدمي کون ھے ' ھم اس امر کو سمجھیں کہ آیا سب سے اچھا آدمی سب سے زیادہ مسرور اور سب سے زیادہ برا آدمی سب سے زیادہ محزوں ھے یا نہیں " -

ریپبلک میں جو بنیادي بحث اتھائی گئی ھے وہ نظام حکومت سے متعلق نہیں بلکہ راستبازی سے متعلق ھے - انسان کي روح کی منزل مقصود دوامي امن و طمانینت ھے ' سوال یہ ھے کہ وہ کیونکر حاصل ھو - افلاطوں کا جواب یہ ھے کہ کوئی ادمی تنہا زندگي بسر نہیں کرتا ' اور اس لئے وہ جب تک اپني پوری جماعت کے لئے نجات نہ حاصل کرے اپنے لئے تنہا نجات نہیں حاصل کر سکتا - یہ سوال اس کتاب کے تمہیدی جملوں میں اُتھایا گیا ھے اور اس کا خاتمہ موزوں طور پر تشریح انصاف کے تصوّر پر ھوتا ھے -

ریپبلک جو دس دفتروں پر مشتمل ھے پانچ حصوں میں منقسم ھے - پہلے حصے میں جس میں دفتر اول اور کچھہ دفتر دوم کا جزو ھے اصل موضوع کا تعارف کرایا گیا ھے اور دکھایا گیا ھے کہ اخلاق ' انسان کی باطنی زندگی ھے - دوسرے حصے میں جو دوسرے تیسرے اور چوتھے دفتروں پر مشتمل ھے ' جماعت کے اعلیٰ تریں نظام کا بیان ھے اور دکھایا گیا ھے کہ جماعت کا خارجی نظام ' فرد کے باطنی زندگی کا عکس اور ظل ھے - دوسرے لفظوں میں جماعت کا مفہوم ایک ایسے گروہ (اجتماع) سے ھے جس میں انسان کی فطرت کا ھر عنصر اپنے نمود و اظہار کے لئے مناسب جگہہ حاصل کر سکے - تیسرے حصے میں جو پانچویں ' چھٹے ' ساتویں آتھویں دفتر پر مشتمل ھے ' جماعت کے معیاری نظام حاصل کرنے کے لئے وسائل اور ذرایع سے بحث کی گئی ھے اور یہ دکھایا گیا ھے کہ

جماعت کی تکمیل کا انحصار ' حصول علم پر ھے ' اور اس لئے اس کا انحصار حکماء کي حکومت پر ھے - چوتھے حصے میں آٹھویں اور نویں دفتر شامل ھیں اس میں اعلیٰ ترین جماعت کا مصرف بیان کیا گیا ھے اور اُن منازل کي تشریح کی گئی ھے جن سے فرد اور جماعت برائی کیطرف مائل ھونے لگتی ھے - پانچویں حصے میں جو دسواں دفتر ھے ' حسن کاری ' شاعري اور مرنے کے بعد روح کے انجام سے بحث کی گئی ھے -

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں یقیناً تحسین وستائش کے مستحق ھیں کہ انھوں نے ایسی عظیم‌الشان کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا اور خصوصاً ایسے موقع پر - کیونکہ آج کل هندستان بیحد مبتلائے آلام ھے ' اس نے مسرت کا حقیقی مفہوم کھو دیا ھے ' اس کے فرزند آج کل مصنوعی اور سطحی قسم کی مسرت و کامیابي کی تلاش میں دیوانے ھو رھے ھیں - اس لئے قدرتی طور پر حقیقی مسرت سے وہ محروم ھیں - اس کے علاوہ ھم لوگوں نے اپنے سامنے یہ اصول پیش نظر رکھا ھے کہ آدمی ھی ھر شے کا پیمانہ ھے - اس لئے ھم لوگ ایک فریب نظر سے دوسرے فریب نظر میں مبتلا ھوتے رھتے ھیں اور جماعت اس کی صداقت و حقیقت تک پھونچنے میں ناکام رھتی ھے - ھم لوگ عکس و سایہ ھیں اور عکس و سایہ ھی کے طرح رہ جاتے ھیں اور یہی اصلی سبب ھماری مسرتوں اور قوتوں کی ناکامی کا ھے -

افلاطون کے ریپبلک کا مطالعہ اور اس کا ھماری زبان میں ترجمہ ایک مخصوص واقعہ ھے - اور اس سے هندستانیوں کی خود شناسی کے باب میں ایک منزل معین پر پھونچنے کے علامات پائے جاتے ھیں -

ترجمہ کے بارے میں ' میں یہ کھونگا کہ یہ یقیناً تعریف کا مستحق ھے - یہ صحیح ھے کہ فاضل مترجم نے بجائے اصل یونانی

زبان کی کتاب کے اس کے انگریزی ترجمے سے اردو میں ترجمہ کیا ہے ' لیکن یہ کوئی بہت بڑی کمی نہیں ہے - جاوٹ کا انگریزی ترجمہ جو اس ترجمے کا اصل ہے وہ یونانی زبان کی کتاب کا بہترین ترجمہ ہے - افلاطون کے نظریوں کی جو تشریح و تفسیر جاوٹ نے کی ہے زمانے نے اس پر ابھی تک کوئی مزید ترقی بھی نہیں کی -

کتاب کے نام کے ترجمے میں بلکہ تمام مکالمے کے ترجمے میں مترجم کو یقیناً بہت دقت ہوئی ہوگی - یونانی میں کتاب کا نام پولیٹیا (Politaia) ہے جس کا انگریزی میں لاطینی انداز سے ریپبلک ترجمہ کیا گیا ہے آخرالذکر لفظ کے معنی "دولت عامہ" کے ہیں - اردو کا لفظ "ریاست" اُس مفہوم سے بہت دور ہے - "دولت" غالباً اس کا قریب ترین مفہوم ہوسکتا تھا - اس لئے کہ ' اس کے واحد و جمع "دول" اور "دولت" اب بھی ریاست کے معنوں میں استعمال کئے جاتے ہیں - لیکن یہ اصطلاح ' " اقتصادیات " کے نقطۂ نظر سے بہتر اور معروف تر مفہوم کی حامل ہے - سلطنت ' حکومت ' مملکت ' طاقت اور اس نوع کے دوسرے الفاظ یکساں طور پر غیر مناسب ہیں - لیکن لفظ ریاست میں دقت یہ ہے کہ اس لفظ سے بجائے حکومت خود اختیاری و جمہوری کے حکومت شخصی و شاہی کی جانب اشارہ ہوتا ہے - شاید ہندستانی لفظ سوراج اور لنظوں کے مقابلے میں مفہوم سے قریب تر ہے - اس میں شک نہیں کہ یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ اس کتاب میں صرف سیاسیات پر بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ اصل اخلاقی اصولوں پر بحث ہے جو سیاسیات اور عمرانیات کی بنیادوں میں کار فرما ہوتے ہیں ' اور اسکا دوسرا نام " عدل " ہے جو اعلیٰ ترین خیر یا راستبازی ہے -

اسی قسم کا خیال Courage, Wisdom, Justice, Virtue
Self Control, Temperence ایسے اصطلاحی الفاظ کے بارے میں بھی
ہوسکتا ہے - ان لفظوں کے ترجمے میں فاضل مترجم نے یکسانی نہیں برتی
ہے - Justice کے لئے دونوں لفظ انصاف اور عدل ' Wisdom کے لئے
حکمت اور عقلمندی ' Courage کے لئے شجاعت ' ہمت اور بہادری '
Temperence کے لئے عفت - Self Control کے لئے ضبط ' اقتدار
علی النفس وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں - یہ تمام الفاظ
اصطلاحی ہیں - اور فلسفیانہ صحت کے لئے انکی اصطلاح معین ہو جانا
چاہئے تھی -

فلسفے کی اصطلاحات کے مسئلہ کے علاوہ مترجم کے لئے ایک دوسری
دقت یہ ہے کہ ترجمہ ایسا ہو جو پڑھنے میں آسان معلوم ہو - باوجود
اسکے کہ ریپبلک اپنے طرز اظہار میں حیرت انگیز کتاب ہے ' اسکا ترجمہ
کرنا آسان نہیں ہے - افلاطون نے اظہار خیال ' کے لئے جو پیرایۂ بیان
تجویز کیا ہے اس میں بہت روانی ہے جسے پیرایۂ اظہار اور لطافت ادا کا
ماہر ہی انجام دے سکتا ہے - اور افلاطون صرف ایک عظیم المرتبت فلسفی
ہی نہ تھا بلکہ ایک با کمال حسن کار بھی - آزادانہ روش اور روانی
بیان کو ترجمے میں قائم رکھنے میں غیر معمولی دشواری پیش
آتی ہے - مترجم نے اصل کتاب کی خصوصیات کو ترجمے میں مقید
کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے - لیکن متعدد مقامات
ہیں جہاں اسے محض معمولی کامیابی ہوئی ہے -

جب کبھی اسکا دوسرا ایڈیشن نکلے تو ترجمے پر پوری توجہ سے
نظر ثانی کی ضرورت ہوگی - میں یہ بھی تجویز کرونگا کہ اس میں
ذیلی حواشی بھی دئے جائیں - اس میں بہت سی یونانی تلمیحات '

یونانی علم تاریخ و ادب اور علم‌الاصنام کے متعلق بھی ہیں جو بغیر حواشی کے عام پڑھنے والوں کی سمجھہ میں نہ آئینگے - ناموں کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لئے بھی کچھہ اصول ہونا چاہئے ' یا تو یونانی تلفظ کو ہندستانی اصوات کے ساتھہ دینا چاہئے یا انکے جدید انگریزی یا جرمن مترادفات - جن لوگوں نے ان مکالمات میں حصہ لیا ہے انکی شخصیت کے بارے میں بھی کچھہ وضاحت کر دینی چاہئے - یہ بھی ضروری ہے کہ فلسفیانہ اصطلاحات کی واضح طور پر تعریفیں بھی درج کردی جائیں تاکہ اُردو اصطلاحات کا مفہوم جہاں تک ممکن ہو اصل الفاظ سے قریب تر ہو -

آخر میں - میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے انلے مشکل کام کو اس خوبی و کامیابی کے ساتھہ انجام دیا -

---

مرآۃ المثنوی

مرتبۂ قاضی تلمذ حسین صاحب ایم - اے ' رکن دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ -

ملنے کا پتہ :- دائرۃالادب ' حیدر گوڑہ ' حیدرآباد دکن قیمت ١٠ روپیہ -

---

مولانا جلال‌الدین رومی کی مثنوی معنوی ' شعر و حکمت اور اسرارِدینیہ کی جن چند در چند خصوصیات کی حامل ہے وہ محتاج تشریح نہیں - مشرق ' خصوصاً عالم اسلامی کا تو فتوی ہے کہ ع

ہست قرآں در زبان پہلوی

جو تعریف و توصیف کی آخری حد ہے ' مغرب یعنی مسیحی یورپ میں دانتے کی ڈیوائن کومیڈی بھی اسی طرح کا ایک شاہ کار تسلیم کی جاتی ہے جس کا ذکر پروفیسر نکلسن آج اس اعتراف کے ساتھہ کرتے ہیں کہ مولانا کی مثنوی میں جو "بہجت و تلطیف جو وسعت مشرب اور جو روح خیر نظر اتی ہے وہ ڈیوائن کومیڈی کو میسر نہیں"۔

غرض کہ مثنوی چونکہ ادب و حکمت اور حقائق و معارف کا ایک گلدستہ ہے اس لئے ہر زمانے میں لوگوں کو اس سے استفادہ کا شوق رہا ہے اور مختلف طریقوں سے اس کے افادہ کو عام بنانے کی کوشش کی گئی ہے - طرح طرح کے ایڈیشنوں کے علاوہ اگر صرف اس کی شرحوں کا نام گنایا جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہوسکتی ہے ' عام مواعظ میں مثنوی کے قصص و حکایات اور اس کے نکات و لطائف کا مختلف عنوانوں اور تقریبوں سے ذکر ہوتا رہا ہے ' بہر صورت اس سے فیضیاب و متمتع ہونے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ' بایںہمہ عام حلقوں میں ' اکتساب ومطالعہ کا جو صحیح حق ہے وہ خاطرخواہ ادا نہ ہوسکا -

مثنوی کی جو اعلیٰ ترین شرحیں موجود ہیں وہ زیادہ تر شارحین کے تاثرات ہیں اور مثنوی کی طرح خود ایک مستقل چیز بن گئی ہیں ' بعض شرحیں ایسی ہیں جو ایک محدود حلقے کے افہام و تفہیم کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور اس لئے مثنوی کے اصل مفہوم سے اکثر بعد پیدا ہوگیا ہے ' اس قسم کی اصلاحی سعی و کوشش میں حسن نیت کو کتنا ہی دخل کیوں نہ ہو لیکن ظاہر ہے کہ ایسی شرحوں پر مشکل ہی سے شرح کا اطلاق ہوسکتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ حقیقی طور پر مثنوی سے جو افادہ مقصود ہے وہ اصل مثنوی ہی سے ممکن ہے بشرطیکہ اسکے مطالعہ کے لئے معقول آسانیاں بہم پہونچا دیجائیں - اس لئے کہ مولانا نے اپنے ارشادات کو

خود اس قدر آسان اور صاف طریقے سے پیش کر دیا ہے کہ شاید اس سے زاید توضیح و تشریح ممکن نہیں ' لیکن اس کے مطالعہ میں جو دقتیں حائل ہیں وہ یہ ہیں :—

(۱) مثنوی کے پیچ در پیچ قصص و حکایات جن کا سلسلہ بیان اکثر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے -

(۲) قرآن حکیم اور ارشادات نبوی کے اشارات و کنایات -

(۳) تلمیحات جن میں مولانا اپنے بعض معاصرین کی طرف اشارہ فرماتے ہیں -

(۴) فارسی زبان کے بعض الفاظ جو نہ صرف اردو خواں بلکہ بعض فارسی داں ناظرین کے لئے بھی آج نا مانوس ہیں - یہ ہیں وہ دشواریاں جو مثنوی کے مطالعہ میں مزاحم ہیں اور بہ استثنائے چند طالبان فن کے عام طور پر ہر کس و ناکس اس ہفتخواں کو طے کرنے کی ہمت نہیں کرتا ' لیکن مثنوی کو اگر مثنوی ہی سے سمجھنا دیگر وسائل سے اولیٰ تر ہو (اور یقیناً اولیٰ تر ہے) تو ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ قاضی تلمذ حسین صاحب نے مرآۃالمثنوی میں ان تمام دقتوں کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے رفع کر دیا ہے -

مرآۃالمثنوی کی ترتیب یہ ہے کہ شروع میں حضرت برہان‌الدین ولد چلبی موجودہ صاحب سجادہ خاندان مولویہ کے خط کا عکس ہے ' پھر اونہیں کا لکھا ہوا فارسی میں ایک مقدمہ ہے ' جس میں مثنوی اور صاحب مثنوی کے متعلق کچھہ حالات اور خاندانی روایات درج ہیں - اس کے بعد پروفیسر نکلسن کے خط کا عکس ہے پھر اونہیں کا لکھا ہوا ایک سر نامہ ہے ' اس کے بعد مرتب کا دیباچہ ہے جو ۴۰ صفحوں پر جاکر ختم ہوا ہے اب اس

کے بعد اصل مثنوی شروع ہوتی ہے جسکو قاضی صاحب نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے :—

پہلا حصہ یواقیت القصص ہے ، اس میں ضمنی بیانات کو حذف کر کے مثنوی کی کل حکایتیں یکجا کر دیگئی ہیں ، اسطرح چونکہ حکایتوں میں صحیح تسلسل پیدا ہو گیا ہے اس لئے اس کا مطالعہ آسان اور خوشگوار ہو گیا ، یہ حصہ ۵۳۹ صفحہ پر ختم ہوا ہے -

دوسرا حصہ دررالحکم کے نام سے ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے ، اس میں مثنوی کے وہ اشعار ہیں جن میں حقائق و معارف اور مواعظ و حکم بیان کئے گئے ہیں ، بغلی سرخیاں دیکر فلسفہ و تصوف کے اصطلاحات و مسائل بھی واضح کر دئے گئے ہیں -

تیسرا حصہ جواہرالقران ہے - اس میں وہ ابیات درج ہیں جن میں آیات قرانی کی تلمیح یا اقتباس ہے - اس میں قران کی پوری پوری آیتیں اور سورتیں بھی دیدی گئی ہیں -

چوتھا حصہ لالی سخن ہے ، اس میں وہ اشعار جمع کر دئے گئے ہیں جن میں احادیث نبوی کی طرف اشارہ ہے -

پانچواں حصہ مرجانةالمدیح ہے - اس میں وہ اشعار ہیں جن میں مولانا نے اپنے بعض معاصرین کا ذکر کیا ہے مثلاً برہان الدین محقق (یہ مولانا کے والد کے خلیفہ ہیں ، اور مولانا کی ابتدائی تربیت انہیں کے زیر اثر ہوئی تھی) ، شمس تبریز ، صلاح الدین زرکوب اور حسام الدین چلپی جن کی فرمائش سے مولانا نے یہ مثنوی لکھی -

اس کے بعد قاضی صاحب نے کشف الابیات کے نام سے ایک حیرت انگیز انڈکس تیار کی ہے ، جس میں ہر شعر کے ایک دو لفظ بہ ترتیب حروف تہجی لکھہ کر اس کے صفحوں کا نمبر دیدیا ہے جس کا مطلب یہ ہے

کہ اگر کسی کو مثنوی کے کسی شعر کے ایک ہی دو لفظ یاد ہوں تو وہ اس کشف الابیات کی مدد سے مثنوی میں سے بہ آسانی وہ شعر نکال لے سکتا ہے -

آخر میں نامانوس اور مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو ۹۷ صفحوں میں جاکر ختم ہوئی ہے -

اس التزام سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ فاضل مرتب نے کس قدر محنت اور جان کاہی سے کام لیا ہے اور مثنوی کو جو عام طور پر ایک سنگلاخ چیز سمجھی جاتی تھی کس طرح پانی کرکے رکھدیا ہے -

کتابت و طباعت بغایت پسندیدہ ' کاغذ چکنا اور دبیز ' چرمی جلد جس پر طلائی حروف میں کتاب کا نام منقش ہے - (مدیر)

افسانہائے عشق

مصنفہ جناب حامد علی خانصاحب

یہ سات افسانوں کا مجموعہ ہے - سر ورق پر کیوپڈ اور سائیکی کی تصویر دیگئی ہے اور کتاب میں افسانہ خواں کی ایک عمدہ تصویر ہے - کتاب کی ضخامت ۱۸۲ صفحات ہے - کتابت عمدہ - جلد نفیس تقطیع چھوٹی - قیمت درج نہیں ہے -

شروع میں منصور احمد صاحب مدیر ادبی دنیا نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں ان افسانوں کی خوبیوں کی جانب اشارہ کیا ہے - یہ افسانے جناب حامد صاحب نے ٹیگور اور دیگر افسانہ نگاروں سے ترجمہ کئے ہیں اور اتفاق یہ ہے کہ سب المیہ ہیں - حامد علی خاں صاحب کی طبیعت بہت درد مند واقع ہوئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ان افسانوں سے بہت متاثر ہوے ہیں اس لئے ترجمے میں بھی ایک خاص کیفیت پیدا ہوگئی ہے ' اگر پہلے سے معلوم نہ ہو تو مشکل سے اسے ترجمہ کہا جاسکتا ہے ' زبان بہت پاکیزہ اور دلچسپ ہے - کتاب غم و حرماں کے نام معنون کی گئی ہے -

اُردو

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن) کا خالص
ادبی سہ ماہی رسالہ
جو
جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے
جس میں
ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے -
اُردو مطبوعات اور رسالوں پر تبصرے بھی کئے جاتے ہیں -

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب، بی - اے -
سکریٹری انجمن ترقی اُردو اور پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ،
حیدر آباد (دکن) -

سالانہ چندہ : سات روپئے - ایک نسخے کی قیمت ایک روپیہ ۱۲ آنے -

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)
یا
کتابستان
۱۷ - سٹی روڈ، الہ آباد -

سائنس

انجمن ترقی اُردو ' اورنگ آباد (دکن)

کا خالص

سائنس کا سہ ماھی رسالہ

جو

جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شائع ھوتا ھے

جس میں

سائنس کی جدید ترین ایجادات '

انکشافات اور اختراعات پر بحث ھوتی ھے

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی محمد نصیرالدین احمد عثمانی صاحب '

ایم - اے ' بی ایس سی - معلم طبیعات ' کلیہ جامعہ عثمانیہ -

سالانہ چندہ : آٹھہ روپیہ - ایک نسخہ کی قیمت دو روپیہ -

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

یا

کتابستان

۱۷ - سٹی روڈ ' الہ آباد سے

طلب کیجئے

سال نو کا غیر فانی

تحفہ

رسالہ "جہانگیر" لاہور کا

سالنامہ سنہ ۱۹۳۴ع

اپنی تمام دلاویزیوں کے ساتھہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوچکا ہے - اس میں تقریباً ہر موضوع پر ملک کے بلند پایہ ادبا اور سحر طراز شعرا نے اپنے شاہکار پیش کئے ہیں - بہترین آرٹ کی سہ رنگی و یکرنگی تصاویر اُس کی دلفریبیوں میں اضافہ کر رہی ہیں - صفحات تقریباً پونے دو سو صفحات اور قیمت فی پرچہ صرف ایک روپیہ -

لیکن

جو صاحب مبلغ تین روپے چھہ آنے سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماکر سال بھر کی خریداری منظور فرمائیں گے ان کی خدمت میں سالنامہ مذکور کے علاوہ اگست سنہ ۱۹۳۴ع میں شائع ہونے والا مہتمم بالشان نظام نمبر جو گذشتہ نظام نمبر سے ہر طرح بڑھہ چڑھہ کر ہوگا قیمتی ۲ روپیہ بلا قیمت پیش ہوگا -

عام پرچے ماہ بماہ پوری پابندی سے حاضر خدمت ہوتے رہیں گے -

نیاز مند

منیجر رسالہ جہانگیر ریلوے روڈ لاہور

ہندستانی اکیڈیمی کا سہ ماہی رسالہ

جنوری ۱۹۳۵ء

مجلس مدیران

فہرست مضامین

صفحہ

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۵	جنوری سنہ ۱۹۳۵ع	حصہ ۱

تحفۃالہند

از منشی محمد ضیاء الدین ' معلم فارسی و اردو

شانتی‌نکیتن ' بنگال

زبان ہندی کے ادبی علوم و فنون پر جس قدر کتابیں مسلمانوں کے عہد حکومت کے آخری دور میں لکھی گئیں ' اُن سب میں میرزا خان ابن فخر الدین محمد کی تالیف ' تحفۃالہند ' ایک نہایت ہی ممتاز حیثیت رکھتی ہے - میرزا خان کو ہندی زبان ' ہندی شاعری اور ہندی فن موسیقی سے عشق تھا - وہ ہندی (برج بھاکھا) کو ہندوستان کی زبانوں میں ' افصح زبانہا ' قرار دیتے ہیں - اُنہوں نے ہندی کی صرف و نحو پر سب سے پہلے قلم اُٹھایا ' سب سے پہلے ہندی کی لغات لکھی - ہندی علم عروض و قافیہ اور بدیع و بیان کے قواعد لکھے - ہندی علم موسیقی اور تال کے اصولوں کی مفصل شرح لکھی - ہندی الفاظ اور اصوات کو مروجہ عربی رسم‌الخط میں لکھنے کے قواعد و ضوابط اختراع کیے - علوم متداولہ ' مثلاً قیافہ و مباشرت پر بھی قلم فرسائی کی - اس مجموعے کا نام مولف نے ' تحفۃالہند ' رکھا ہے - مگر آج ہندی یا ہندستانی زبان کی تاریخ میں میرزا خان کا کہیں نام تک نہیں آتا -

' تحفۃالہند ' کے چند قلمی نسخے ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں - اور اُن کتب خانوں کی فہرستوں میں مرزا خان کی ' تحفۃالہند ' اور اُس کے ابواب و مضامین کا مختصر ذکر بھی موجود ہے - سب سے پہلے مرزا خان کا ذکر لچھمی نرائن ' شفیق ' نے کیا ہے - اور اُس کے بعد ' تحفۃالہند ' کا حوالہ ہمیں سر ولیم جونز (Sir W. Jones) موسس بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے اُس مضمون میں ملتا ہے جو اُنہوں نے ۱۷۸۴ع میں ہندوؤں کے علم موسیقی پر لکھا تھا [۱] - سر ولیم جونز نے اس مضمون میں تحفۃالہند سے بہت کچھ مدد لی ہے اور مرزا خان کی قابلیت کی داد بھی دی ہے - ' تحفۃالہند ' کے جس نسخے کا مطالعہ سر ولیم جونز نے کیا تھا وہ اب دفتر ہند کے کتب خانے میں محفوظ ہے [۲] - یہ نسخہ وشوا بھارتی یونی ورسٹی نے میرے مطالعے کے لئے مستعار منگوایا ہے - اس کے حاشیوں پر سر ولیم جونز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یاد داشتیں شاہد ہیں کہ موصوف نے اِس کا مطالعہ بڑی عرق ریزی سے کیا تھا - یہ نسخہ ' جیسا کہ اِس کے سر ورق پر لکھا ہے ' علی ابراھیم خاں نے سر ولیم جونز کو ۱۱۹۹ھ م ۱۷۸۴ع میں دیا تھا :—

" این کتاب مستطاب موسوم بہ تحفۃالہند ' این عبد ذلیل اعلي علي ابراھیم خاںل ' بخدمت افضل الفضلا و اشرف الازکیا

---

[۱] "The Persian Book, entitled 'A Present from India', was composed, under the patronage of A'zam Shah, by the very diligent and ingenious Mirza Khan, and contains a minute account of the Hindu literature in all, or most of its branches ;........" Asiatic Researches, Vol. III. P. 65.

[۲] India Office Library, LXXVIII, 18 x 19½, FF 431, 11.
15. W 106.

سر ولیم یونس صاحب سلمہاللہ واھب ھبۂ نمود
فی سنۂ ۱۱۹۹ ھزار و یکصد و نود و نۂ ھجری ' و
سنۂ ۱۷۸۴ یکہزار و ھفتصد و ھشتاد و چہار عیسوی " -

اس تحریر کے نیچے ایک مہر ثبت ھے ' جس میں " علي ابراھیم خان بہادر ۱۱۸۳ھ " صاف پڑھا جاتا ھے - نسخۂ صاف خط نستعلیق میں ھے - کاتب اپنا نام شہر یار خاں بتاتا ھے - نقل کی تاریخ ورق ۱۲۹۸ پر ' جہاں تحفۃالہند کا ساتواں باب ختم ھوتا ھے اور لغات ھندي شروع ھوتي ھے ' یوں درج ھے :—

" تمام شد - واقعۂ بست هشتم شهر رجب‌المرجب
سنۂ ۱۱۸۲ هجری یوم جمعۂ بوقت یک پاس روز برآمده
صورت اختتام یافت هفت باب کتاب بعون ملک الوهاب
بخط شهر یار خان - تمام شد...... "

کتاب کے اخیر میں ' یعنی لغات ھندی کے اختتام پر یہ عبارت ھے :—

" پنجم ذي‌القعده سنۂ ۱۱۸۲ هجری مقدسه از منقول عنه
بتصحیح و مقابلہ بمبالغۂ تمام باتمام رسید و ختم گردید " -

برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں تحفۃالہند کے مضامین کی فہرست دی ھے - [۱] مگر اس فہرست میں ' قواعد کلیۂ بھاکھا ' اور ' لغات ھندی ' کا ذکر نہیں ھے - یورپ کے بعض دوسرے کتب خانوں کی فہرستوں میں ان دونوں چیزوں کا ذکر موجود ھے - برٹش میوزیم کا نسخۂ ' مولف کی تحریر کے مطابق نامکمل ھے ' اس میں آخری

---

[۱]— Rive's *Catalogue of Persian MSS. in the British Museum*, 1881, Vol. I. P. 62.

دو باب موجود نہیں - مگر اس نسخے میں میرزا خان کی دی ہوئی فہرست مضامین ضرور موجود ہوگی - لہذا هندي کی صرف و نحو اور لغات کا ذکر نہ کرنے کي وجہ معلوم نہیں ہوتي - یہ صرف و نحو ' مقدمہ ' کی دوسری ' نوع ' ہے - اور ' مقدمہ ' کے مضامین میرزا خان نے (نسخۂ دفتر هند کے صفحۂ ب-۲ اور ا-۳ پر) یوں درج کئے ہیں : ' مقدمہ دربیان مصطلحات حروف تہجیۂ هندیہ و علم (ا-۳) خط و ذکر اشکال حروف مذکورہ از مفردات و مرکبات و بعضی قواعد کلیۂ بھاکھا ' - لغات هندی کے ذکر نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ مسٹر ریو نے میرزا خان کی اس عبارت : ' خاتمہ در ذکر لغات و مصطلحات و کنایات اہل هند... ...' (صفحہ ا-۳) کو کتاب کا معمولی تمام شد یا تمت بالخیر فرض کرلیا ہے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ 'خاتمہ' اپنے حجم کے لحاظ سے تحفۃالہند کا نصف حصہ ہے - ظاہر ہے کہ برٹش میوزیم کے نسخے میں علاوہ آخري دو بابوں کے جن کی عدم موجودگی کا مسٹر ریو نے ذکر کیا ہے ' یہ ' خاتمہ ' بھی موجود نہیں -

میرزا خان تحفۃالہند کي تمہید میں لکھتے ہیں کہ اُنہوں نے یہ کتاب عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں لکھی : ' در عہد میمنت خدیو کشورستان..........ابوالظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بادشاہ عالمگیر خلداللہ تعالی ملکہ و سلطانہ........' (صفحہ ا) - بادشاہ وقت کی مدح میں دو صفحے صرف کیے ہیں - تحفۃالہند کے تمام نسخوں میں یہی مدح پائي جاتی ہے اور سب نسخے اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کتاب اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں لکھی گئی تھی - یہاں تک تو معاملہ صاف تھا - مگر اس کے بعد ایک دقت پیش آتی ہے - تحفۃالہند کی تمہید دو طرح کی واقع ہوئي

ہے - یعنی اس کے تمام نسخے ایک سی تمہید نہیں رکھتے بلکہ دو قسموں میں سے کسی ایک قسم کو پیش کرتے ہیں - ایک قسم کی تمہید وہ ہے جس میں شہزادہ اعظم شاہ کو مولف نے اپنا موبی قرار دیا ہے اور اُس کی تعریف کی ہے - دوسری قسم میں شہزادہ معزالدین جہاندار شاہ (اعظم شاہ کا بھتیجا) مولف کا سر پرست قرار پاتا ہے - جس تمہید میں جہاندار شاہ کا ذکر ہے، اُس میں یہ بھی بالصراحت موجود ہے کہ میرزا خان نے تحفۃالہند کوکلتاش خان کے ایما پر لکھی - مثلاً بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے میں اسی قسم کی تمہید موجود ہے - میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے کی عبارت نقل کرتا ہوں :

"حسب‌الاشارت بابشارت وزارت و امارت مرتبت أبہت و ایالت منزلت، رفیع [۱] شاہ جمقدر سکندر مکان کوکلتاش خان، برائے مطالعۂ ہمایون بندگان شہریار والا تبار........ بادشاہزادہ محمد معزالدین جہاندار شاہ، مداللہ تعالیٰ ظل دولتہ ....." (صفحہ ۱) -

دوسری قسم کی تمہید میں صرف اعظم شاہ کا ذکر ہے - مثلاً دفتر ہند کے نسخے میں 'برائے مطالعہ' کے قبل 'حسب اشارت........ کوکلتاش خان' موجود نہیں اس نسخے کی عبارت یوں ہے :

"برائے مطالعۂ بندگان شہریار والا تبار.....بادشاہزادہ محمد اعظم شاہ، مداللہ تعالیٰ ظل‌دولتہ....." (صفحہ ۲ ا) [۲]

---

[۱]—' رفیع ' اِس جگہ سہو کتابت ہے - ' رضیع ' پڑھنا چاہیے - اِدارہ -

[۲]—آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ دفتر ہند کے نسخے میں ' برائے ' اور ' مطالعہ ' کے درمیان ' ہمایوں ' کا لفظ موجود نہیں - متن میں کسی نے بعد میں چھوٹا سا ' ہمایوں ' ' مطالعہ ' کے اوپر لکھدیا ہے ' جسے میں نے نقل نہیں کیا - اگر تالیف شہزادوں میں سے کسی کے مطالعہ کے لئے لکھی گئی ہوتی تو ' برائے مطالعہ ہمایون بندگان شہر یار ' کا جملہ مناسب نہیں ہوسکتا تھا - اور نہ 'ہمایوں' ' بندگان شہریار ' سے مناسبت رکھتا ہے -

جہاندار شاہ کے نام کے ساتھ کوکلتاش خان کا ذکر ہمارے ذہن کو صرف ایک ہی کوکلتاش خان کی طرف منعطف کرسکتا ہے اور وہ علی مراد خان کوکلتاش خان ہے - جہاندار شاہ کي نیابت میں یہ ملتان پر حکومت کرتے رہے - یہی جہاندار شاہ کے رضاعی بھائی بھی تھے - جہاندار شاہ کي طرف سے فرخ سیر کے خلاف لڑتے ہوئے سنہ ۱۷۱۳ع میں مارے گئے - لیکن میرزا خان نے جس کوکلتاش خان کا ذکر کیا ہے وہ 'رفیع شاہ' ہے - اور شاہ سے مراد صرف بادشاہ وقت ہی ہوسکتا ہے - علاوہ بریں جہاندار شاہ اور اعظم شاہ دونوں کو مولف نے شہزادہ لکھا ہے [۱] - ایک اور کوکلتاش خان، جن کا نام ملک حسین خوانی تھا، وہ اورنگ زیب کے رضاعی بھائی ہوتے تھے اور وہی اس جگہہ مراد لئے جاسکتے ہیں - ان کی رضاعت کے متعلق مولف ماثرالامرا لکھتے ہیں :

"چوں حلیلہ جلیلہ او بشرف رضاعت فیض اشاعت شاہزادہ محمد اورنگ زیب بہادر رسید، پسرانش........ بمناصب سرفرازي یافتہ -" [۲]

اور خانی خان سنہ ۱۰۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں :

"خان جہاں (کوکلتاش خان) بدعوی نسبت برادر رضاعی، کلمات ناگفتنی بزبان می‌آورد و بعد عرض خلاف مرضی پادشاہ بظہور می‌آمد، لہذا ذخیرہ ملال خاطر از طرف خان جہان بہادر داشتند......" [۳]

---

[۱]—یہ ساری الجھن اسی ایک غلط لفظ 'رفیع' سے پیدا ہوئی ہے—ادارہ -

[۲]—مآثرالامرا، جلد ۱ - صفحہ ۷۹۸ -

[۳]—منتخب‌اللباب، جلد ۲ - صفحہ ۲۹۹ -

دونوں کوکلتاش خان اپنی اپنی سرکاروں کی طرف سے 'خان جہان بہادر' کے خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے' یہ خطاب تحفۃالہند میں کوکلتاش خان کے نام کے ساتھہ موجود نہیں - لہذا مسٹر ریو نے تحفۃالہند کی تالیف ۱۹۷۲ (۱۰۸۹) سے قبل قرار دی ہے جو کہ ملک حسین خوانی کوکلتاش خان کے اورنگ زیب کی طرف سے 'خان جہان بہادر ظفر جنگ' کا خطاب پانے کی تاریخ ہے - لیکن جو کوئی کلتاش خان مسٹر ریو کے ذہن میں ہے وہ علی مراد خان کوکلتاش خان ہے' اور اُسے 'خان جہان بہادر' کا خطاب جہاندار شاہ نے اپنی جانشینی کے روز سنہ ۱۷۱۲ع میں دیا تھا [۱] - معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ریو نے دونوں کو کلتاش خانوں میں امتیاز نہیں کیا - وہ لکھتے ہیں :

"Kukiltash Khan governed the province of Multan in the name of that young prince, the eldest son, and afterwards the successor, of Shah Alam, who was born A. H. 1071." [۲]

ظاہر ہے کہ یہ کوکلتاش خان علی مراد خان ہیں - اور انہیں مذکورہ بالا خطاب سنہ ۱۷۱۲ع میں ملا تھا - یہ میرزا خان کے کوکلتاش خان نہیں ہوسکتے -

قیاس یہی کہتا ہے کہ جہاندار شاہ اور کوکلتاش خان کے نام تمہید میں بعد میں اضافہ کئے گئے ہیں - لیکن اعظم شاہ کا نام بعد میں داخل کرنا بعید از قیاس ہے - اعظم شاہ اپنے بھائی معظم شاہ کے

[۱]—J. A. S. B.

[۲]—Catalogue of British Museum جلد ۱ ، صفحہ ۶۲ -

خلاف تخت کے لئے جنگ کرتے ہوئے مارے گئے تھے - معظم شاہ نے بہادر شاہ کے لقب سے پانچ سال حکمرانی کی اور ان کے بعد جہاندار شاہ کی نوبت آئی - اورنگ زیب کے بعد ' پانچ چھہ سال تک یہی ممکن تھا کہ اعظم شاہ کی جگہ جہاندار شاہ کا نام داخل کر دیا جائے - اعظم شاہ کے متعلق ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھاشا کے دلدادہ تھے - بھاشا کے شاعروں کے سر پرست تھے - بہاری چوبے کی تصلیف 'ست سائی' کی نظمیں جس ترتیب کے ساتھ موجود ہیں وہ اعظم شاہ ہی کے مطالعہ کے لئے درست کی گئی تھیں - اور اسی سبب سے یہ کتاب ' ست سائی ' اعظم شاہی ' کہلاتی ہے - دوابہ کے برهمن شاعر نواج نے کالی داس کی سکنتلا کا بھاشا میں اعظم شاہ کے ایما پر ترجمہ کیا تھا [۱] - اور یہ اعظم شاہ کے دیوان خان میر هادی تھے جو بھاشا میں بڑی مہارت رکھتے تھے [۲] -

---

[۱]— The Modern Vernacular Literature..., Sir G. A. Grierson, 1889, P. 75, 76.

[۲]—اورنگ زیب اور خان میر هادی کے درمیان بعض هندی الفاظ کے عربی رسم الخط میں منتقل کرنے کے متعلق جو گفتگو ہوئی تھی وہ دلچسپی سے خالی نہیں - ماحصل شاہ نواز خان ہی کے الفاظ میں سنئے : " هنگامیکہ دارالانشا بدو تفویض یافت ' روزی (میر خان میر هادی) بعرض رسانید کہ در زبان هندی و رسم الخط آن ' آخر هیچ کلمہ حرف ' ها ' نیامدہ - و الف اگرچہ درآن حروف محسوب است کہ درین زبان قطعی متروک اند ' مگر عرض آن (یعنی الف) و عین و همزہ کہ حرفی دارند ' در اول کلمہ می‌آرند و وسط و آخر - اما ' از جملۂ دوازدہ اعراب کہ وضع کردہ اند ' مدار ترکیب حروف برآن گذاشتہ ' یکی را باسم ' کانا ' نامند ' و آخر لفظ آرند - آن (کانا) بصورت و مخرج الف است - ابتدای اسلام ارباب ترجمہ و فارسی نویسان ' از روی سهو الف کذائی را ' ها ' کردہ ' مثل بنگالہ و مالوہ را بالف مینوشتہ باشند......" مآثرالامرا کے مواف لکھتے ہیں کہ خان میر هادی کا یہ استدلال عالمگیر کو بہت معقول معلوم ہوا اور انہوں نے منشیوں کو حکم دیا کہ آئندہ ایسے الفاظ ' ہ ' سے نہ لکھے جائیں بلکہ الف سے - عالمگیر هندی زبان سے واقف تھے (مآثرالامرا جلد ۳ صفحہ ۳۹) - سر جارج گریرسن نے ماڈرن ورنیکلر ' میں بھاشا کے اُن شاعروں کے نام دئے ہیں جن کی سرپرستی عالمگیر کرتے تھے - کالی داس تریبدی ' ایسور ' سامنت ' کرشن ' اندر جیت ' تریاتوی بھی عالمگیر کی ملازمت میں تھے (صفحہ ۷۱ - ۷۲) -

خود میرزا خان کا کچھ پتہ نہیں چلتا - اِن کا نام مختلف فہرستوں میں مختلف پایا جاتا ھے - ڈبلیو ' پرٹش (W. Pertsch) کی فہرست [۱] میں تحفۃالہند کے مولف کا نام میرزا خان ابن فخرالدین محمد دیا ھے - مگر برٹش میوزیم اور بوڈلین [۲] کتب خانوں کی فہرستوں میں مولف کا نام صرف میرزا محمد ابن فخرالدین محمد ھے -

بانکی پور کے کتب خانہ کی فہرست [۳] میں ایک غلطی رہ گئی ھے ' جس کا یہاں ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ھوں - اس کتب خانے کی فہرست کے مولف نے بیان کیا ھے کہ تحفۃالہند " کو کلتاش خان کی خواھش پر معزالدین جہاندار شاہ کے لئے لکھی گئی تھی " - مولف نے یہ بیان مسٹر ریو کی فہرست سے نقل کر دیا ھے - حالانکہ خود بانکی پور کے نسخہ میں نہ تو کلتاش خان کا ذکر ھے اور نہ جہاندار شاہ کا - اس نسخہ میں اعظم شاہ کا نام موجود ھے - بوڈلین کتب خانہ کی فہرست میں جہاندار شاہ کو عالمگیر کا بیٹا قرار دیا ھے - دفتر ھند کی فہرست میں [۴] میرزا خان کی پیدایش کا سال سنہ ۱۷۰۱ع لکھا ھے ' جو مسٹر ریو کی فہرست میں جہاندار شاہ کی پیدایش کا سال ھے - اسی فہرست میں میرزا خان کا نام میرزا محمد ابن فخرالدین محمد لکھا ھے ' حالانکہ اصل نسخہ میں میرزا خان ابن فخرالدین محمد ھے -

---

- W. Pertsch's Cat. 1888, P. 83. MSS. 34 (or 40, 224)—[۱]

- Bodleian Library Catalogue 1889, P. 1022b.—[۲]

- Vol. IX. P. 150, No. 882, 883, (1929 AD.)—[۳]

The Two Collections of Persian and Arabic MSS., 1902,—[۴] - P. 59

میں نے میرزا خاں کی " قواعد کلیۂ بھاکھا " کا فارسی متن ' دفتر ھند ' بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور بانکی پور کے نسخوں کے مقابلہ سے تیار کیا ھے - اور اس متن کا انگریزی میں ترجمہ کیا ھے - ان دونوں چیزوں کو وشوا بھارتی شائع کر رھی ھے ' - میرزا خاں کی ' لغات ھندی ' کا متن بھی تیار ھے - اس کی اشاعت کے متعلق میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا -

تحفۃالہند میں میرزا خاں نے ھندی ادب اور اُس کے بعض شعبوں پر پوری پوری تفصیل سے بحث کی ھے - ان شعبوں میں بعض محض علمی حیثیت رکھتے ھیں اور بعض متداول اور مروجہ ھیں - مقدمہ میں ھندی رسم‌الخط اور ھندی حروف کو مروجہ عربی رسم‌الخط میں لکھنے کے طریقے بتائے ھیں - اس میں ھندی حروف کی مفرد اور مرکب صورتوں کی تشریح کی گئی ھے اور اُن سے متعلق صرف و نحو کے قواعد لکھے ھیں - ھندی رسم‌الخط کی وضاحت کی ھے - مشترک ' غیر مشترک اور زائد حروف کا امتیاز بتایا ھے اور حروف علت پر مفصل بحث کی ھے - مقدمہ کے علاوہ سات باب ھیں - پہلا باب ھندی علم عروض پر ھے - دوسرا قوافی اور بحور پر - تیسرا بدیع و بیان پر - چوتھا ھندی شاعری میں عشق اور اُس کے متعلقات پر - پانچواں علم موسیقی پر - چھٹا فن مباشرت پر - ساتواں علم قیافہ پر - ان تمام بابوں میں سے پہلے پانچ باب مکمل شرح و بسط سے لکھے ھیں - چھٹا اور ساتواں مختصر ھیں - آخر میں خاتمہ ھے جو ھندی زبان کی لغات ھے - اس لغات میں تین ھزار سے زیادہ الفاظ کے معنی لکھے ھیں - ھندی الفاظ کو عربی رسم‌الخط میں لکھنے کے لئے جو اصطلاحات مقدمہ میں بیان کی ھیں ' انھیں کے مطابق لغات ھندی کے ھر لفظ کے ھجے کئے ھیں اور

اس کے بعد معنی بتائے ھیں - تحفۃالہند کے صفحات میں سیکڑوں ھندی الفاظ اور مختلف فنون کی اصطلاحات استعمال ہوئی ھیں اور ھر جگہ اُن کے ھجے کر دئے گئے ھیں -

تحفۃالہند اپنے مضامین کے لحاظ سے بلا شک و شبہ ایک جامع کتاب ھے - اور مسلمانوں کے ھندي ادب سے شغف اور مطالعہ کی ایک بے مثل یادگار ھے - میرزا خان نے جن فنون پر بحث کی ھے ' ایک ماھر فنون اور معلم کی حیثیت سے کی ھے - اُن کا مقصد ان فنون سے مسلمانوں کو کما حقہ آگاہ کرنا ھے - اور اسی لئے طویل تفصیلات سے کام لیا ھے - میرزا خان نے صرف مروجہ فنون کو فارسی زبان میں لکھا ھی نہیں بلکہ اُن میں ایک خاص قسم کا اضافہ بھی کیا ھے جو ایک حد تک ھندي ادب کی ترقی کا باعث ھوا ھے - اور اس لحاظ سے بھی یہ کتاب اپنا جواب نہیں رکھتی - میرزا خان کے پاس اُس مواد کی قلت بلکہ فقدان کو دیکھتے ھوئے جو تحفۃالہند کی تالیف کے لئے ضروري تھا ' کہا جا سکتا ھے کہ اُس نے غیر معمولی مشقت اور جدت طبع کی مثال پیش کی ھے - اس تالیف میں ھم عصر حاضر کی اُس عقلی روش کو کار فرما پاتے ھیں جو اسکالر شپ (scholarship) کہلاتی ھے - چنانچہ ھندی الفاظ کو صحیح طور پر عربی حروف میں لکھنے کے قاعدے قلمبند کرنے کی ضرورت کو محسوس کرنا ھی میرزا خان کی طبیعت کے سائینٹیفک رجحان کي دلیل ھے - میرزا خان کی طبیعت بالکل عملی واقع ھوئي ھے - کسي فن کی ابتدا کا مختصر ذکر کرنے کے بعد وہ فوراً اُس کے اصولوں کی عملی تشریح کي طرف رجوع کرتے ھیں ' اور ساتھ ساتھ عربی اور فارسی فنون سے مقابلہ کرتے چلے جاتے ھیں - جن فنون کی مولف نے شرح کی ھے اُنھیں پوری طرح سے اپنا لیا ھے -

تحفۃالہند کے مطالعہ سے آپ پر ظاہر ہوگا کہ یہ ہندی یا سنسکرت کتابوں کا ترجمہ نہیں ہے - جن فنون کی میرزا خان نے شرح کی ہے وہ اگرچہ اصلاً سنسکرت نژاد ہیں مگر مولف نے انکی صرف مروج اور مستعمل صورتوں سے بحث کی ہے ' غیر مستعمل تفصیلات سے اجتناب کیا ہے - ہندی مروجہ بحور اور بدیع و بیان میں میرزا خاں نے چند اپنی ایجادوں کا اضافہ بھی کیا ہے - بحروں کے متعلق لکھتے ہیں :

" در بیان اقسام چھندہائی کہ مخترع این نحیف اند - و اختراع چھندہای مذکور نسبت بدانست کہ گاہی بگوش این نحیف نخوردہ ' و در کتابی نیز بنظر نہ رسیدہ و اگر احیاناً چھندہائی از این چھندہا در کتابی مضبوط باشد پس از جملہ تواردات تواند بود ' والا از جملہ مخترعات و آن جملہ چہاردہ چھند..." (صفحہ ب ۱۲۴) -

علم بدیع و بیان میں اپنی ایجادوں کے متعلق لکھتے ہیں :—

" در بیان النکارہائی کہ مخترع این نحیف اند ' بہ مصطلحات جدیدہ - و این اختراع نسبت بدانست کہ جائی در کتب ہندیہ بنظر نیامدہ و گاهی بگوش نیز نہ رسیدہ و اگر احیاناً النکاری از النکارہای مذکورہ در کتابی یا بر زبانی باشد پس آن از جملہ تواردات تواند بود......
و آن جملہ چہار النکار است -" (صفحہ ب ۱۵۴) -

تحفۃالہند کے تمام بابوں میں سے عروض اور موسیقی کے باب زیادہ شرح و بسط سے لکھے گئے ہیں - علم عروض میں پہلے تو بنیادی اصولوں کی شرح کی ہے ' خفیف اور ثقیل ماتروں کی تفصیل دی ہے - پھر ۷۵

مختلف بحروں کی شرح کی ہے جو عام طور پر مستعمل ہیں - ان بحروں میں سے ہر ایک کی مثال فارسی نظم سے دی ہے مثلاً سلگھت چھند کی مثال یوں دی ہے :

" خال سیاہت عنبر خالص نوش لبانت مایۂ جانہا ،
چین جبینت موجۂ کوثر موی میانت راز نہانہا ،
باشد چوں گل با لب چوں مل با رخ مہوش ای بت زیبا
گوی یکی سگردی سگردی تگردی تگردی تتتتک تہیا
(صفحہ ۱۸۹) "

چوبولے کی مثال یہ ہے :

" ای رخ تو روشن چون ماہ * وی سر زلفت چون شب سیاہ
موی میانت میچی نہ * کاکل تو جز پیچی نہ
مفتعلن مفعولن فاع " (صفحہ ب ۱۰۱)

ہر بحر اور اُس کے قافیہ و ردیف کی شرح کے بعد عربی عروض کے مطابق تقطیع کی ہے - اس تمام تفصیل کے بعد ۷۱ چھوٹی بحریں بتائی ہیں ۱۲۱ برن پرستار بحریں اور ۸ سنسکرت بحریں - ان کے بعد اپنی ۱۴ بحریں بھی درج کی ہیں -

میں نے عرض کیا ہے کہ مرزا خان نے اپنے مضامین کو ماہر فنون اور معلم کی حیثیت سے لکھا ہے - اور اس کوشش سے اُنکا مقصد ہندی ادبی علوم اور اُن سے متعلقہ فنون اور ہندی موسیقی سے مسلمانوں کو پوری طرح آگاہ کرنا ہے کہ وہ ان فنون کو خود استعمال کرسکیں - ہندوستان کی مشترکہ ہندو مسلم علمی فضا میں جو ایک متحدہ قومی ذہنیت وجود میں آچکی تھی اُس کی نشو و نما کے لئے اور فارسی دانوں اور (ہندی فارسی کی

مشترکہ پیداٹش) اردو زبان بولنے والوں اور اس میں لکھنے اور شعر کہنے والوں کے لئے ان ادبی فنون کا جاننا اور انہیں استعمال کرسکنا قطعاً ضروری تھا - میرزا خان نے تحفۃالہند میں اس واقفیت بہم پہنچانے کی خدمت کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے - مسلمانوں اور بعض ہندؤں کی علمی زبان اس زمانہ تک فارسی تھی - مسلمانوں کو یہ زبان وراثت میں ملی تھی - لیکن اب اس وراثت کا یہ حال تھا کہ اُسے مادری زبان نہیں کہا جا سکتا تھا - مسلمانوں کی مادری زبان اردو یا ہندستانی تھی - مسلمان اس کیفیت کو محسوس کر رہے تھے کہ فارسی زبان سے اُن کا تعلق ایران اور ایران کے زندہ ادب سے اُن کا رشتہ کچھ عرصہ سے منقطع ہوچکا تھا - اور اب وقت آگیا تھا کہ وہ ملکی اور قومی زبان کو علمی اور ادبی خدمات کے لئے استعمال کریں - سودا پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے ' اُن کے کسی بزرگ نے جو مشورہ اُنہیں دیا تھا وہ ہم سب کو معلوم ہے - سودا نے اس نصیحت پر عمل کیا ' فارسی میں شعر کہنا ترک کیا اور اردو کو جو عروج اُن سے ملا وہ اظہر من الشمس ہے ہندوستان کے مسلمان خالص ایرانی النسل نہ تھے اور جو تھے وہ ہندوستان میں مدتوں کے قیام کے بعد ہندوستانی ہوچکے تھے - اُن کی فارسی زبان میں وہ زور اور قدرت باقی نہ رہی تھی جو مادری زبان میں ہوتی ہے - اور بغیر اس قدرت کے ادبی تصانیف کا معیار بہت پست ہوتا ہے - میں نہیں کہتا کہ ہندوستان میں ایسے ادیب موجود نہ تھے جو صحیح فارسی لکھ سکتے تھے - سوال یہ ہے کہ ایسی چند ہستیوں سے ملک کو کیا فائدہ ہوسکتا تھا ؟ ہندوستانی زبان ' اردو یا ہندوستانی ' فارسی ' ہندی ' بھاشا ' کھڑی ' پنجابی ' گجری میں سے کسی ایک سے مل کر یا سب کی معجون ' جو کچھ بھی کہئے وہ بن چکی تھی ' اور وہ فارسی اور خالص ہندی کے مقابل تھی—ادبی سرمایہ کے لحاظ سے نہیں ' مادری اور ملکی

زبان کے لحاظ سے - شاعروں نے اردو یا ہندوستانی میں شعر کہنا عرصے سے شروع کردیا تھا - لیکن اس زبان کے مضامین ' اُس کے عروض و قوافی ' تشبیہہ ' بدیع و بیان غرض سب کچھ فارسی سے منتقل ہوکر اس زبان میں آچکے تھے - فارسی شاعرانہ استعارات اور فارسی ترکیبیں بکثرت اس زبان میں آچکی تھیں اور آ رہی تھیں - فارسی کی طرف اس زبان کا رجحان بہت زیادہ تھا کیونکہ اس کے ادیب فارسی ادب ہی کو اپنی نئی قومی زبان میں منتقل کر رہے تھے - اس طرح اردو زبان کا فارسی نما ہو جانا ضروری تھا - عین اسی موقع پر میرزا خاں اپنی تحفۃالہند پیش کرتے ہیں کہ اردو زبان کا فارسی کی طرف میلان کم ہو ؛ ہندی یا برج بھاشا عنصر اُس میں ملے اور اس کا وزن قایم ہو جائے اور میرزا خان نے ہندی یا بھاشا کا میدان کھول دیا - اس کی صرف و نحو اور لغات پیش کی - ہندی عروض ' ہندی ادبی استعارات ' ادبی رسومات ' ہندی شاعرانہ تعشق کے انداز ' ہندی بحریں اور قوافی ' بدیع و بیان اور ہندی فن موسیقی کے متعلق معلومات کا دریا بہا دیا لیکن بدقسمتی سے یہ موافق بے وقت پہنچے یعنی اورنگ زیب کی حکومت کے آخری دور میں -

میرزا خان نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ٹھیٹ اور ادبی ہندی یا بھاشا نہیں بلکہ روز مرہ ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ بھاشا کے الفاظ کا آخری او (au) اور ای (ai)، ا (a)، اور آ (a) میں بدل جاتا ہے - یہی صورت تھی جس میں ہندی اور بھاشا کے الفاظ بدل کر اردو میں شامل ہو رہے تھے - یہ بہت ہی تھوڑے عرصہ کی بات ہے کہ بھاشا یا پنجابی فعل کے آخری ما قبل کی ' ی ' ہماری اردو سے گر گئی ہے پرانی اردو میں مثلاً دکن کی اردو میں یہ ' ی ' موجود تھی اور پنجابی میں اب تک موجود ہے - مثلاً

اب هم کہتے هیں بولا ' لگا ' کہا ' لیکن پرانی اردو میں تھا بولیا (برج بھاشا بولیو boilyau) لگیا ' (برج بھاشا - لگیو lagiyau) کہیا ' (برج بھاشا - کہیو kahyau) - بسریا ' دیکھیا ' سٹراریا ' ایایا ' بھریا ' رکھیا - اسی قسم کے الفاظ هیں جو قدیم اردو میں استعمال هوتے تھے - انشاءاللہ خان کی کہانی ' رانی کیتکی ' میں بھی اس قسم کے الفاظ کی مثالیں پائی جاتی هیں -

تحفةالهند کی ایک بڑی خصوصیت یہ هے کہ اس میں هر هندی لفظ یا اصطلاح کے هجے کر دئے گئے هیں - مقدمہ میں هندی عربی اور فارسی حروف تہجی کا مقابلہ کیا گیا هے ' ان کے حروف کی آوازوں کے اختلاف اور موافقت کو ظاهر کیا گیا هے ' بعض حروف کی زیادتی یا کمي بتائی گئی هے - اس مقابلہ کے بعد مولف نے هر هندي حرف اور اُس کی صورت کے لئے عربی حروف میں سے قریب ترین حرف لیکر اُسے ایک اصطلاحی نام دیا هے اور نقطوں کی زیادتی یا کسی دوسری علامت کے ذریعے اُسے دوسرے حروف سے ممتاز کرکے هندی حرف کا مترادف قرار دیا هے - مثلاً هندی تھ ' ٹ اور ٹھ آواز کے لحاظ سے عربی ت کے قریب هیں - اسي آواز کو تھ ' ٹ اور ٹھ کی آوازوں کا حامل قرار دیا هے - تھ میں ہ کي آواز کی زیادتی هے ' میرزا خان اِسے تای فوقانی ثقیلہ قرار دیتے هیں - ٹ میں ت کی آواز اور زیادہ کرخت هوجاتی هے ' مولف اِسے تای فوقانی مثقلہ نام دیتے هیں - اسی ٹھ میں چونکہ ٹ کی آواز اور بھی سخت هوجاتی هے میرزا خان اِسے تای فوقانی اثقل کہتے هیں - اسی طرح باقی تمام هندی آوازوں کے لئے عربی حروف کو اصطلاحي نام دیکر علامات کے ذریعے ممتاز کیا گیا هے - ٹ کو میرزا خان ٹ لکھتے هیں اور ٹھ کو ٹھہ - یہی طریقہ پرتگالیوں نے بھی اختیار کیا تھا - وہ هندی ٹ کو tt لکھتے تھے -

ایک اور بات جو قابل لحاظ ھے وہ یہ ھے کہ میرزا خان نے الفاظ کا تلفظ وھی دیا ھے جو روزمرہ میں مستعمل تھا - اگر کوئی لفظ سنسکرت کا استعمال کیا ھے تو ساتھہ ھی اُس کا روزمرہ تلفظ بھی دے دیا ھے - اس خصوصیت کے لحاظ سے تحفۃالہند خاص کر ھندی لسانیات کے نقطۂ نظر سے بہت بڑی اھمیت رکھتی ھے - میرزا خان ھندی اور برج بھاکھا میں امتیاز نہیں کرتے - وہ دونوں نام ایک دوسرے کے معنوں میں استعمال کرتے ھیں - لیکن انشاءاللہ خان نے ھندی اور بھاکھا میں امتیاز کیا ھے - وہ رانی کیتکی کی کہانی کی زبان کے متعلق فرماتے ھیں :..... آنکھیں پھرا کر لگے کہنے ' یہ بات ھوتی دکھائی نہیں دیتی - ھندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکھا پن نہ گھوس جائے......[۱] میرزا خان بھاکھا کے متعلق لکھتے ھیں کہ وہ خاص کر برج ملک کی زبان ھے - ایک دوسری جگہ وہ گوالیار اور چندوار وغیرہ کو ان ممالک میں شامل سمجھتے ھیں جہاں بھاکھا بولی جاتی ھے - بھاکھا کی صرف و نحو کے مقدمہ میں وہ گنگا جمنا کے دوابہ کی زبان کو فصیح کہتے ھیں ' چونکہ مولف کے نزدیک ھندوستان کی تمام زبانوں میں صرف بھاکھا ھی فصیح ھے ' دوابہ کی زبان بھی وہ بھاکھا ھی قرار دیتے ھیں - بھاکھا ان تمام صوبوں کی خاص ادبی زبان تھی - اور بھاکھا سے اکثر مختلف صوبوں کی بولی بھی مراد لی جاتی تھی - اور یہی وجہ تھی کہ بھاکھا باقی تمام زبانوں کی ماں سمجھی جاتی تھی - میرزا خان کا خیال ھے کہ سنسکرت اور پراکرت کے سوا ' باقی تمام زبانیں بھاکھا میں شامل ھیں - اور پراکرت ' سنسکرت اور بھاکھا کی آمیزش سے پیدا ھوئی ھے - میرزا خان کہتے ھیں کہ بھاکھا ھی شاعرانہ تخیل کو ادا کرنے کی قابلیت رکھتی ھے'

- J. A. S. B. 1852, P. 5.—[1]

شاعر اس زبان میں شعر کہتے ہیں اور مہذب لوگ اسی بھاکھا کو بولتے ہیں - یہی خیال سر - جی - اے - گریرسن کا ھے - وہ لکھتے ھیں کہ " مغربی ھندی زبان کی شاعری تقریباً تمام کی تمام برج بھاکھا میں ھے [۱] " برج بھاکھا متھرا کے مغرب دور تک پھیلی ہوئی تھی ' دوابہ اور راجپوتانہ وغیرہ کی ادبی زبان تھی اور لوگ اسے ' پنگل ' یعنی شاعرانہ زبان کہتے ہیں اور صوبہ کی زبان کو ڈنگل ! کہتے تھے -

میرا خیال ھے کہ میرزا خان کی یہ صرف نحو ھندی ' ھندوستانی اور بھاکھا کی صرف و نحووں میں سب سے پہلی تصنیف ھے - جون جوشوا کٹلیر (John Joshua Ketlaer) نے ھندستانی صرف و نحو سنہ ۱۷۱۵ع کے قریب لکھی - اور میرا قیاس ھے کہ اُنہوں نے میرزا خان کی یہ صرف و نحو ضرور دیکھی ہوگی - یہ گرامر ڈیوڈ مل (David Mill) نے سنہ ۱۸۰۳ع میں شایع کی تھی - اگروال کے للو جی لال نے بھی " مصادر بھاکھا " سنہ ۱۸۰۳ع میں لکھی تھی ' جس کا ذکر سر - جی - اے - گریرسن نے کیا ھے [۲] - میرزا خان کی لغات بھی ھندی کی پہلی لغات ھے - ف ' تیورونسیس (Francicus M. Turonesis) نے اپنی لغات سنہ ۱۷۰۴ع میں لکھی تھی ' جو اب نا پید ھے - دیا رام ترپاتی کی لغات تقریباً سنہ ۱۷۲۱ع میں لکھی گئی تھی [۳] -

میرزا خان نے اپنی ' لغات ھندی ' میں الفاظ کے ھجے کس طرح کئے ہیں اُس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں :

---

[۱] — The Indian Antiquary, Jan. 1903. p. 16.

[۲ و ۳] — The Modern Vernacular Literature of Hindustan, pp. 101, 103, 75, 76.

" برندابن - بکسر اول و رای متصلہ و نون ملونہ و دال خفیفۂ ممدودہ و بای موحدۂ خفیفۂ مفتوح - نام صحرائے و موضعی است مشہور در نواحی متھرا کہ کانہ درآن صحرا گا و میچرائید - و آنرا در متعارف بندرابن گویند " -

الفاظ کے آخری حرف چونکہ 'فصل' کے عنوان میں شامل ہوتے ہیں ' اور اکثر ساکن ' مولف نے انہیں ہجوں میں شامل نہیں کیا -

ہندی عروض کے باب میں میرزا خان نے چند ہندی شعروں کی مثالیں پیش کی ہیں - میں نہیں کہہ سکتا یہ شعر کن شاعروں کے ہیں - ان میں سے بعض میرزا خان کے ہیں -

دیپدیا دوار کی مثال :

نین تہاری سیام لال ات راتي مانی - (میرزا خان)
دان پچاري نرگ سوں ڈاری بیکنٹھان '
گرن نرگ میں کیوں پري جو کر تو ھی دان - (میرزا خان)
ایک برہ موتن دھی دوجیں دھت بھلنگ '
تیجیں رین ڈراؤني چرتھے کؤ نہ سنگ -
نپتہ کتھن ات چھین تن اندھیری رین '
کانو دور انجان من کیسے پاویں چین -
موسے تیریں کون ھی جا پے ریجھو لال -
جاگت جاگت نس سکھی ارن بھی درگ لال -
ھر سوں کرکے کیل کھوں نین نواوت بال -
دده ست بھکھہ بھری بھھو -

ان مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ھے کہ میرزا خان کس قسم کی زبان کو برج بھاکھا کہتے ھیں - لیکن یہ مثالیں ادبی زبان کی ھیں -

میرزا خان نے جو اسکیم هندی حروف کو عربی رسم‌الخط میں لکھنے کی اختراع کی ھے ' میں مختصر طور پر اُسے پیش کرتا ھوں :—

ء a همزہ -

اِ همزۂ ملینہ مثلاً لفظ مائل میں -

ب b بای موحدہ -

پ p بای عجمیٔ خفیفہ پدر میں -

چ c جیم عجمیٔ خفیفہ چمن -

د d دال خفیفہ -

س s شین مہملہ -

ش ś سین معجمہ -

گ g کاف عجمیٔ خفیفہ -

ی y یای تحتانی -

لھ lh لام ثقیلہ کالھ بمعنی کل میں

مھ mh میم ثقیلہ برمّھا بمعنی خدا

نھ nh نون ثقیلہ کنھس یا کانھ

نٓ ~ نون مغنونہ چانٓد

ن ṉ نون مدوّنہ گنگ یا بند

بھ bh بای موحدہ ثقیلہ بھار بمعنی بوجھ

پھ ph بای عجمی ثقیلہ پھل -

ته	th	تای فوقانی ثقیله	تهال
ٹ	ṭ	تای فوقانی مثقلہ	ٹوپ
ٹھ	ṭh	تاي فوقانی اثقل	ٹھگ
جھ	jh	جیم تازی ثقیله	جھک بمعنی مچھلی
چھ	ch	جیم عجمی ثقیله	چھال
چھ	cch	جیم عجمی اثقل	مچّھ
دھ	dh	دال ثقیله	دھن بمعنی دولت
ڈ	ḍ	دال مثقلہ	ڈر
ڈھ	ḍh	دال اثقل	ڈھول
ر	r	راي متّصله	پریت میں
کھ	kh	کاف تازی ثقیله	کھار بمعنی نمک
کھ	kkh	کاف تازي اثقل	مکّھ بمعنی چهره
گھ	gh	کاف عجمي ثقیله	گھر بمعنی خانه
و	w	واو مشمومه	دوار بمعنی دروازه
ي	y	یاي مشمومه	سیام بمعنی کرشن

حروف علّت :—

اَ	a	مثلاً لفظ ابلا میں ، دس سے بیس برس کی لڑکی -
آ	ā	آبھا بمعنی عکس
اِ	i	اِندر بمعنی دیوتا
اِی	ī	اِیکھ بمعنی گنّا
اُ	u	اُجیارا بمعنی روشنی

اُو	u	اُودھو
ری	ri	
رِی	r	
لری	lri	
لري	lri	
اِے	e	اِہ بمعني یہ
اَی	ai	ایراپت بمعنی ھاتھی
او	o	اور بمعني دوسرا کنارہ ، پار ، طرف
آو	au	آور بمعني اور ، دیگر

تمام ھندی الفاظ کے ھجّے اس اسکیم کے مطابق کئے گئے ھیں -

امید ھے اس تفصیل سے آپ تحفۃالھند کی اھمیت کا اندازہ لگا سکیں گے -

غالب کی اصلاح

ایک مثنوی پر

از منشی مہیش پرشاد ، مولوی فاضل ،

کئی سال سے میں غالب کے اردو خطوط کی ترتیب و تصحیح میں لگا ہوا ہوں - چوں کہ میرے اس کام کا موضوع غالب کے خطوط یا رقعات ہیں اس لئے خاص طور سے اُنھیں کی تلاش رہی مگر اس تلاش و تفتیش کے سلسلے میں کچھ اور نوادر بھی مل گئے ، مثلاً ایسے خطوط جو اوروں نے غالب کے نام لکھے تھے ، یا غالب کے بعض شاگردوں کے کلام کے وہ اصل نسخے جن میں غالب کے قلم سے اصلاح درج ہے - ان میں ایک مثنوی ہے جس کا ذکر کرنا اس وقت مقصود ہے -

غالب کے شاگردوں اور ارادت مندوں کے وسیع دائرے میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو صرف خط کتابت کے ذریعے اُن سے اصلاح لیا کرتے تھے - انھیں میں قصبۂ منیر شریف ضلع پٹنہ کے ایک متصوف بزرگ حضرت سید ابو محمد جلیل الدین حسین عرف شاہ فرزند علی زاہدی فردوسی بھی تھے - جو ایک باکمال شاعر تھے اور " صوفی " تخلص کرتے تھے [۱] - ان کی تصنیف سے ایک مثنوی ہے " لواءالحمد " (در بیان حلیۂ شریف) جو یحییٰ پریس ، اسلام پور ضلع پٹنہ میں چھپ کر شائع ہوئی ہے - افسوس ہے کہ اس کا چھاپا اچھا نہیں اور جا بجا

---

[۱]--آپ کے حالات زندگی رسالۂ معارف ، اعظم گڑھ (بابت جون ۱۹۳۲ء میں جناب شاہ محمد عثمان صاحب ابدالی نے شائع فرمائے ہیں اور اسی رسالے کی دسمبر ۱۹۲۰ء کی اشاعت میں غالب کا ایک خط حضرت صوفی کے نام کا شائع ہوا تھا -

غلطیاں ہیں - سب سے بڑی غلطی یہ کہ کاتب نے صفحوں کے ہندسے غلط لگا دیے اور چھاپنے والے نے اُن غلط ہندسوں کو صحیح جان کر اُنہیں کے مطابق صفحوں کو ترتیب دے دیا - حضرت "صوفی" رحمۃاللہ کے پوتے جناب سید شاہ محمد عثمان صاحب ابدالی کا شکر گذار ہوں کہ اُن کی توجہ سے مجھے اصل اصلاحی مسودے سے استفادہ کرنے کا موقع ملا -

چھپی ہوئی مثنوی میں بعض حصے ایسے بھی ہیں جنھیں مصنف نے اصلاح کے بعد اضافہ کیا تھا - جو مسودہ اصلاح کے لئے بھیجا گیا تھا اُس میں ۳۳۰ شعر تھے ; بعد کو ۷۱ شعر اضافہ کئے گئے - تین شعر اصلاحی مسودے میں ہیں مگر مطبوعہ کتاب میں نہیں ہیں - خود مصنف نے خاتمے کے اشعار میں سال تالیف یوں بتایا ہے :—

" سال ہے ' نغمۂ صوفی ' اس کا " - (۱۲۸۱) -

مصنف کے خالہ زاد بھائی حضرت شاہ خلیل الدین جوش کے کچھ اردو شعر تقریظ اور تاریخ کے طور پر اور ایک فارسی قطعۂ تاریخ اخیر میں درج ہے - اس کے بعد نثر بہ طور خاتمہ ہے جس کی آخری سطریں یہ ہیں -

" بعد تمام خجستہ آموز گار ' سرآمد شاعران روز گار ' سرتاج سخنوراں نامی ' استاد استادان فن خوش کلامی ' غریق رحمت ' مقیم جنت نواب نجم‌الدولہ اسد اللہ خان غالب المشتہر بہ مرزا نوشہ دہلوی کی نظر اصلاح سے سرمایۂ افتخار حاصل ہوا - نازش کو اعتبار حاصل ہوا - جیسا کہ خود عریضۂ اول کے سرنامے پر ساتھ قصیدۂ حمیدہ کے '

جو مشتمل بر استدعاے تلمذ تھا ، جناب غفران مآب کو لکھ چکا ہوں :

ایں دیدہ کہ کحل اثمدے می خواہد
" غالب " ! ز در تو مددے می خواہد
عنوان قبالۂ نصیب " صوفی "
از مہر سلیماں سندے می خواہد " -

یہاں سات شعر " قصیدہ حمیدہ " کے نقل کر کے یہ دو اردو رباعیاں بھی لکھی ہیں :—

(۱) ہیں شعر کے معرکے میں صفدر " غالب "
ہاتھ ان کے ہے کھیت ، یہ ہیں سب پر غالب
اس نام کا پاس ہے خدا کو ، " صوفی " !
پھر ہوں اسداللہ نہ کیوں کر " غالب "

(۲) سب تیغ زباں سے انہیں پہچانتے ہیں
غالب وہ ہیں ، سب اہل سخن جانتے ہیں
یہ شیر خدا کے نام کی ہے برکت
لوہا اسد اللہ کا سب مانتے ہیں -

ان چیزوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ " صوفی " کس درجے کے شاعر تھے اور " غالب " کی شاعری کی کیسی عظمت اُن کے دل میں تھی -

" لواءالحمد " کے ۳۳۰ شعروں میں سے صرف ۲۳ میں " غالب " نے رد و بدل کی ، ۱۶ پر صاد کیا - یہ سب شعر ان صفحات میں نقل کئے جاتے ہیں ، اس التزام کے ساتھ کہ :—

(۱) جو شعر جس عنوان کے تحت میں ہے پہلے وہ عنوان درج کر دیا گیا ہے -

(۲) جناب صوفی کی طرف سے جو شعر جس صورت میں مرزا کی خدمت میں بھیجا گیا تھا اُسی طرح درج کیا گیا ہے اُس کے بعد اصلاح کیا ہوا شعر یا مصرعہ ؛ مگر مزید وضاحت کے خیال سے اِصلاح یا وجہ اصلاح کے آخر میں کھلی دار خطوط کے اندر [غالب] درج کیا گیا ہے یا یہ کہ مرزا کی لکھی ہوئی وجہ اصلاح یا ضروری توضیح رقم کی گئی ہے -

(۳) جس شعر پر غالب نے ایک یا دو صاد کئے ہیں اُس پر ایک یا دو صاد بنا دیے گئے ہیں -

حمد

مصحف خلق ہے تصنیف اوس کی

سب یہ آیات ہیں تعریف اوس کی

ہے سب آیات میں تعریف اوس کی

[غالب]

تجھ پہ روشن ہے مری چشم اُمید

تجھ سے روشن ہو مری چشم سفید

(یہ شعر مرزا غالب نے قلمزد فرمایا) -

دے رسائی کہ یہ ہو عرش خرام

ذہن میرا کرے ملہم کا کام

الہام [غالب]

نعت

نوبت نعت نبی آئی ہے
خامہ سر گرم جبیں سائی ہے (م)

نور حق ، جلوۂ رب ، شان اِلٰہ
ہے تو بندہ مگر اللہ اللہ (م م)

اِک مقام ادنیٰ سا اُس کا قوسین
عرش و کرسی تہِ پا چوں نعلین

اس شعر کو مرزا نے قلمزد فرمایا اور یہ لکھا :—

" یہ شعر دو سبب سے کٹا ایک تو یہ کہ قوسین اور نعلین دونوں جگہہ تثنیہ کا " یے نون " ہے ؛ یہ قافیہ جایز نہیں - دوسرے یہ کہ عرش کی توہین ہے " [غالب]

خلق سے تھا وہ دلفروز مراد
" دل افروز " [غالب]
صبح کے ہونے سے ہے روز مراد (م)

ہے یہ روشن کہ جو ہو صبح نمود
پرتو مہر سے ہے اوس کا وجود (م)

پہلے سورج سے سحر ہوتی ہے
اوس کی آمد کی خبر ہوتی ہے (م)

اِس کے بعد یہ شعر تھا مگر قلمزد ہوا :—

باز چوں شمس کند جلوہ گری
بے فروغ است چراغ سحری

خاک تاپاں کي نہو کحل بصر
نہ کھلے شاھد مطلب پہ نظر
" پڑے " [غالب]

پانوں کي جا سر تعظیم سے یہاں
سر کے بل چلتے ھیں شاھان جہاں

اِس شعر میں مرزا نے 'پانوں' کے آخري 'ن' کو کاٹ دیا ھے اور لکھا ھے :—

" پانو قافیہ چھانو اور گانو کا ھے آگے اس کے نون لکھنا غلط ھے مگر ھاں بصیغہ جمع یوں لکھنا چاھئے : 'پانوؤں' ۱۲ " - [غالب]

خضر کو خدمت شربت داري
اور موسیٰ کو عصا برداری

" شربت داری لفظ غریب ھے آبداري کا مرادف نہیں ھوسکتا ۱۲ " [غالب]

طرقوا کو تھی مسیحا کی زباں
یاتی بعدی اسمہ احمد تھا بیاں

دوسرے مصرے کے مقابل غالب نے لکھا ھے :—

" تقطیع نادرست "

اور یوں اصلاح کی ھے :—

" آیت اسمہ احمد تھا بیاں" [غالب]

صاحب حسن خدا داد آیا
دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا (م)

راہ میں اوس کے ہزاروں فرسنگ
رشک صد طور تھا ہر ریزۂ سنگ
" غیرت طور " [غالب]
شب معراج فلک سے گذرا
رتبۂ جن و ملک سے گذرا
" سرحد ملک ملک " [غالب]

مدعا تھا کہ بیاں سے نکلا (م)
دل میں بیٹھا جو زباں سے نکلا (م)

جُگ طبیعت کے جو دل سے ٹوٹے
چھکے عالم سے جہت کے چھوٹے
جگ طبیعت کے جو پو سے ٹوٹے
داد میں چھکے جہت سے ٹوٹے

جناب صوفی صاحب نے دونوں شعروں کو مرزا کی خدمت میں بھیجا تھا - مرزا نے پہلے پر صاد کیا اور دوسرے کو قلمزد فرمایا -

---

درمیاں پردۂ آواز نہ تھا
نغمے دلکش تھے مگر ساز نہ تھا (م)

بشر اس راز سے کیا ماہر ہو
روح الاعظم پہ نہ جب ظاہر ہو
" روح اعظم " [غالب]

مناجات

صوفی اب وقت مناجات کا ہے
واسطہ قبلۂ حاجات کا ہے
" سامنا " [غالب]

حلیہ شریف

فکر کو رتبۂ معراج ہے آج
ناطقہ کی شب قدر آج ہے آج (م)

قد اقدس

قد بر جستہ نہ کوتہ نہ دراز
نخل بے سایہ سراپا اعجاز (م)

ہمہ تن جلوۂ رعنائی ہے
سر بسر طلعت زیبائی ہے
" عالم زیبائی " [غالب]

حکایت

نسل سے اوس کی کئی کرسیوں تک
" پشتوں " [غالب]
ویسی ہی عطر کی آتی تھی مہک

ابروے مقدس

سبز اِک رگ تھی میان ابرو
تھی وہ اِک تیر کمان ابرو (م)

چشم مقدس

غیرت طور ہو نامہ میرا
شجر نور ہو خامہ میرا (م)

گاہ آواز الم نشرح لک
گہ صداے و رفعنا ذکرک (م)

اس میں جب نعت کا سودا ہوئے
کیوں نہ اردو یہ معلی ہوئے (م)

موج زن بحر کہ ہے آب حیات
" بحر سے " [غالب]
خضر خامہ ہے سیاھی ظلمات

دهن مبارک

تهی فراخی مگر انداز کے ساتھ

تهی فراخی عجب انداز کے ساتھ

روح داؤد تهي آواز کے ساتھ

شعر کا پہلا مصرع دو طرح تها - حضرت غالب نے 'عجب' کا لفظ قلمزد فرمایا اور 'مگر' کو رهنے دیا -

---

سمجھے هنگام سخن نکته شناس

معنی فیه شفاء للناس (م)

شانۂ معلیٰ

حق نے دی اون کو شهنشاهی دیں

کي عطا مہر نبوت کی نگیں

"سونپ کر مہر نبوت کا نگیں" [غالب]

"نگیں اور نگینه مذکر هے مونث نهیں" [غالب]

پاے دل نشیں

السلام اے نظر رحمت حق

السلام اے اثر رحمت حق (م)

هم هیں یا گوشۂ محرومی هے

سخت مغمومی هے مغمومی هے

"سخت محرومي و مغمومی هے" [غالب]

عاصیوں کے جو یہ دولت ہو نصیب

'' کو '' [غالب]

ملہ تکیں نیک تماشا ہو عجیب

نعت جو لکھی ہے اے پاک نبی

معترف ہیں کہ ہوئی بے ادبی

'' معترف ہوں '' [غالب]

چند دکھنی پہیلیاں

از محمد نعیم الرحمان - ایم - اے

دکھنی ' یعنی جنوبی ' دکھن (سنسکرت دکشن ' جنوب) سے صفت نسبتی ھے - شمالی ھندوستان میں عموماً " دکھن " براعظم ھند کے اُس حصے کے لیے استعمال ھوتا ھے جو طبیعی لحاظ سے ایک جزیرہ نما ھے اور نقشے میں ایک معکوس مثلث کی شکل میں رو نما ھوتا ھے - اس کا ایک زاویہ راس کماری ' ملک ھند کی جنوبی انتہا ' ھے - اس کا قاعدہ شمال میں بندھیا چل پہاڑ کے سلسلے ' مغرب میں نربدا اور تاپتی کی اور مشرقی سمت میں مہا ندی اور گوداوری کی وادیوں اور ان کے نشیب سے مل کر پیدا ھوتا ھے ؛ اور اس کے دو ضلعے مشرقی گھاٹ اور مغربی گھاٹ ھیں - اھل پرتگال سلطنت بیجا پور کو " دکھن " کہتے تھے - بعد میں ' انگریزوں کے محاورے میں اس کا اطلاق اس مرتفع علاقے پر ھونے لگا ؛ جو نربدا اور کرشنا دریاؤں کے درمیان واقع ھے اور جس میں حیدرآباد (دکن) بھی شامل ھے - [۱]

غرض یہ کہ " دکھنی " سے مراد " جنوبی ھند کی زبان " ھے ؛ گو اس ملک کے باشندوں کو بھی دکھنی کہا جا سکتا ھے ' اور کہا جاتا ھے - لیکن اس مقام پر اس کی کچھ تشریح کردینا مناسب ' بلکہ ضروری ' معلوم ھوتا ھے ' کیوں کہ محض زبان یا بولی کے معنی میں بھی اس کے مختلف مفہوم ھیں - مثلاً ' چھوٹا ناگپور کے لوگ اُڑیا زبان کو

---

[۱]—مدراس پریزیڈنسی اڈمنسٹریشن رپورٹ -

دکھنی کہتے ہیں ؛ صوبجات متحدہ کے باشندے (بالخصوص پورب کی طرف) صوبۂ متوسط کے محاورے کو دکھنی سے تعبیر کرتے ہیں ؛ جنوب مغربی پنجاب میں جیپوری بولی کو دکھنی یا دکھندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ؛ گجرات میں مرہٹی زبان کو دکھنی کہا جاتا ہے - اسی طرح اس اصطلاح کا اطلاق نہ صرف حیدرآباد دکن کی اکثر آبادی کی ' بلکہ جنوبی ہند (یعنی دراوڑي قوم کا وطن ' جس میں کل احاطۂ مدراس کے علاوہ میسور ' تراونکور اور کوچین کی ریاستیں اور کرگ کی کمشنری بھی شامل ہے) کے اکثر مسلمانوں کی اُس زبان پر بھی ہوتا ہے ' جو اُردو (یا بقول گریرسن کے '' ہندستانی '') زبان ہی کی ایک بولی ہے - اور یہی آخری '' دکھنی ''— خاص کر وہ بولی کہ جو احاطۂ مدارس اور میسور وغیرہ میں مستعمل ہے— وہ دکھنی ہے جس سے اس وقت مجھے بحث ہے ' اور جس کی چند پہیلیاں ناظرین کے سامنے پیش کرنا میرا مقصد ہے - یہ بولی دکھنی (تین تلفظ کے ساتھ [۱]) اور دکنی کے نام سے موسوم ہے - بہر حال ان سب تلفظوں یا ناموں سے مراد ایک ہی بولی ہے ' اور یہ بولی آج بھی جنوبی ہند کے ایک نہایت وسیع رقبے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے -

دکھنی اپنی عام اور وسیع کیفیات کے لحاظ سے اردو سے بہت زیادہ مشابہ ہے - البتہ تفصیلی کیفیات میں اردو کے محاورے اور صرف و نحو کے قواعد میں وہ ضرور اُس سے مختلف ہے ؛ اور یہی سبب ہے کہ اُسے محض ایک بولی کي حیثیت دی جاتي ہے ' زبان نہیں سمجھا جاتا - مگر گریرسن اسے اُردو زبان کی ایک '' مسلمہ صورت '' تسلیم کرکے

---

[۱]—یعنی کھ کے سکون ' یا تشدید اور زیر ' یا محض زیر کے ساتھ : حرف دال پر ہر صورت میں زیر ہی بولا جاتا ہے -

'' ریختہ '' اور '' ہندی '' کی طرح اُس کا ایک وجود تسلیم کرتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ اگر اُن تمام ادبیات کو دیکھا جائے ' جو نثر اور شعر میں مختلف مضامین پر دکھنی میں پیدا ہو چکی ہیں—عام اس سے کہ وہ کیسی ہی ہوں اور مقابلتاً کیسی ہی کم ہوں—تو گریرسن کے اس قول کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ' اور اسے بھی نہ بھولنا چاہیے کہ گریرسن خود اردو کو بھی '' ہندستانی '' کی ایک صورت قرار دیتا ہے ' اور وہ صورت بتاتا ہے ''جو فارسی خط (یعنی نستعلیق) میں لکھی جاتی ہے ' اور جس کے الفاظ کے ذخیرے میں فارسی (اور عربی) الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں [۱] '' - بالکل یہی کیفیت دکھنی کی بھی ہے کہ اُس میں بھی فارسی اور عربی کے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں ' گو یہ صحیح ہے کہ اردو کے مقابلے میں اُن کی تعداد کم ہے - دکھنی اور اردو میں فارسی (اور عربی) الفاظ کی اس کمی اور کثرت کا سبب دریافت کر لینا کچھہ مشکل امر نہیں ہے ؛ کیوں کہ یہ صاف ظاہر ہے کہ شمالی ہندوستان میں اردو کو فارسی سے جس قدر زیادہ اور قریب کا سابقہ رہا ہے ' اُتنا دکھنی کو جنوب میں نہیں رہا - یہی سبب ہے کہ بمقابلہ اردو کے دکھنی میں ہندوستانی ' یعنی ملکی ' زبان کا جزو زیادہ شامل ہے اور فارسی (اور عربی) کا جزو نسبتاً کم ہے -

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر تفصیل کے ساتھہ یہ بتا دیا جائے کہ بعد کے صفحوں میں دکھنی زبان سے کیا مراد ہے ' اور اُس کی نوعیت اور خصوصیات کیا ہیں - دکھنی زبان مدراس دکن (یعنی مدراس کا احاطہ ' مع تراونکور ' میسور اور کوچین کی ریاستوں ' کرگ کی کمشنری اور مالابار کے) کے اُن

[۱]—گریرسن ' لنگوسٹک سروے آف انڈیا ' جلد ۹ -

مسلمانوں (اور مرهٹه قوم کے چند غیر برهمن لوگوں) کی بولی هے ' جو اپنے آپ کو دوسری مسلمان قوموں (مثلاً لبے ' [۱] راؤتر ' مرکایر ' چولیا اور ماپلا [۲]) سے ممتاز کرکے " دکھنی " کہتے هیں - یہاں اس کی تفصیلی بحث کا موقع نہیں هے ' لیکن حقیقت یہ هے کہ یہ " دکھنی " قوم شمالی هند کے اُن باشندوں اور مرهٹہ قوم کے ان افراد کی اولاد هیں جو وقتاً فوقتاً شمالی فوجوں میں اور اُن کے ساتھ اس جنوبی علاقے میں پہنچے اور وهیں آباد هوگئے - اس کے مختصر سے ثبوت کے لیے غالباً یہ کافی هوگا کہ ایک طرف تو پٹھان اور ترک قوم کے بہت سے خاندان اب بھی وهاں موجود هیں ' دوسرے یہ کہ " دکھنی " میں ایسے بہت سے الفاظ اور محاورے آج تک بولے جا رهے هیں ' جو یا تو خالص مرهٹی زبان کے هیں یا اُس سے ماخوذ هیں - بہر حال یہ ظاهر هے کہ اس قوم کے معزز آبا و اجداد اپنے همراہ شمالی هند کے اطوار اور آداب کے ساتھ ساتھ زبان بھی لے گئے تھے ' اور یہ بہت بڑا سبب اس امر کا هے کہ " دکھنی " لوگوں کی مادری زبان وهی " هندوستانی " زبان هے - لیکن یہ کیوں کر هوسکتا تھا کہ وہ اپنے گرد و پیش کی دراوڑی اقوام اور اُن کی زبان کے اثر سے بالکل محفوظ رهتے - هر وقت کے تعلقات کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ان تمام " دکھنی " خاندانوں نے جہاں جہاں اور جس جس داوڑی قوم کے ساتھ بود و باش اختیار کی ' اُن کی بولی اور اُن کے محاورے اور لب و لہجہ نے بھی

---

[۱]—بلکہ اس سے بہتر اور زیادہ صحیح تلفظ لوے هے -

[۲]—جو انگریزی محاورے میں (بگڑ کر) موپلا هوگیا هے - ماپلا قوم کی زبان ملیالم (یعنی مالا باری) هے ' جس میں عربی کے الفاظ بکثرت شامل هیں ' کیوں کہ باپ کی نسبت سے یہ قوم عربی اصل سے هے - ان کے علاوہ اور غیر دکھنی مسلمان ' جن کا یہاں ذکر هوا هے ' تامل (اصل میں تمِژ) بولتے هیں ' جو ان کی مادری زبان هے -

اُسي قوم کی زبان کے اثر کو قبول کر لیا - چنانچہ مدراس دکن کے تمام
علاقے میں مختلف مقامات پر " دکھنی " بولی تامل ' تلوگو ' ملیالم
اور کنڑی زبانوں کے ہمدوش رہ کر اُن کے رنگ میں رنگ گئی ہے اور
دکھنی بولنے والے بالکل اپنی خاص ملکی دراوڑی زبان کے لہجے میں
گفتگو کرتے ہیں - مگر دکھنی کی خاص شان ہر مقام پر جوں کي توں
باقي ہے ' اور ہر مقام کا " دکھنی " ایک دوسرے کی گفتگو اور محاورے
کو خوبی اور آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے - ان چاروں دراوڑی زبانوں
میں تامل اور تلوگو کا اثر زیادہ نمایاں ہے ' کنڑي کا اُن سے کم ' اور
ملیالم کا قریب قریب برائے نام - یہ اثر خصوصیت کے ساتھ اس
رنگ میں جلوہ گر نظر آتا ہے کہ ایسے " دکھنی " الفاظ اور محاوروں
کی ایک خاصی طویل فہرست اس قسم کی تیار کی جا سکتي
ہے ' جن کو بالکل دراوڑي (مثلاً تامل یا تلوگو) الفاظ اور محاوروں
کا " اردو " ترجمہ کہنا چاہیے - ان ملکی زبانوں کے بعد جس زبان
کا اثر دکھنی نے قبول کیا ہے وہ انگریزي ہے - اس میں وہ ہندوستان
کی اور تمام زبانوں اور بولیوں کے ساتھ برابر کي شریک ہے -
بلکہ یہ ایک حیرت انگیز امر ہے کہ انگریزی زبان اور محاورے
کا اثر جس قدر زیادہ خود تامل اور تلوگو پر پڑا ہے ' اس سے
دکھنی بڑی حد تک محفوظ ہے ' حالانکہ یہ بھی اسی صوبے (مدارس)
کی ایک زبان ہے جسے ' بہ‌نسبت ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے '
انگریز قوم اور اُس کی زبان سے زیادہ طویل تعلق اور سروکار رہا ہے !

یہ تو دکھنی کی خصوصیات کی عام کیفیت ہے - صرف و نحو کے
قواعد کے اعتبار سے دکھني زبان گو اردو سے پورے طور پر متفق اور متحد
نہیں ہے ' لیکن بڑی حد تک اُس سے مشابہ ہے - اس موقع پر بعض

ضروري اختلافات کا بیان نہ صرف دلچسپی کے لحاظ سے ، بلکہ اس خیال سے بھی ضروري معلوم ھوتا ھے کہ ان کو سمجھ لینے سے پہیلیوں کے سمجھنے اور ان کی خوبیوں کی داد دینے میں بہت کچھ مدد ملے گی - سر جارج گریرسن نے اپنی معرکۃالارا کتاب " لنگو اسٹک سروے آف اِنڈیا " (جلد ۹) میں دکھنی زبان اور اُس کي خصوصیات سے بہت اچھی اور مفید بحث کی ھے - لیکن اس تمام بحث کے مطالعے میں یہ خیال رکھنا چاھیے کہ گریرسن نے دکھنی کے متعلق جو کچھ لکھا ھے ، اُس کا ھر ھر حرف لازمی طور پر مدراسي دکھنی کے لیے درست نہیں ھے اور نہ اُس پر پوري طرح اس کا اطلاق ھوتا ھے - لہٰذا یہ ضروري ھے کہ مدراسی دکھنی اور دوسری دکھنی بولیوں میں نہایت احتیاط سے تمیز کی جائے -

اردو اور دکھنی میں اسموں کی جمع بنانے کے قاعدے میں بڑا فرق یہ ھے کہ دکھنی میں ھر اسم کی جمع بنانے کے لیے (عام اس سے کہ وہ اسم کسی اور زبان سے آکر دکھنی میں شامل ھوگیا ھو ، عام اس سے کہ وہ اسم مذکر ھو یا مونث) اُس کے آخر میں "اں" (الف اور نون غنہ) لگا دیتے ھیں ؛ حالانکہ اردو میں مذکر اور مونث اسموں کی جمع مختلف صورتوں سے آتی ھے - اردو کی جمع حروف جار کے عمل سے اپنی صورت بدل دیتي ھے ، مگر دکھنی میں ایک ھی صورت قائم رھتی ھے - علاوہ اس کے اردو میں اسم ، جمع کی صورت میں بھی ، اپنی جنس (یعنی تذکیر یا تانیث کی صفت) کو قائم رکھتا ھے ، مگر دکھنی میں ھر اسم ، عام اس سے کہ واحد صورت میں مذکر ھو یا مونث ، جمع کی صورت میں آکر مذکر ھو جاتا ھے : [۱] مثلاً " عورتوں گئیں "

[۱]—یہ ایک دلچسپ امر ھے کہ عربی زبان میں ، اس کے بالکل برعکس ، یہ قاعدہ ھے کہ ھر جمع جنس کے لحاظ سے مونث تصور ھوتی ھے (کل جمع مونث) -

کو دکھنی میں " عورتاں گئے " اور " کتابیں رکھی تھیں " کو " کتاباں رکھے تھے " کہا جاے گا - جمع کے اس قاعدے سے اعزازی جمع بھی مستثنی نہیں ھے : " والدہ صاحبہ آئے تھے " اور " بیگم صاحبہ گئے " کہا جاے گا نہ کہ " آئی تھیں ' یا " گئیں " -

ضمائر نفسی کے لئے جہاں اردو میں اپنا ' اپنے اور اپنی غائب ' مخاطب اور متکلم تینوں صیغوں میں اُس کا اور اُن کا ' تیرا ' تمہارا ' میرا اور ھمارا کی جگہ استعمال ھوتے ھیں ' دکھنی میں اپنا ' اپنے اور اپنی محض تمہارا ' تمہارے اور تمہاری (صحیح دکھنی ' تمارا ' تمارے ' تماری) کی جگہ استعمال ھوتے ھیں ' مثلاً : " تمیں اپنا کام دیکھو " (تم اپنا کام کرو) " اپنی بات نیاری " (تمہاری بات اور ھے) اور " اپنے گاؤں میں کتے گھراں " (تمہارے گاؤں میں کتنے گھر ھیں ؟) - لیکن ان سب فقروں میں اپنا ' اپنے اور اپنی کی جگہ " تمارا ' تمارے اور تماری " کہنا بھی بالکل صحیح ھوگا - باقی سب حالتوں میں بدستور " اُس ' اُن (کا ' کے ' کی) ؛ تیرا ' تیرے ' تیری ؛ میرا ' میرے ' میری ؛ ھمارا ' ھمارے ' ھماری " ھی استعمال ھوتا ھے -

ایک اور بڑا اور واضح فرق اردو اور دکھنی میں علامت فاعلی (نے) کے استعمال میں نظر آتا ھے - دکھنی میں یہ علامت کسی فعل کے ساتھ استعمال نہیں ھوتی ' حالانکہ اردو میں سوا چند خاص افعال کے ھر متعدی فعل کے ساتھ اس کا استعمال ضروری ھے - قدیم اردو میں "نے" استعمال نہیں ھوتا تھا ؛ دکھنی نہایت وضعداری کے ساتھ اس قدیم طرز عمل پر اب تک کار بند ھے - اس میں شک نہیں کہ دکھنی کے شاعر اور نثر نگار کہیں کہیں " نے " استعمال کر جاتے ھیں ؛ لیکن یہ استعمال

زیادہ تر (اردو کے لحاظ سے) بے محل اور بھدا ہوتا ھے ' مثلاً وہ یوں کہیں کے کہ " اُس نے کہی " (= اس عورت نے کہا) یا " لوتے نے لاؤ " (= لوتا لاؤ) ! مثال کے طور پر نواب غلام غوث خان بہادر (متوفی سنہ ۱۲۷۲ ھجری) المتخلص بہ " اعظم " نواب کرناتک و مدراس کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔ [۱] یا تو وہ یوں فرماتے ھیں کہ :—

عشق میں یـار کے دل اپنا لگاکـر دیکھا
خوب اس شمع کو میں نے بھی جلاکر دیکھا

اور یا اُسی غزل میں یوں بھی فرماتے ھیں کہ :—

سلسلہ برق کو پہنچا ھے دل سوزاں سے
دفتـر داغ کے میں نے جو اُٹھا کـر دیکھا
ایک قطرے کو مرے اشک کے پہنچا نہ کبھی
تو نے اے ابـر کئی سیل بہا کر دیکھا

ایک اور جگہ ھے کہ :—

کیا ادا احساں زباں اس تیر مژگاں کا کرے
مارے دم ھے دل نے جس کے عہد میں منصور کا

افسر اورنگ آبادی کا قول [۲] ھے کہ :—

بے ھوش دیکھ یار نے افسر کو کہ اُٹھا
اس ناتواں کے چہرے پہ چھڑکو گلاب کو

اس " نے " کے نہ ہونے کا لازمی طور پر یہ نتیجہ ہوا کہ دکھنی فقرے میں فعل ' عدد اور جنس کے لحاظ سے ' ھمیشہ اپنے فاعل کی پیروی

---

[۱] —" دکن میں اردو " از نصیرالدین ہاشمی ' صفحہ ۵۹ ' ۶۰ ۔
[۲] — ایضاً ' صفحہ ۱۰۸ ۔

کرتا ہے ' عام اس سے کہ مفعول عدد اور جنس کے اعتبار سے کچھ ہی ہو ' مثلاً : " میں کتاب پڑھا (مرد) یا پڑھی (عورت) " اور " میں انار کھایا (مرد) یا کھائی (عورت) " -

قدیم دکھنی کا [۱] " ہور " (اردو ' ہندی " اور ") آج کل بہت ہی کم استعمال ہوتا ہے - اس کی جگہ اب " بھی " [۲] بولا جاتا ہے ' جیسے : " میں بھی تمیں " (میں اور تم) - اس " بھی " سے ایک اور کام یہ لیا جاتا ہے کہ اسے اسم عدد کے آخر میں بڑھا کر تاکید اور تخصیص کے معنی پیدا کرتے ہیں ' جیسے : دو بھی (دونوں) ' چار بھی (چاروں) اور آٹ بھی (آٹھوں) وغیرہ -

اسمائے اعداد میں دکھنی اس امر میں اردو سے ممتاز ہے کہ گو اُس نے بیس تک کے عدد کے لئے وہی نام باقی رکھے ہیں جو اردو اور ہندی میں رائج ہیں ' مگر اس کے بعد سوا تیس ' چالیس ' پچاس ' ساٹھ..... سو کے ' باقی درمیانی عددوں کے لئے بیس پو ایک ' [۳] بیس پو دو ' بیس پو تین ' بیس پو چار... بیس پو نو ' اور اسی طرح ہر ایک دہائی کے درمیان میں ' استعمال کرتے ہیں ؛ اور اس میں شک نہیں

[۱]—شاعر محرمی سنہ ۱۱۱۳ ہجری میں لکھتا ہے :

جتا حمد ہے سو خدا کوں چ ہے * ثنا ہور صفت بھی اسی کوں چ ہے

زباں ہور نظر دونوں مل بار ہو * چلے ہیں تماشے کو اک ٹھار ہو

(نصیرالدین ہاشمی کی " دکن میں اردو " صفحہ ۵۲) - اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں -

[۲]—اس لفظ کا ٹھیٹھ دکھنی تلفظ (اور بہت سے ہائے مخلوط کے الفاظ کی طرح) " بی " ہے ' اور " تو " (واو مجہول) " بھی " کے ساتھ مل کر بجائے " تو بھی " کے معنی " تبی " کی مخفف صورت اختیار کرتا ہے ' جیسے : " کیا تبی کر لیو " (جو کچھ چاہو کر لو) -

[۳]—زیادہ صحیح طور پر بجائے پو کے پر استعمال ہوتا ہے -

کہ اس قدیم سنادگی نے ان ھندسوں اور عددوں کے کہنے اور سننے والوں
کے لیے جو آسانی بہم پہنچائی ھے وہ اردو اور ھندی کے ناموں میں ھرگز
نہیں ھے -

لفظ " ھیں " کا دکھنی تلفظ " ھیں " (یای معروف سے) ھے -
یہ لفظ جب ماضی قریب اور ماضی معطوفہ کے جمع کے صیغوں میں آتا
ھے تو اسی تلفظ سے آتا ھے ' جیسے : آئے ھیں ' آکو (یا آکر) ھیں ' وغیرہ ؛
لیکن فعل حال کے جمع کے صیغے میں اس کی ہ گر جاتی ھے اور محض
نون غنہ اپنے قبل کی ماقبل آخر "ت" سے مل کر ادا ھوتا ھے ' اور ت پر زبر
بولا جاتا ھے ' جیسے : جانیں (= جاتے ھیں) ' آتیں (= آتے ھیں) وغیرہ -
اسی طرح " ھے " کی ہ بھی (فعل حال میں) گر جاتی ھے - نتیجہ یہ ھے
کہ جاتا ھے ' آتا ھے (وغیرہ) کا تلفظ کچھ اس طرح ھوتا ھے کہ جس میں
ت کی حرکت کو نہ تو محض زبر کہا جاسکتا ھے ' نہ الف - تحریر میں
اسے ناقص طور پر " جاتے (جاتا ھے) اور آتے (آتا ھے) " سے ادا کیا
جاسکتا ھے ؛ لیکن حقیقت یہ ھے کہ بغیر سنے پوری طرح سمجھ میں
نہیں آ سکتا - اس وقت " ھیں " کا ذکر ھو رھا تھا - اس لفظ کے اِس
دکھنی تلفظ سے ھی ظاھر ھے کہ جس حالت میں یہ لفظ اکیلا ھی استعمال
کیا جائے ' تو نہ صرف یہ کہ اس کا تلفظ نہایت ھی مشکل ھے ' کیوں کہ
بولنے والے کو ی کے بعد صرف نون غنہ کا اظہار کرنا پڑتا ھے ' بلکہ سننے
والے کو بھی پوری طرح فائدہ نہیں ھوتا - نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ ایسے موقعے
پر " ھیں " کی جگہ " ھے " کہنا پڑتا ھے - یہ کیفیت ایک مثال سے
بآسانی واضح ھو جائیگی : مثلاً " صاحب گھر میں ھیں کیا ؟ " (کیا
صاحب گھر میں ھیں ؟) کے جواب میں اگر صرف " ھیں " کہنا مقصود
ھو ' تو دکھنی میں " ھیں " کی جگہ " ھے " کہا جاے گا - اس طرح

تلفظ کے عیب اور سماعت کی تکلیف کی وجہ سے بجائے جمع کے واحد کا صیغہ استعمال کرنا پڑتا ھے ' مگر ایسے موقعے پر " ھے " کے معنی " ھیں " (جمع) کے ھی ھوتے ھیں -

بعض الفاظ یا مرکبات کو مخفف کرکے بولنا دنیا کی تمام زبانوں میں رائج ھے - مدراس دکن کی زبانوں میں یہ خصوصیت جس کثرت اور شدت سے تامل زبان میں پائی جاتی ھے اُس کی باقی تین بھنوں میں کم ھے - جو لوگ تامل سے واقف ھیں وہ خوب جانتے ھیں کہ اُس زبان کے الفاظ کی تحریری اور تقریری صورت میں کتنا کچھ فرق پایا جاتا ھے - دکھنی بھی اس خصوصیت سے مستثنیٰ نہیں ھے - لیکن اُس کے تمام مخفف الفاظ میں سب سے زیادہ دلچسپ ' معنی خیز اور نہایت کثرت سے استعمال ھونے والے الفاظ کتا (= کہتا) ' کتے (= کہتے ' کہتے ھیں) ' کتو (= کہے تو) اور ککو (= کر کو یعنی کرکے) ھیں - ان سب میں اصل صورت میں ہ اور ر کی تخفیف ھوئی ھے - اسی طرح جب لفظ کے آخر میں ئی ھو اور اس سے پہلے الف ھو تو وہ الف مخفف ھوکر محض زبر ' یا الف اور زبر کے بیچ بیچ ' کی صورت اختیار کر لیتا ھے ' جیسے : چڑئی (= چڑائی ' یعنی چڑھائی—فعل یا اسم) ' کڑئی (=کڑائی ' یعنی کڑھائی) وغیرہ - اسی میں فعل حال کے الف اور ی کے اُس تلفظ کو بھی شامل کر لینا چاھیے جس کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا ھے -

اردو کا حرف تخصیص "ھی" دکھنی میں محض ایک ساکن چ کی صورت میں نظر آتا ھے - یہ ساکن چ اسم ' ضمیر ' اسم عدد ' اور فعل کے آخر میں لگا دی جاتی ھے ' جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ھوگا :—

(ا)—اسموں کي مثالیں : کاغذ چ ' کھانا چ ' حسینچ ' آدمیانچ
(= کاغذ هی ' کھانا هی ' حسین هی ' آدمی (جمع) هي) -

(ب)—ضمیریں یوں آتی هیں : ووچ (= وہ هي ' غیر جاندار کے
لئے) ' اُنیچ (وہ (انسان ' واحد مرد یا عورت) هي) '
اُنونیچ (وہ انسان ' جمع مرد یا عورت) هی) ' توچ
(توهی) ' تمیچ (تم هی) ' میچ (میں هی) ' همیچ
(همهی) -

(ج)—اسماے اعداد کي مثالیں : ایکچ ' دوچ ' آتھچ ' سوچ
(= ایک هی ' دو هی ' آتھ هی ' سو هی) وغیرہ -

(د)—افعال کي تخصیص کی مثالیں یہ هیں : جاتا چ نیں
(جاتا هی نہیں)'' ماریاچ تھا (مارا هي تھا) - عموماً ان
هی افعال کے ساتھ اس تخصیصی چ کا استعمال هوتا هے -

اسي طرح '' کا ' کے ' کي ' کو (واو معروف سے) ' میں ' سے ' تلک
(واضح هو کہ دکھنی میں لفظ تلک اب بھی متروک نہیں هے) ' پر
(جس کی دکھنی صورت '' پو '' هے) ' والا '' کے آخر میں بھی یہ چ آتی
هے - اسی طرح یاں اور واں (یہاں ' وهاں) کے آخر میں بھی آتی هے -
مرکب صورت میں یہ سب الفاظ '' کاچ ' کوچ ' میچ ' پوچ ' والاچ '
یانچ '' (یعنی.........هی‌کا ' هی‌کو ' میں‌هی ' هی‌پر ' والاهی ' یہیں)
وغیرہ هوجاتے هیں -

دکھني زبان کی ایک اور نمایاں اور دلچسپ خصوصیت یہ هے کہ
اُس میں بہت سے الفاظ میں خفیف حرکت کو اشباعی صورت میں اور

اشباعی حرکت کو خفیف صورت میں بولا جاتا ہے ' مثلاً : عربی لفظ حصیر دکھنی میں " هاسر " اور عروس " آرس اور آرز " ہوگیا ; اور انگریزی لفظ سلائس (slice) محض " سلس " رہ گیا ہے !

حروف ہجا کے تلفظ کے لحاظ سے دکھنی اس امر میں اردو سے بالکل مشابہ ہے کہ اُس میں ث ' س اور ص بالکل س کی طرح ; ت اور ط محض ت کی طرح ; ذ ' ز ' ض ' ظ سب کو ز کی طرح ; ع کو ہمزہ (یا الف [ا]) کی شکل میں ; اور ح کو ہ کی طرح ادا کیا جاتا ہے - لیکن ق کے تلفظ میں یہ فرق ہے کہ (عربی کے اچھے عالموں کے سوا) عموماً سب لوگ اُسے خ کی طرح ادا کرتے ہیں - حروف کے ناموں میں تمیز کرنے کے لئے انہوں نے یہ قابل تعریف طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ ح کو " ھے " (ہ کے زبر سے) اور ہ کو " ھے " (یای مجہول سے) کہتے ہیں ; اسی طرح خ کو " خے " اور ق کو " خاف " کہتے ہیں -

دکھنی زبان کے افعال میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت ماضی مطلق کی ہے ' جس کے آخری الف سے پہلے ی کا آنا ضروری ہوتا ہے ' مثلاً : کرتا سے کیا اور کریا دونوں ہیں ; بولنا سے بولیا ' رکھنا سے رکھیا ' کھولنا سے کھولیا ' ہنسنا سے ہسیا ' وغیرہ ماضی مطلق کی صورتیں ہیں - لیکن الف سے قبل کی اس ی کا تلفظ دکھنی اور پنجابی کے لئے مخصوص ہے - اس کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ نہ وہ صاف طور پر ی معلوم ہوتی ہے ' نہ محض الف ; بلکہ کچھ اس طرح پر ہے کہ

[ا]—میں نے یہاں الف اہل اردو کے مزعومہ مفہوم میں استعمال کیا ہے ' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خود عربی میں الف محض فتحہ (زبر) کی اشباعی کیفیت کا نام ہے ' جس کے اظہار کے لئے اسے تحریر میں استعمال کیا جاتا ہے - اس لحاظ سے الف حرف ہوگیا ہے ' ورنہ وہ محض ایک حرکت ہے -

اس ي سے قبل کے حرف کو ایک خاص انداز سے ھلکا سا جھٹکا دیا جاتا ھے ' جس سے ي کی ایک خفیف سی شان پیدا ھو جاتی ھے - البتہ آھستگی یا توقف اور تامل کے ساتھ بولتے ھوئے یہ ي کسی قدر نمایاں ھو جاتی ھے - شعر میں جب ماضی مطلق آتا ھے ' تب بھی اس کا یہی معمولی تلفظ ھوتا ھے - بظاھر ایسا معلوم ھوتا ھے کہ اس ي کے سبب سے مصرعے کی بحر میں فرق پڑ رھا ھے یا سکتہ واقع ھو رھا ھے ؛ لیکن صحیح دکھنی تلفظ کیا جائے تو عموماً یہ کیفیت نہیں پیدا ھوتی - میں نے عموماً اس لیے کہا کہ دکھنی شاعر عموماً اس امر کي زیادہ پرواہ نہیں کرتا کہ اُس کا مصرعہ بحر کے لحاظ سے پورا اُترتا ھے یا نہیں - مصرعوں کا بڑا یا چھوٹا ھو جانا یا اُس میں سکتہ پڑنا ایسے امور ھیں جن کو دکھنی شعرا کے ھاں کچھ زیادہ اھمیت حاصل نہیں ھے - گو یوں کہنا چاھیے کہ اس لحاظ سے دکھنی شاعر عربی طرز کي پیروی کرتا ھے ' جہاں ایک ھی شعر کے دو مصرعوں کی بحروں میں خفیف سا زحافی فرق قابل اعتراض نہیں خیال کیا جاتا - اردو اور فارسی کا شاعر اس تسامح کو نہایت تکلیف سے برداشت کرتا ھے ' وہ دکھنی اور عربی شاعر سے زیادہ تنگ‌دل اور بخیل ھے - خیر ' یہ تو محض ایک جملہ معترضہ تھا ' حقیقت یہ ھے کہ الف سے قبل کی ي کا ایسا تلفظ ھر موقع پر اسی طرح ادا ھوتا ھے ' اور سنسکرت کي اسی قسم کی ي سے بہت کچھ مشابہت رکھتا ھے - مثال کے لیے دکھنی شاعر غواصی [۱] کے دو شعر پیش کرتا ھوں :

سدا کسب میرا سو اخلاص کر
ترے خاص بندیاں میں ملچ خاص کر

[۱] —" دکن میں اردو " از نصیرالدین ھاشمی ' صفحہ ۲۵ -

(اس میں بلدیاں جمع ہے بلدہ کی ؛ اور ملنج = مجھے) -

جو توفیق پاکر جو بولیا تمام
مبارک گھڑی میں کیا میں تمام

آج کل کے دکھنی شاعر عموماً اس خالص دکھنی ماضی مطلق اور دکھنی جمعوں سے احتراز کرتے ہیں - بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اب انہوں نے اپنے خاص محاورے میں شعر کہنا ترک کرکے اردو کو اپنے اظہار خیال کے لئے اختیار کرلیا ہے - اور اس میں شک نہیں کہ اس سعی میں وہ بہت کچھ کامیاب ہو رہے ہیں - البتہ چھوٹے طبقے کے شاعر (یا متشاعر) عام مذاق کی جو چیزیں تصنیف کرتے ہیں ' وہ اب بھی دکھنی محاورے ہی میں ہوتی ہیں - مگر ایسی تصنیفات کم ہوتی ہیں -

یہ ہے مختصر تفصیل ان چند خصوصیات کی جو دکھنی میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں - چوں کہ اس مختصر تمہید میں زیادہ تفصیل کی گنجایش نہیں ہے ' اس لیے اسی پر اکتفا کرنا مناسب ہے ؛ ان پہیلیوں کے مطالعے سے دکھنی کے الفاظ اور معانی کی اور خصوصیات بھی واضح ہو جائیں گی - اس باب میں مجھے صرف ایک اور خصوصیت بیان کرنی ہے ' جس کے بغیر یہ اجمال بھی غیر مکمل رہ جائے گا ' اور وہ دکھنی کی گفتگو اور بول چال کے عام لہجے اور طرز ادا کے متعلق ہے -

دکھنی بول چال اور لہجے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک راگ کی سی کیفیت ہوتی ہے - یہی کیفیت اہل بہار کی گفتگو میں بھی ہے ' اور بہ نسبت دکھنی کے زیادہ لطیف ہے - جیسا کہ ہر

زبان کے لئے یہ عام قاعدہ ھے ' دکھنی بولنے والوں میں عورتوں کی زبان زیادہ صحیح ' لوچ دار اور پر ترنم ہوتی ھے - بعض بعض جگہ دکھنی لہجہ بہار کے لہجے سے مل جاتا ھے ' مگر عموماً اُس سے جدا ھے - آواز کا یہ اُتار چڑھاؤ ' گلے کا یہ استعمال کچھ دکھنیوں ھی کے لئے خاص ھے - اس کا اظہار تحریر میں مشکل ھے ' یہ صرف سننے سے تعلق رکھتا ھے - مختصر سی گفتگو میں تو اس کا امکان زیادہ نہیں ھے ' لیکن اگر کسی دکھنی سے کافی عرصے تک (خواہ ایک ھی وقت میں ہو) گفتگو کی جائے ' تو ایک اور خصوصیت یہ نظر آتی ھے ' کہ ان کے ھاں چند خاص خاص الفاظ اور جملے ھیں جو بار بار '' تکیۂ کلام '' کی طرح دہرائے جاتے ھیں - یہ ''تکیۂ کلام '' محض شخصی اور فردی نہیں ' کل قوم کی تقریر میں پائے جاتے ھیں ' اور اس میں شک نہیں کہ یہ دکھنی زبان کی حقیقی خصوصیات میں شامل ھیں - ایسے لفظوں اور جملوں کی ایک خاصی اچھی فہرست پیش کی جا سکتی ھے - اُن میں سے اکثر یہ ھیں :—

'' سو ؛ کیا ! کیا کتو (= کیا کہے تو ؛ یعنی ' میری مراد یہ ھے کہ) ؛ مالوم ؟ (= معلوم ؛ معلوم ھے ؟ ' سمجھے ؟) ؛ رھکّر (اس میں رہ بالکل اُسی طرح مخلوط ھے جیسے اچھا میں چھ ' یا پھر میں پھ — دکھنی '' رہ کو '' = تب ' پھر) ؛ ککو (=دکھنی '' کر کو '' = کرکے) ؛ ککو بول کو (= ایسا کہہ کے ' کرکے—ایسا سوچلے ' سمجھنے یا کرنے کے بعد یا ایسا سمجھتے ہوئے) ؛ ھے نا (= ھے نہ—چوں کہ یہ بات اس طرح پر یا یوں ھے ' ایسا ہوتے ہوئے ' ایسی صورت یا حالت میں) ؛ باد ھے نا (=بعد ھے نا — اس کے بعد ' پھر ' پھر کیا ہوا ' پھر یہ ہوا کہ) ؛ ہوگا (=ہو گیا — خیر یہ تو ہوا ' یہاں تک

تو یہ ہوا) ؛ کہا بولے تو (= یعنی ' سمجھے ' میرا مطلب یہ ہے کہ) '
وغیرہ - یہ الفاظ اور جملے وہ ہیں جو ' جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا '
عموماً ہر دکھنی میں گفتگو کرنے والے کی بات چیت میں سنے جاتے ہیں '
ان کے علاوہ شخصی " تکیۂ کلام " کا تو ہر شخص مجاز ہے اور اُس کا
احاطہ نا ممکن - لیکن عجیب تر امر یہ ہے کہ یہ سب الفاظ وغیرہ اس
قدر شد و مد اور ایسی کثرت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ' اور ان کی
وجہ سے تقریر ایسی غیر ضروری طور پر طویل ہو جاتی ہے کہ غیر دکھنی
سننے والا تھوڑی ہی دیر میں عاجز ہونے لگتا ہے - ایک چھوٹی سی بات '
جو بمشکل تین منٹ میں ادا ہو سکتی ہے ' ایک ٹھیٹھ دکھنی بولنے
والے کے منہ میں پہنچ کر ضرور کم سے کم دس منٹ میں ادا ہوتی ہے -
وہ بولتے بولتے بار بار کچھ تامل کرتا ہے ' اور ان الفاظ میں سے کسی سے
(حسب موقع) مدد لےکر پھر آگے بڑھتا ہے ' اور اس طرح ایک تھکا دینے
والے طول سے کام لینے کے بعد کہیں اپنی تقریر ختم کرتا ہے - اُس کی
تقریر سننے کے دوران میں سننے والے کو کچھ ایسا محسوس ہوا کرتا ہے
کہ بولنے والے کے پاس اپنے خیال کے اظہار کے لیے کافی اور مناسب الفاظ
نہیں ہیں ' اور وہ اُن کو تلاش کرکے استعمال کرنے کے لیے بار بار چند
سیکنڈ کے لیے ان تکیہ کلامی لفظوں سے مدد لینے پر مجبور ہوجاتا ہے -
جہاں تک میں اس عجیب و غریب امر پر غور کرسکا ' اور جہاں تک میں
نے اس کا اندازہ کیا ' مجھے یہی معلوم ہوا کہ دکھنی زبان میں الفاظ کی
تعداد واقعی محدود اور ہر قسم کی ضروریات کے لیے نا کافی ہے - یہ کہنا
تو کسی طرح صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ دکھنی زبان میں الفاظ ہمیشہ
سے ناکافی تھے ' کیوں کہ قدیم دکھنی شاعروں اور نثر نگار مصنفوں کی
تحریریں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ قریب قریب ہر نوع کے

خیال کے اظہار کی قوت رکھتے تھے - لیکن اب یہ حال ہے کہ دکھنی بولنے والوں میں ایسے افراد روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں جو " عاقل نظر بلند " اور " عالم پناہ " جیسے مقبول عام دکھنی قصوں کی زبان کو پوری طرح سمجھ سکیں - البتہ پرانے بوڑھے اور بوڑھیاں ' جو اب تک موجود ہیں ' اور کم سواد یا جاہل لوگ ضرور ان پرانے محاوروں اور الفاظ سے آشنا ہیں اور ان منظوم قصوں کو (بہ نسبت تعلیم یافتہ لوگوں کے) زیادہ آسانی اور خوبی سے سمجھ سکتے ہیں - یہی سبب ہے کہ یہ قصے زیادہ تر ایسے ہی کم سواد لوگوں اور عورتوں میں زیادہ مقبول ہیں ' اور نہایت شوق و ذوق سے پڑھے جاتے ہیں -

اس کے دو ہی سبب ہوسکتے ہیں : ایک تو یہ کہ اِدھر ایک صدی یا اس سے کچھ ہی زاید سے مدراس دکن میں فارسی کا زیادہ دور دورہ رہا - انگریزوں کی آمد کے وقت اُسی کا زیادہ زور تھا ' اور لکھے پڑھے لوگ عموماً دکھنی کی طرف راغب نہ تھے ؛ دوسرے یہ کہ خود دکھنی بولنے اور لکھنے والے اُس کی طرف سے ایسے بےغرض اور لاپرواہ سے ہوگئے ' اور اب بھی ہیں ' اور دوسری زبانوں (بالخصوص اُردو) اور اُن کے محاورے کے استعمال میں مصروف اور غرق ہوکر اپنی زبان اور اپنے محاورے کی پرداخت سے ایسے غافل ہیں کہ بولتے وقت اُن کو الفاظ تلاش کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے - اور اس ضرورت کو وہ اس طرح رفع کرتے ہیں کہ اپنی گفتگو کے درمیان میں ان مذکور لفظوں اور جملوں کو بار بار استعمال کرکے تقریر کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں - ادھر جب سے حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی ہے ' اور اُس نے اُردو زبان کو اپنے نصاب تعلیم کے لئے واحد ذریعہ قرار دے دیا ہے ' اس نے نہ صرف ممالک محروسہ سرکار نظام میں بلکہ مدراس دکن کے دکھنیوں میں بھی اُردو کی ایک نئی

روح پھونک دی ھے ؛ اور یہ روح ھر دکھنی کی تقریر اور تحریر میں کار فرما نظر آرھی ھے ۔ یہ ناممکن ھے کہ اس نئی روح اور اُس کی کیفیت سے ھر تعلیم یافتہ دکھنی متاثر نہ ھو - اور اس کا ایک بدیہی نتیجہ یہ بھی ھے کہ " دکھنی " محاورہ اب نہایت سرعت کے ساتھ اپنی زندگی کے دن ختم کرے اور بالاخر اپنا چولا بدل کر وھی شکل اختیار کرلے جو یہ جدید رو اُسے اختیار کرنے پر مجبور کرے - ایسی صورت میں یہ امر نہایت ضروری ھے کہ اس قدیم زبان کے آثار کو ایک مستقل اور پیہم کوشش کے ذریعے کم از کم کتابوں کے اوراق ھی میں محفوظ کردیا جائے - جامع عثمانیہ کے ھونہار طیلسانیوں نے یہ کام نہایت جوش اور خوش اسلوبی سے شروع کردیا ھے ، اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی تحریروں سے اپنے ملک اور اپنی قدیمی زبان کی بہت بڑی خدمت کر رھے ھیں - ان کی نگاہ لطف سے مدراس دکھنی بالکل محروم تو نہیں ھے ؛ لیکن حق یہ ھے کہ انہوں نے اس طرف اب تک کافی توجہ نہیں کی ھے - اصل یہ ھے کہ یہ کام خود مدراس دکن کے نوجوانوں کا ھے ؛ اور آثار ایسے ھیں کہ وہ بہت جلد اس طرف متوجہ ھونگے -

ھر قوم کی ھستی کا احساس کرنے اور اُس کی زندگی کی کیفیتوں کو سمجھنے میں اس کی تاریخ کے علاوہ اُس کی روایات ، اُس کی زبان ، اُس کے قصے اور گیت ، اُس کی کہاوتیں ، مثلیں اور پہیلیاں بھی بہت کچھ مدد دیتی ھیں - آئندہ صفحوں میں دکھنی زبان کی پہیلیوں کا ایک مجموعہ پیش کیا جاتا ھے ، جس سے دکھنی قوم اور اُس کی زبان پر خاصی روشنی پڑتی ھے -

دکھنی میں پہیلی کو " مسلا " (عربی : مسئلہ) کہتے ھیں ، اور اُس کی جمع مسلے آتی ھے - دنیا کی اور سب زبانوں کی طرح دکھنی مسلے

بھی بالکل سادہ اور روز مرہ محاورے میں ھیں - یہ اُن بڑی بوڑھیوں کی زبان ھے ' جو ھر روز شب کو سونے سے پہلے اپنے پوتا پوتیوں اور نواسا نواسیوں کے ایک جھرمٹ میں بیٹھ کر پہیلیاں کہا کرتی ھیں اور اس طرح نہ صرف اُن کے لیے ایک دلبستگی کا سامان فراھم کر کے وقت کو ھنسی خوشی میں گزارتی ھیں بلکہ ان کی عقل و دانش بھی بڑھاتی ھیں ؛ اور وہ معصوم اِن پہیلیوں کو بوجھنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے جلدی جلدی اور نہایت جوش اور وثوق کے ساتھ جواب دیتے اور آپس میں جھگڑتے جاتے ھیں - یہ صحیح ھے کہ ان پہیلیوں کی زبان اور محاورہ ایسا چست اور منجھا ھوا نہیں ھے جیسا کہ اُردو کی پہیلیوں کا ھوتا ھے - کہا جاسکتا ھے کہ اس قسم کا مقابلہ ھی کیوں کیا جائے ؛ ھر ایک زبان کی اپنی اپنی خصوصیات ھیں ' جو اُس کے ساتھ وابستہ ھوتی ھیں ' اور انہیں خصوصیات کے لحاظ سے یہ مطالعہ ھونا چاھیے - یہ کہنا بے جا تو نہیں ھے ' لیکن ان پہیلیوں کے مطالعے سے ضرور اس امر کا احساس ھوتا ھے کہ یہ بالکل ممکن تھا کہ ان کی زبان اس سے زیادہ چست، اور مربوط ھوتی - پہیلیوں کی عام شان ان دکھنی مسلوں میں بھی پائی جاتی ھے کہ ان میں اکثر قافیے سے کام لیا گیا ھے - لیکن اُس میں بھی اُسی شکایت کا موقع باقی ھے کہ جا بجا اس قافیہ پیمائی میں بہت کچھ ڈھیل ھے ' چستی کی کمی ھے - توریہ اور ذومعنی الفاظ کا استعمال بھی موجود ھے ' لیکن زیادہ نہیں ھے - اس کا یہ سبب نہ سمجھنا چاھیے کہ دکھنی میں ایسے الفاظ کا ذخیرہ نہیں ھے جو توریہ اور ایہام کے طور پر استعمال ھو سکیں ؛ بلکہ معلوم ایسا ھوتا ھے کہ دکھنی پہیلیاں بنانے والے اس کو تعقید اور گنجھلک شمار کرکے زیادہ تر نظر انداز کر جاتے ھیں - ایک اور خصوصیت جو ان پہیلیوں میں نظر آے گی وہ یہ ھے کہ اکثر پہیلیوں میں ایک ھی بات کو دھرایا گیا ھے ' اور کسی قدر تبدیلی کے ساتھ وھی بات

بار بار کہی گئی ہے - جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ' دکھنی زبان اور اُس کی طرز ادا کی یہی کیفیت ہے کہ اُس میں تکرار زیادہ ہے ' اور یہی کیفیت ان پہیلیوں میں پائی جاتی ہے -

بہت ممکن ہے کہ بعض پہیلیوں کے متعلق پڑھنے والے یہ اعتراض کریں کہ اُن کی زبان یا اُن کا مضمون ' یا طرز ادا ایسا نہیں ہے جسے پورے طور پر سنجیدہ یا مہذب کہا جاسکے - مجھے تسلیم ہے کہ ایسی پہیلیاں ضرور اس مجموعے میں موجود ہیں - اور اس کی دو صورتیں ہیں : یا تو سادہ یا ذومعنی الفاظ میں اس نوع کی باتیں کہی گئی ہیں ' یا ایک مہمل سی بددعا اور کوسنے کے انداز میں - پہلی صورت کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مجھے خود بھی حیرت ہے کہ بچوں سے اس قسم کی باتیں کیوں کی جاتی ہیں جو تہذیب اور متانت سے گری ہوئی ہیں کیوں کہ اس حقیقت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ پہیلیاں اصل میں بچوں ہی کے کان اور ذہن کے لیے وضع ہوتی ہیں نہ کہ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے - حق یہ ہے کہ میں نے اس انتخاب میں اور بہت سی ایسی پہیلیوں کو حذف کر دیا ہے جن پر یہی الزام آسکتا تھا ' اور جو اس مجموعے میں شامل ہیں وہ بلا شبہ کم ضرر ہیں اور انداز بیان میں بہت کچھ متین ہیں - رہی دوسری صورت ' یعنی بددعا اور کوسنے کا انداز ' اس کی ایک صاف وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح سننے والوں کو پست ہمتی سے روکنا اور معقول غور کے بعد جواب دینے پر برانگیختہ کرنا مقصود ہے اور بس - تاہم ایسی پہیلیوں کو پڑھنے اور سننے کے بعد لامحالہ یہ خیال آتا ہے کہ کیا اچھا ہوتا کہ معصوم ذہنوں کو اس لغویت اور تشدد سے محفوظ ہی رکھا جاتا - میں نے ایسی پہیلیوں کو اس مجموعے میں اس خیال سے شامل رہنے دیا ہے کہ دکھنی مسلوں کی یہ

ایک شان بھی نگاہ سے اوجھل نہ رہنے پائے - اس مجموعے میں ایسی پہیلیاں بھی ہیں' جن کو پڑھنے اور ان پر غور کرنے کے بعد بھی کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے ' کیوں کہ اصل میں ان کے کوئی معنی ھی نہیں ہیں ' مگر یہ ضرور کہا جاتا ھے کہ یہ پہیلی فلاں مضمون کی ھے اور اس کی بوجھ یہ ھے ! اس طرح ایسی پہیلیاں بالکل چیستان در چیستان ہوکے رہ گئی ہیں - میں نے ان کو سمجھنے اورسمجھانے کی کوشش کی ھے ' مگر ایسے مقامات کے لیے ' کہ جہاں میں ان کے مطلب کو سمجھنے سے قاصر رہا ہوں ' سوا معافی طلب کرنے کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں - ممکن ھے کہ پڑھنے والے ان کو حل کرسکیں - میں اس بارے میں اپنے شرح صدر کا منتظر رہوں گا -

بہر حال اس مجموعۂ نغز کے مطالعے سے ان پہیلیوں کی عام دل کشی اور دل آویزی کا اندازہ ہوگا ' اور اگر کہیں کوئی چیستان پڑھنے والے کی طبع نازک کو ناگوار بھی گزرے تو کم از کم اس بنا پر ضرور معافی کے قابل ہوگی کہ یہ چیزیں عالم فاضل لوگوں اور بڑے بزرگوں کے لیے نہیں ہیں ' نہ وہ اس کا موضوع ہیں اور نہ خاص طور پر ان کے کانوں کے لیے بنی ہیں - ان سے روزانہ لطف اندوز ہونے والے زیادہ تر اور عمومی طور پر عورتیں اور بچے ہیں ' اور چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کے لیے زیادہ نفاست اور نازک خیالی کی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں ھے بلکہ یہ لطافت کی خوبیاں اور باریکیاں ان کی نازک طبیعتوں کی نسبت سے بھی اور وقت کے لحاظ سے بھی کچھ زیادہ مناسب نہیں ہیں - یہ پہیلیاں دکن (بلکہ صحیح تر ' مدراس دکن) کے بچوں ' ان کی بوڑھی دادیوں ' اور ان کی سادہ لوح ماماؤں اور کھلائیوں کے مزاج اور اور طبیعت کی سادگی اور معصومیت کی آئینہ دار ہیں - ان کے مطالعے

سے وہاں کے باشندوں کے اوضاع و اطوار ' خیالات و افکار اور تفریحی مشاغل کے متعلق آسانی سے ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں ' جن کے لیے ایک طویل زمانے کی محنت اور کتب خانوں کی کوہ کنی درکار ہے - ان پہیلیوں کی قدر و قیمت کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے کہ ان میں دکھن کی ہندستانی بولی اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر آتی ہے ' اور زبان کی نزاکتیں ' لطافتیں ' باریکیاں اور توڑ مروڑ اپنے حقیقی انداز اور رنگ میں جلوہ گر ہیں - غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اہل دکن کے اوضاع و اطوار اور معاشری حالات اور کوائف کا مطالعہ ان پہیلیوں کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا - بہرکیف مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ ہر پڑھنے والے کے لیے کسی نہ کسی نوع کی دلچسپی کا سامان ضرور بہم پہنچا سکے گا - اس مختصر پیشکش کے لیے یہی فوز عظیم ہے کہ یہ تفریح اور بصیرت دونوں کے لیے معاون ثابت ہو -

اب صرف ایک اور ضروری امر یہ عرض کرنا باقی ہے کہ اس مجموعے میں شروع سے آخر تک ہر جگہ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ تمام الفاظ خالص دکھنی لہجے میں ادا ہوں - عربی فارسی وغیرہ زبانوں کے الفاظ کو جس طرح اہل دکن کی زبان اور کام و دہن ادا کرتے ہیں ' بالکل اسی طرح ان صفحات میں درج کیا ہے ؛ کسی جگہ ان کے تلفظ میں تصرف نہیں کیا -

پہیلیوں کی تقسیم اور تبویب مضمون کے لحاظ سے کی گئی ہے - ہر پہیلی کی بوجھ پہیلی کے بعد ہی دے دی گئی ہے - بعض پہیلیوں کے آخر میں فائدے کے ذیل میں بعض ایسے امور کی تشریح اور توضیح کر دی گئی ہے ' جن کے سمجھ لینے سے پہیلی کا پورا لطف حاصل

ہوجاتا ہے - خالص دکھنی الفاظ کی وضاحت کے لیے سب سے آخر میں ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے -

آخر میں مجھے اپنے ان مکرم احباب کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی وساطت اور مدد ان پہیلیوں کے جمع کرنے اور بعض دقیق اور نازک مقامات کی تشریح میں شامل حال رہی ہے - جناب حکیم محمد غوث صاحب کا احسان سب سے زیادہ ہے - جناب حکیم محمد غیاث صاحب نیلوری ' اور جناب سید محمد قاسم صاحب(جو اُن دنوں شہر مدراس میں پولیس کے ڈپٹی کمشنر تھے) اب اس دنیاے آب و گل کی قیود سے آزاد ہیں ؛ مگر مجھے یقین ہے کہ ان کی پاک روحیں میرے اظہار شکر کو قبول فرمائیں گی -

---

ثناالله خاں ' فراق

از محمد اجمل خان - ایم - اے

اُردو زبان کي تاریخ لکھنے والوں کے لئے اب تک کافی سامان مہیا نہیں ہے - اسکی وجہ یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے مٹ جانے کے باوجود عرصہ دراز تک فارسی ہی زبان ہندوستان میں رائج رہی - اور بچوں کی ابتدائی تعلیم بھی فارسی ہي سے شروع کی جاتی تھی - انگریزی زبان کے رواج سے پہلے فارسی ہی کے ذریعہ سے جملہ علوم و فنون متداولہ کی تعلیم دي جاتی تھی - حتیٰ کہ طالبعلم عربی پڑھنا چاہتے تھے اُن کو بھی قواعد زبان عربي - تراجم - لغات - حواشی اور دیگر متعلقات کے لئے فارسی ہی کا ممنون احسان ہونا پڑتا تھا - اور اُردو کی طرف بہت ہی کم توجہ کی جاتی تھی -

ہندوستانی طرز معاشرت میں ایران کا رنگ غالب تھا - اور ہونا چاہئے بھي تھا - اِس لئے کہ مسلمانوں کی نشو و نما اگرچہ عرب سے ہوئی تھي لیکن بنو امیہ کے بعد جب بنو عباس کا دور حکومت شروع ہوا اور مختلف اقوام و ملل سے عربوں کا میل جول بڑھا - تو ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑی - جسکي جڑ عربی تھی اور پھول پتے ایرانی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے - عربی مسلمانوں کي ابتدائی زندگی نہایت سادہ تھي - یہ سادگی اُن کے فطري اور جغرافي ماحول کا لازمی نتیجہ تھی - ہر طرف ریگستان ہی ریگستان تھا - جسمیں نہ سبزہ زار و مرغزار تھے نہ آب رواں و جوئبار - اُن کي ضروریات زندگی بھی قدرتاً بہت کم تھیں - اور اُونٹ - گھوڑے - کھجور اور تلوار کے علاوہ وہ کسی مضمون پر زیادہ غور نہیں کرنا چاہتے تھے - مکانات

بھی نہ تھے اسلئے کہ پانی کی تلاش میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی - حتیٰ کہ جب عشق کیا جاتا تھا - (اور عشق کے لئے تمدن کے مختلف مدارج طے کرنے کی ضرورت نہیں) تو معشوقہ کے اُجڑے ہوئے خیمے کا ذکر کرنا اور منزل بہ منزل پھرنا ہر عاشق و شاعر کا شیوہ تھا -

" قِفانبکِ من ذکری حبیب و منزلِ "

عربی زندگی کی اس انتہائی سادگی پر جب مشاطئہ ایران نے کارفرمائی شروع کی - تو جس طرح سادہ کاغذ پر ہر طرح کے نقش و نگار قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے ' اُسی طرح عربوں کی مدنیت نے بالکل ایرانی رنگ اختیار کرلیا - خیموں کی جگہہ عالیشان محلوں نے لے لی - لکڑی کے پیالوں اور کھال کے فرش کے بجائے نقرہ و زر کے ساغر و جام اور حریر و دیباج کے پردے نظر آنے لگے - شیروں کی گرج اور باد سموم کے تھپیڑوں کو شعرانے نغمہائے عندلیب اور نسیم سحر کی اٹھکھیلیوں میں تبدیل کر دیا - غرضکہ ایک عامی سے لیکر خلیفہ تک ایسے رنگ میں رنگ گیا جو عرب کی روایات سے کوسوں دور تھا - کہاں وہ خلفائے راشدین کی بوسیدہ کھجور کی چٹائی - اور کہاں وہ خلفائے عباسیہ کا پرشکوہ قصر خلافت - اس " تفاوت رہ " کو اگر آپ موجودہ مذہب اسلام میں دیکھنا چاہیں تو آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ سچا ' سادہ اور فطری مذہب بھی عرب سے نکل کر ایران کے اثر سے نہ بچا - اور تصوف کے نام سے ایرانی شعراء نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈال دی جو حقیقت میں ایک مجموعہ ہے فلسفہ ایران (زرتشت و مانی) اور عقائد اسلام کے عمل اور رد عمل کا -

غرض کے جس طرح ایرانی تہذیب نے عربوں کو مسحور کرلیا تھا - اُسی طرح ہندی معاشرت نے بھی اُسکا پورا خیر مقدم کیا - اور ویدوں کی فطرت پرستی کے دلدادہ بھی جو اس دنیا کو مایا اور فریب نظر سمجھتے تھے ایرانی " امروز " پر ہندی " فردا " کو قربان کرنے پر طیار ہوگئے اور خیام کے ہمزبان ہوکر کہنے لگے -

روزے کہ ز تو گزشت آں را یاد مکن
فـردا کہ نیامد است فریاد مکن
از آمدہ و گـزشتہ بنیاد مـکن
حالا خوش باش و عمر برباد مکن

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اُردو شاعری پر ایرانی زبان کا اثر ہوا - بلکہ اُردو شاعری کو ہندی ماحول نے بہت کم متاثر کیا اور بہار و خزاں - حسن و عشق - رزم و بزم - ادب و تاریخ غرض کہ ہر چیز ایرانی نقطۂ نگاہ سے دیکھی جانے لگی - روز مرہ کی خط و کتابت بھی فارسی میں ' لباس بھی فارسی میں ' کھانا بھی فارسی میں پہننا بھی فارسی میں ' مرنا بھی فارسی میں جینا بھی فارسی میں ' حتیٰ کہ خواب بھی فارسی میں دیکھنے لگے - نتیجہ یہ ہوا - کہ وہ خیالات جو محسوسات و تجربات انسانی سے پیدا ہوتے تھے ' اب صرف کتابوں کے ذریعے سے شعراء و مصنفین کے دماغوں سے عوام کے دماغوں میں منتقل ہونے لگے اور وہ حقیقت سے کوسوں دور ہوگئے -

اس خیالی جنت میں جو لوگ زندگی بسر کرتے تھے وہ شعرا اُردو کے شاعر تو تھے ' لیکن اُن کی شاعری زبان فارسی کی ایک ایک

ادا کی مرهون منت تهی - اور خالص هندوستانی جذبات و محسوسات کي ترجمانی سے اسے دور کا بهی لگاؤ نهیں تها - اِس زاویۂ نگاہ سے اگر نظم اُردو کی تاریخ لکهی جائے ' تو بجائے اس کے کہ شعرا کو زمانے کے اعتبار سے مختلف ادوار میں تقسیم کیا جائے ' مناسب یہ هوگا کہ شاعر کی زبان اور خیالات کے اعتبار سے دور قائم کئے جائیں - مثلاً جو شعرا فارسی کی پیروی کرتے هیں اُن کو " اُردو کے فارسی شاعر " کہا جاسکتا ھے اِسي طرح جو سنسکرت کی پیروي کریں اور هندوستانی تخیلات کی بنا پر اپنی شاعري کي عمارت بنائیں اُنهیں " اُردوکے هندی شاعر " کے نام سے پکارا جاسکتا ھے - بعض شعرا انگریزی اور یوروپین شعرا کی تقلید میں شعر کہنے کی کوشش کرتے هیں - اس قسم کے شاعروں کو " اُردو کے یوروپین شاعر " کہ سکتے هیں - اِس طرح شاعر کے زمانۂ حیات کو نظر انداز کرنا پڑیگا - اور یہ دیکھنا هوگا کہ فی الحقیقت شاعر کی شاعري کس قسم کی ھے - اِسی نقطۂ نظر سے اگر آپ صاحب " وقائع ثنا " [ا] شاعری پر نظر ڈالینگے تو معلوم هوجائگا کہ اگرچہ پانی پت کی تیسري لڑائی کو (۱۷۶۱) کے بعد انهوں نے وقائع ثنا کو تصنیف کیا ھے لیکن اُنکي زبان اور شاعری سے یہ معلوم هوتا ھے کہ وہ اُردو کے ابتدائی دور کے شاعر هیں اور باوجودیکہ زبان فارسی سے واقف هیں لیکن هندوستانی خیالات اور واقعات کو هندی جذبات کے اصلی رنگ میں ظاهر کرتے هیں - اسلئے اُنهیں اُردو کا هندی شاعر کہ سکتے هیں - اس لحاظ سے هم فراق کو دور ثانی ' کی اُردو کا فارسي شاعر کهیں تو بیجا نہ هوگا -

---

[ا]—رسالۂ هندوستانی بابت اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ ع -

* نام و نشان فراق *

صاحب تزکرہ گلشن بیخار نے فراق کے متعلق لکھا ھے :—

فراقؔ تخلص - حکیم ثنااللہ خاں - برادر زادۂ ھدایت خان - ھدایت تخلص - از مشاھیر اھل سخن جہان آباد است - و از خواجہ میر درد ھم کسب باطن وھم کسب شعر نمودہ - درطب شائستہ مہارت داشت - فکرتش شستہ و صاف - طبعش خالی از اعوجاج واعتساف - وفاتش را سالے چند آمدہ - صاحب دیوان است - ایں اشعار اوراست ' اس کے بعد ۱۳ شعر فراق کے درج تزکرہ کئے ھیں -

صاحب تزکرہ اردو فراق کو متاخرین کے زمرے میں شامل کرتے ھیں یعنی یہ اُس زمانے میں جبکہ تزکرہ اردو لکھا گیا زندہ تھے - عبارت یہ ھے - میاں ثنااللہ - فراق تخلص ' برادر زادۂ میاں ھدایت از شاعران حال است - در شاھجہاں آباد می ماند شنیدہ ام کہ شعر خود بخدمت خواجہ میر درد میگزراند - مربوط می گوید - از وست -

دل دیوانۂ عاشق کو ناصح رنج راحت ھے -

جراحت پر مرے جو سنگ ھے سنگ جراحت ھے

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ھوتا ھے - ثنااللہ خاں طبیب تھے اور دھلی کے رھنے والے تھے - تذکرہ گلشن بیخار کی تاریخ تصنیف ۱۲۵۰ھ ھے - اور فراق ۱۲۵۰ھ سے چند سال پہلے انتقال کرچکے تھے - خواجہ میر درد کا انتقال ۱۱۹۹ھ میں ھوا ھے - فراق کو درد سے جو نسبت تھی اسی لحاظ

سے مندرجہ ذیل اشعار فراق کی عقیدتمندی پر کافی روشنی ڈالتے ہیں :—

۱ فیض صحبت سے ہوا ہوں درد کی باغ و بہار
ورنہ اس گلشن میں جوں خار و خس ناکارہ تھا

۲ حضرت اُستاد نے سنکر کہا تحسین فراق
شعر میرا اس زمین میں بسکہ درد آموز تھا

۳ سایۂ بال ہما کچھہ نہیں درکار مجھے
حضرت درد کا سایہ رہے سر پر میرے

۴ فراق ایسی ہی کہہ کر غزل تو یہ اچھا
کہ میر صاحب و قبلہ بھی واہ واہ کریں

۵ روضہ پہ خواجہ ناصر صاحب کے کچھہ پڑے تھا
خط شعا سے سورج جھاڑو دیا کرے ہے

مندرجہ ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ فراق نے کافی عمر پائی تھی اور بوڑھے ہو کر وفات پائی تھی :—

۱ پیری میں اُتھا پردۂ غفلت کو تو دل سے
کرتی ہے مسافر کو ضرور وقت سحر خواب

۲ رتبہ یہ ریختی کا پہنچے گا آسماں تک
گر عمر نے وفا کی اپنی فراق چلدے

* دیوان *

دیواں میں سوائے غزلیات کے دوسری صنف سخن نہیں ہے۔ آج سے کم و بیش ڈیڑہ سو سال پہلے کا کلام ہے - اس لحاظ سے اردو کی ارتقائی کیفیت

کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے دلچسپ ہوسکتا ھے - مجھے یہ دیوان ریاست بھوپال میں ملا - کلکتہ - بھوپال - حیدرآباد - الہ آباد اور لکھنؤ کے کتاب خانوں میں اس دیوان کو میں نے نہیں دیکھا - ممکن ھے کہ دھلی میں کسي ذخیرہ میں ہو تو ہو ھارڈنگ لائبریري میں نہیں ھے -

* اُردو کا فارسی شاعر *

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ فراق اُردو کا فارسی شاعر ھے - یعنی فراق کی شاعری فارسی شاعری کے نقش قدم پر چلتي ھے اور اُس میں فارسی بندشوں اور ایرانی خیالات کی فراوانی ھے - جتنی صنعتیں ہیں ، خواہ لفظی ہوں یا معنوي سب فارسی سے ماخوذ ہیں - لیکن زمانے کے اعتبار سے وہ متوسطین شعرائے اُردو کی زبان لکھتے ہیں - اور ایسا معلوم ہوتا ھے کہ گو قدیم محاورات کو ترک کر دیا ھے لیکن ضرورت شعری کے لئے اُن کا استعمال بالکل ناجائز قرار نہیں دیا - نمونے کے طور پر مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں :—

۱ دست رنگیں میں وہ تیرے خنجر خوں ریز تھا
جسکا دستہ دستہ ھائے گل سے رنگ آمیز تھا

قتل کا انکار گر تونے کیا تو کیا ہوا
وہ ترا دست نگارین ہم کو دستاویز تھا

جسکے آگے کچھہ صبا کی بھی بندھے ہرگز نہ باد
تیز رو ایسا ھماری عمر کا شبدیز تھا

تیري ہی دولت سے اے باد صبا یہ صبحدم
برگ گل سے سب خیاباں چمن زر ریز ھے

ساغر و مینا ہی کچھ ساقی نہ تھے چشم پر آب
دیدہ و دل بھی جو دیکھا خون سے لبریز تھا
حضرت اُستاد نے تحسین کہا سن کر فراق
شعر اپنا اِس زمین میں بسکہ درد آمیز تھا

۲ ہر جا ہے زمین پر اثر اُس دیدۂ تر کا
محتاج نہیں ہوں میں غرض آب خضر کا
لازم ہے رگ گل سے مرے زخم کو سینا
نازک ورق گل سے بھی ہے زخم جگر کا
دل اپنا لگا اس کے دہن اور کمر سے
افسوس کہ ایدھر کا ہوا میں نہ اودھر کا
جوں ریگ رواں خاک نشیں ہوں میں ازل سے
نے قصد وطن کا نہ اِرادہ ہے سفر کا
مژگاں کے ہو کیونکر یہ دل زار مقابل
سو تیغ کے آگے چلے کیا ایک سپر کا
تجھ مصحف رخسار کو میں مد نظر کر
دیکھا تو کہیں فرق نہیں زیرو زبر کا
فریاد مری سن کے ہوا اور وہ برہم
بندہ ہوں فراق اپنے میں نالوں کے اثر کا

مندرجہ بالا دو غزلیں ردیف الف سے لی گئیں ہیں - تقریباً اِسی قسم کا پورا دیوان ہے - اِس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ شاعر نے اُسی شاعری کی تقلید کی ہے جسے فارسی شاعری کہتے ہیں -

* دور قدیم کی ترکیبیں *

بہت سی ترکیبیں ، لفظ اور محاورے جو " فراق " کے زمانے میں رائج تھے اب متروک ھیں ؛ جیسے کے تئیں ، نت ، تک ، سیتی وغیرہ -

۱ اے کاش یہ بلائیں سر اپنے سے ٹالتا
زنجیر زلف کی نہ گلے بیچ ڈالتا

۲ لے چلے دل کو اُڑا نظروں کے بیچ
چوریاں ھم نے تمھاری پائیاں

۳ نہ دین و دل ھے اپنے پاس نے صبرو شکیبائی
عزیزاں ماجرا پوچھو نہ کچھہ اپنی تباھی کا

۴ تجہ مصحف رخسار کو میں مد نظر کر
دیکھا تو کہیں فرق نہیں زیرو زبر کا

۵ مصور اُسکے ابروکی اگر تصویر کھینچے گا
دوانہ ھوکے وہ اپنے اُپر شمشیر کھینچے گا

۶ ھم ھوتے جیتے جی نہ کبھو تُسّے جان دور
پر کیا کریں زمین ھے سخت ، آسمان دور

[تسے = تجھہ سے]

* رنگ تغزل *

فراق کے دیوان میں غزلیں اچھی بری دونوں ھیں - اچھی اس لحاظ سے کہ بعض بعض غزلیں رفعت تخیل اور چستگی بندش میں پایۂ بلند رکھتی ھیں - بری غزلیں وہ کہی جاسکتی ھیں جن میں

خیالات کی رفعت و قدرت نہیں ہے بلکہ اکثر اشعار پھیکے ہیں اور بعض عامیانہ تک بلندی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے -

ذیل میں ہم جستہ جستہ اشعار اُن غزلوں کے درج کرتے ہیں جن میں تغزل کی خوبی نمایاں ہے :—

١ ٹکڑے ٹکڑے تھے جگر کے لالہ و گل کی طرح
یا مرے مژگاں پر کوئی یک دل صد پارہ تھا

٢ جس دم گیا وہ چھوڑ کے تنہا مجھے فراق
میں دیکھتا ہمرا درو دیوار رہ گیا

٣ قلم کھنچیگا اُسکے ہاتھہ یہ ہراک سے کہتا ہے
بہم گر بلبل و گل کی کوئی تصویر کھینچے گا

٤ تم آئینہ جو دیکھو ہو تو میرا جی دھڑکتا ہے
کہ ان بیمار آنکھوں کے نہ تم بیمار ہو جانا

٥ کب حسن کی خوبی پہ تو مائل نہیں رہتا
کب آئینہ مکھڑیکے مقابل نہیں رہتا

٦ روز سیاہ شب کو ہوا بسکہ داغ زلف
ہے شمع ماہتاب چراغ مزار شب

٧ زلفوں کا بنانا ہی رہے جسکو سدا یاد
پھر ہم سے غریبوں کو کرے اُسکی بلا یاد

٨ جب چاہا کہ نامہ لکھیں اُس آفت جاں کو
کاغذ ہوا تر اشک سے مطلب نہ رہا یاد

٩ ہم ہوتے جیتے جی نہ کبھی تجھہ سے جان دور
پر کیا کریں زمین ہے سخت آسمان دور

۱۰ جو عہد و قول کیا تم نے سو تمام غلط
قرار صبح غلط وعدہ ہائے شام غلط

۱۱ سوائے جور جفا کے کچھہ اور بات نہیں
رکھا ہے کسنے دلارام تیرا نام غلط

۱۲ نے میں گل خنداں ہوں نہ میں باد سحر ہوں
اک شعلۂ آتش ہوں میں اک آہ جگر ہوں
ہر اک نفس نالۂ نے سے نہیں کچھہ کم
سرتا بقدم آہ و فغاں درد و اثر ہوں
ناصح نہ کر اب مجھکو نصیحت کی یہ باتیں
کیا جانئے اسوقت کہاں ہوں میں کدھر ہوں

۱۳ خدا جانے تصور ہم کو رہتا ہے کن آنکھوں کا
کہ مثل شیشہ و صہبا نشے میں چور رہتے ہیں

۱۴ آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں
بھولے سے اُنے یاد کیا ہے عجب نہیں

۱۵ خط تو اُسکو لے چلا ہے پر کسو عنوان سے
تھپ بلے تو ساتھہ لیچل نامہ بر میرے تئیں

۱۶ شمع ساں میں اِدھر لگا رونے
اور اُدھر اُنّے ہنس دیا یارو

* فلسفہ *

ہندوستان کیا بلکہ مشرق کا تمام فلسفہ یہاں کے شعرا کے دوا دوین سے دستیاب ہوسکتا ہے - نظریات اخلاق و الہیات (مابعدالطبیعہ) کو جس خوبی و سادگی سے دلنشین الفاظ میں مشرقی شاعر بیان کر جاتا

ہے اُس کے لئے مغربی حکما کو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے پڑتے ہیں - ذرا مندرجہ ذیل اشعار کو بنظر امعان ذہن نشین کیجئے اور مشرقی شعرا کی نازک خیالیوں ہی کو نہیں بلکہ ان دقت نظر کی بھی داد دیجئے -

(فراغ)= نے خواہش گل مجھ کو، نہ پروائے گلستاں
ممنون ہوں میں عالم بے بال و پری کا

(جبر و قدر)= تقصیر نہیں اُس کی یہ طالع کی ہے خوبی
شمشیر جو ہوتی ہے تو قاتل نہیں ہوتا

" = انگلیاں گھس گئیں یاں ہاتھوں کے ملتے ملتے
لیکن افسوس نوشتہ نہ مٹا قسمت کا

(مردہ دلی)= کون سا غنچہ کہ کھاتا ہی نہیں خون جگر
کون سا گل ہے کہ یاں چاک گریباں نہیں

(یوگ)= غم و شادی کو تیرے ہجر میں باہم کیا ہم نے
کہ داغ دل کو گل، اور اشک کو شبنم کیا ہم نے

* تصوف *

خواجہ میر درد علیہ‌الرحمہ صوفی شاعر تھے - اُنہیں کا فیض صحبت تھا کہ فراق نے بھی اکثر اشعار تصوف میں کہے ہیں اور اچھے کہے ہیں - ملاحظہ ہو :—

۱— ہر ذرے میں جلوہ ہے تری جلوہ گری کا
ہر شیشے میں یاں رنگ جھلکتا ہے پری کا

جوں سر و زبس رہ میں تری خاک نشیں ہوں
کافی ہے یہی مجھ کو ثمر بے ثمری کا

سر گـرم سر راہ فنا ہوں میں فراق اب
کیا نقش قدم ہوں میں کسی رہ گزری کا

۲—تو جلوہ گر اگرچہ مری جان کہاں نہ تھا
پر جب تلک کہ ہم بھی نہ تھے تو عیاں نہ تھا

۳—کہا جائیے جاتے ہیں کدھر بے سروپا ہم
نے راہ ہمیں یاد ہے نہ راہ نـما یـاد

۴—آمادۂ صـد نیستی ہستی ہے ہمـاری
لکھہ دے کوئی انگشت سے جوں نام زمیں پر
۵—گـر طوف حـرم ہے تجھکو منظور
تـو جا کے کسی کے دل میں گھـر کـر
۶—رنگ لبـاس شـرط نہیں اہل فقـر کو
منظور گر ہے رنگ تو دل میرے یار رنگ
۷—عالم کثرت میں بھی وحدت ہي آتي ہے نظر
ٹکڑے ٹکڑے ہے ہمارے دل کا آئینہ تمام
۸—حیرت زدہ رہتا ہے تو دل اپنا ہمیشہ
یہ آئینہ ہے کس کے مقابل نہیں معلوم
۹—ہر غنچے میں بو ہے تری - ہر گل میں ترا رنگ
تسپر بھی تـری شکل شمائل نہیں معلوم
۱۰—ہر اک لخت جگر خالی نہیں جوش اناالحق سے
یہاں دار مژہ پر کتنے ہی منصور رکھتے ہیں

۱۱—تمام محو ہوئے دل سے نقش ہستی کے
اب اِس نگیں میں ترا صرف نام باقی ہے

۱۲—اپنے ہی دل میں ہم نے اُس کو فراق پایا
مقصود بھی یہی تھا بتخانہ و حرم سے

* شوخی *

شوخی شاعری کے دستر خوان کا نمک ہے - اس سے نہ صرف شاعر کی موزونئی طبع کا اندازہ ہوتا ہے - بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان پر کہاں تک قادر ہے جن کے کلام میں آمد ہے اور آورد نہیں ہے اُن کے اکثر اشعار میں لطافت کے ساتھ ساتھ جو شوخی ہوتی ہے وہ اُن شعرا کے کلام میں ہرگز نہیں پائی جاتی جو محض مشق کرتے کرتے کلام موزوں کہنے لگے ہیں اِس لحاظ سے غالب کا کلام بلند ترین کلام ہے - فراق کے کلام میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ لطف ضرور ہے -

۱—ساقی سبھوں کو تونے دیا ساغر شراب
محروم ایک یہ ہی گنہگار رہ گیا

۲—کیا جانئے کہ مجھ سے یہ کیا اب گلہ ہوا
قاتل جو سر پر کھینچ کے تلوار رہ گیا

۳—لاکھوں جو دیتے گالیاں ہو میرے نام پر
کچھ بہت مہربان ہو تم اِس غلام پر

* معاشرت *

شاعر کے قلم سے بے ساختہ ایسے اشعار نکل جاتے ہیں جن سے نہ صرف شاعر کے ماحول کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے - بلکہ بسا اوقات

معاشرت و تاریخ کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ھیں - فراق کا زمانہ اگرچہ بہت دور کا زمانہ نہیں - تاھم موجودہ دور میں ھم بہت کچھ اپنے قدیم تمدن کو بھول چکے ھیں - نہ اب کوئی گھیتلی جوتی جانتا ھے - نہ کھڑکی دار پگڑی نہ جامہ نہ چپکن - طرز لباس قواعد نشست و برخاست ' لوازم ملاقات و آداب معاشرت کے متعلق ھم بھول کر بھی یہ نہیں غور کرتے کہ ھم کیا تھے اور کیا ھوگئے اور معلوم نہیں آئندہ کیا حشر ھونے والا ھے - غرضیکہ اگر کسی پرانے شاعر کے کلام میں ان چیزوں کے متعلق کوئی ذکر آجائے تو نئی روشنی کے نوجوانوں کو لغت دیکھنے کی ضرورت پڑتی ھے - اور اکثر تو یہ ھوتا ھے - کہ لغت کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایسے خیالات و الفاظ کو مہمل سمجھ کے چھوڑ دیتے ھیں -

۱ — سنتے ھی اپنی گلی میں مری آواز جرس
کھینچ تلوار وہ ظالم وھیں گھر سے نکلا

۲ — چک کر جیب میں جس طرف نکل جاتا ھوں
گھیر رکھتا ھے مجھے گھیر ترے داماں کا

۳ — مجلوں و کوہ کن کی نہ سنئے کہانیاں
غم کی مری سنیں جو کبھی داستان آپ

۴ — بجا ھے پردۂ فانوس میں گر شمع روشن ھے
عروس نو کو لازم ھے کہ اپنے منھ پہ لے گھونگھٹ

۵ — ھے ھے غضب ھے یہ تری شلوار گلبدن
تسپر کلا بتو کا ترا وا ازار بند

۶ — شیخ صاحب کے خدا سر کو سلامت رکھے
کم نہیں گنبد گردوں سے بھی دستار کی شکل

۱ — اے فراق اپنے گلبدن کو ھم - جب کبھی مہمان رکھتے ھیں
اشک اور لخت دل سے اس کے حضور - عطر اور پاندان رکھتے ھیں

* صنعت *

اس غزل میں قافیوں نئی ترکیب سے لطف پیدا کیا گیا ہے -
یعنی قافیہ کے آخری جزو کو ردیف قرار دیکر اُس کی تکرار کی گئی ہے -
اس قسم کی کئی غزلیں دیوان فراق میں موجود ہیں :—

روتی ہیں بسکہ دیدہ خونبار بار بار
رهتا ہے اُس کے غم میں دل آزار زار زار
ابرو سے اُس کی تیغوں کو کیا ہے مناسبت
اُس پر سے پھینک دیجئے تلوار وار وار
چاہا تھا درد دل نہ کہوں گلعذار سے
ناچار پر کروں ہوں میں اظہار ہار ہار
رستے میں جب سے نکلا تھا وہ ہو کے مست ناز
روتے ہیں تب سے مردم بازار زار زار
آئے جو آج بیچ میں رندوں کے شیخ جی
دھولوں کی مار سے ہوئی دستار تار تار
رکھہ عشق تو فراق اس ابرو کی تیغ سے
یعنی سپاہی رکھتے ہیں ہتھیار یار یار

* مشکل زمینیں *

(۱)

محتسب توڑ تو مت سنگ جفا سے شیشا
ہے میاں آئنۂ دل کی صفا سے شیشا

ساقیا ہرزہ نہیں ہے یہ صدائے قلقل
باتیں کرتا ہے مگر ابرو ہوا سے شیشا
دل میں بستی ہے مہ خلدق پا اس کی فراق
خوں سے لبریز ہے یا رنگ حنا سے شیشا

(۲)

دوسری زمین ہے ' صلم شمشیر ' علم شمشیر

نہ کر علم تو مري جان دمبدم شمشیر
ہمارے قتل کو ابرو کي کیا ہے کم شمشیر
ستمگروں کي تواضع پہ بھول مت نادان
نہیں یہ جائے تعجب کہ ہوئے خم شمشیر

(۳)

مونهہ پر ترے شمس و قمر - اک اِسطرف اک اُسطرف
پھینکے ہے مشت سیم و زر - اک اِسطرف اک اُسطرف
گریاں اِدھر یہ شمع ساں - خنداں اودھر وہ مثل گل
داغ دل و زخم جگر اک اِسطرف - اک اُسطرف

(۴)

جو کچھہ خدا نے تجھہ کو دیا رنگ اور نمک
وہ ہے بتان ہند میں کب رنگ اور نمک
آنکھوں میں تیری کیف ملاحت ہے میری جاں
دیکھا ہو کم - ہو بادہ گلرنگ اور نمک
عالم میں اُس کے بادۂ نمکین کا شور ہے
رکھتا ہے شوخ کیا دھن تنگ اور نمک

(۵)

کھویا گیا ھے دل کسی بلبل کا ظاھرا
ڈھونڈے ھے اپنے ھاتھہ میں لیکر چـــراغ گل
ساقی شتاب آ کہ تـــرے انتظار میں
پیدا کرے کہیں نہ یہ چشم ایاغ گل

* فراق و غالب *

ہم یہ جسارت تو نہیں کرسکتے کہ یہ کہیں کہ کہیں کہیں فراق کا کلام غالب سے بڑہ گیا ھے - لیکن اگر مقابلہ کے لئے کچھہ اشعار جن میں دونوں حضرات کی تخیل ایک ھی سی ھے درج کئی جائیں تو دلچسپی سے خالی نہوگا -

* فراق *

۱ یہ غم ھے ساغرو مینا مجھے کہ میرے بعد
ذرا بھی تجھکو کوئی ملہ نہیں لگانے کا
۲ فراق خستہ جانکو اے عزیزو کوئی مت چھیڑو
یہ رو دیگا کروگے فکر گر اِس کے ھنسانے کا
۳ مہماں ھو رھا ھوں کوئی دم کا صبح وار
خورشید رو ! نمود ذرا ھو تو بام پر
۴ جفا کے پر دے میں اک گونہ پیار ھے آخر
برا بھلا ھے ' پر اپنا وہ یار ھے آخر
۵ صورتیں کیا کیا ملائی ھیں فلک نے خاک میں
دفن ھے زیر زمیں یا رب یہ گنجینہ تمام

۶ میں وہ ہوں کہ منت کش افلاک نہیں ہوں
مرہم طلب سینۂ صد چاک نہیں ہوں

۷ کسی کا منہ ہے کہ بوسہ طلب کرے تجھہ سے
کہ بات کہنے میں یاں تو زباں نکلے ہے

* غالب *

---

۱ غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہرو وفا میرے بعد

۲ پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

۳ پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کي نظر ہونے تک

۴ اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم الله الله
اِس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

۵ سب کہاں کچھہ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

۶ درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

۷ بات پر واں زبان کٹتي ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذت دشنام

* سہل ممتنع *

۱ غیر کے دل میں نہ جا کیجئیگا
مری آنکھوں میں رہا کیجئیگا
آبروئے یار کو رکھہ پیش نظر
چشم کو قبلہ نما کیجئیگا
زائران حرم و دیر، کبھو
میرے بھی حق میں دعا کیجئیگا

۲ هم کو بتخانہ تمھیں کعبہ مبارک هو شیخ
هم اِدھر جائینگے اور آپ اُدھر جائینگا

۳ معلوم نہیں کہ خواب دیکھا
یا شب کو وہ آفتاب دیکھا

۴ دل کو لے خوب کی وفا صاحب
آفرین باد - مرحبا صاحب
بوسہ کب آپ کا لیا هم نے
یونہی کرتے هیں افترا صاحب
ایک دن تیری چشم تر کو دیکھہ
پوچھا میں کیا هے ماجرا صاحب
چشم تر، رنگ زرد، یہ کیوں هے
کیا کسی پر هیں مبتلا صاحب
بھر کے اک آہ سرد، وہ غمناک
بولا تم سے کہوں میں کیا صاحب
ایک خوں خوار آفت جاں سے
کئی دن سے هے دل لگا صاحب

۵ درد دل اب ہوا ہے ظاہر آہ
زلف و خط کا جواب رکھتے ہیں
نہیں معلوم کس لئے ہم سے
ماہ رو یاں حجاب رکھتے ہیں
زلف میں چہرے کو چھپاتے ہیں
ابر میں آفتاب رکھتے ہیں
۶ عشق کی آگ بری ہوتی ہے
دل کی بھی لاگ بری ہوتی ہے

* حکمت و موعظت *

شرقی شعرا کا خاص شیوہ ہے کہ پند و نصیحت میں بھی ضرور
کچھہ لکھتے ہیں - فراق بھی اِس نظرئے سے مستثنیٰ نہیں :—

۱ غرور اہل جہاں ہے دلیل بے ہنری
درخت جو کوئی بے بر ہو خم نہیں ہوتا
۲ فیض صحبت سے ہوا ہوں درد کی باغ و بہار
ورنہ اس گلشن میں جوں خاروخس ناکارہ تھا
۳ شمع کی طرح سے ظلمت کدہ عالم میں
شب کو رہ جائیے یاں ' وقت سحر جائیےگا

* فراق اور رند *

ردیف دونوں غزلوں میں صیاد ہے - البتہ قوافی میں اختلاف ہے
لیکن مضامین کی بندش زیادہ تر اس ردیف کی پابند ہے - لہذا لطف
سے خالی نہ ہوگا کہ دونوں شعرا کی غزلوں کا موازنہ فرمائیے -

فراق

۱ ہمارے حال پہ کرتا نہیں نظر صیاد
فرض کہ سخت ہے بیرحم بےخطر صیاد
۲ مری وفا نے قفس کی یہ شکل دکھلائي
وگر نہ دام کہاں میں کہاں کدھر صیاد
۳ وبال جاں ہوئي آخر بلند پروازي
نہوتے کاش کے یہ اپنے بال و پر صیاد
۴ کہ پھول کھل رہے ہیں آبشار جاری ہیں
غرض کہ زور چمن ہے بہار پر صیاد
بہار باغ تو ہم کو کہاں میسر ہے
نہ آئے نکہت گل بھی کبھو اِدھر صیاد
فراق مرغ دل اپنے کا کام آخر ہے
قفس ہو آج جو ویران و نوحہ گر صیاد

رند

کھلي ہے کنج قفس میں مري زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
دکھا یا کنج قفس مجھہ کو آب و دانے نے
وگر نہ دام کہاں - میں کہاں - کہاں صیاد
اُجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
الہی ٹوٹ پڑے تجھہ پہ آسماں صیاد
الہی دیکھئے کیونکر نباہ ہوتا ہے
زبان دراز ہوں میں اور بد زباں صیاد

نکالیو نہ قدم آشیاں سے اے بلبل
لگائے بیٹھے ھیں پھندے جہاں تہاں صیاد
فریب دانہ نہ کھاتا میں زینہار اے رند
نہاں جو دام میں کرتا نہ باغباں صیاد

فرقی کے متعلق جو کچھہ عرض کیا گیا ھے - اُس سے یہ اندازہ ہوسکتا ھے کہ اُن کی شاعری ایک کڑی ھے قدیم و جدید شاعری میں - ارر یہ بھی معلوم ہوتا ھے ' کہ آپ کی شاعری میں فارسیت کا رنگ غالب ھے - تاریخ ارتقائے شعر اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس قسم کے شعرا کا مطالعہ بیحد ضروری ھے - اول تو اس لئے کہ بغیر اس قسم کے شعرا کے کلام کو دیکھے ہوئے یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ موجودہ زبان نے قدیم محاورات و الفاظ کو کس طرح اور کیوں ترک کیا ھے - دوسرے اس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ھے کہ جس شاعری کو ہم جدید کہتے ھیں اُس میں زبان کی صفائی کے علاوہ کیا کیا خوبیاں پیدا ہوئی ھیں اور دور حاضر کی ایجادات نے مختلف اقوام کو قریب تر کر دینے کے بعد زبان و معاشرت پر کیا اثر ڈالا ھے -

---

ضلع الہ آباد کے معماروں کی اصطلاحیں

از محمد نعیم الرحمان ' ایم - اے -

ہندستانی کی جولائی اور اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع کی اشاعتوں میں (ص ص ۴۰۷ تا ۴۳۰ ' اور ص ص ۵۸۹ تا ۶۲۲) راقم الحروف نے الہ آباد کے معماروں کی چند اصطلاحیں جمع کرکے پیش کی تھیں - مضمون کی اشاعت کے کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے تنبہ ہوا کہ اس میں اصلاح کی ضرورت ہے - بعض صورتوں میں محض طباعت کی غلطی ہے ' بعض میں سہو ہوا ہے ' اور بعض مقامات میں غلطی ثابت ہے - بار بار خیال آیا کہ اصلاح کرکے ہندستانی ہی کے صفحات میں شائع کرادوں - مگر بعض امور باوجود تنبہ اور آگاہی کے بھی معرض التوا میں آجاتے ہیں ؛ چنانچہ مجھے اب تین برس بعد اس کی توفیق ہوئی ہے - اِس سے انفعال بھی ہے ' اور اس کا افسوس بھی -

اِس درنگ کا ایک سبب (اگر اب اس کا عرض کرنا بالکل بے جا نہ ہو) یہ بھی ہوا کہ اس عرصے میں مجھے اور بھی متعدد اصطلاحیں دستیاب ہوتی رہیں ' اور ارادہ تھا کہ ان کو ہندستانی کے صفحوں میں پیش کردوں گا - لیکن ایک تو یہ سلسلہ آہستہ آہستہ جاری رہا اور کبھی اس کے ایک مقدر انجام کی صورت نظر نہ آئی ' دوسرے یہ کہ اِن تازہ اصطلاحوں میں سے ابھی کئی ایک ایسی باقی ہیں جن کی تشریح کے باب میں مجھے ابھی تک پورا اطمینان نہیں ہوا ہے - لامحالہ اِس پیش کش میں التوا ہوتا رہا ' اور اسی کے ساتھ معلومہ اصطلاحات کی اِصلاح میں بھی دیر ہوتی گئی - میں کوشش کروں گا کہ یہ تازہ اصطلاحیں

ہندستانی کی مستقبل قریب کی کسی اشاعت میں شائع ہوسکیں - فی الحال شائع شدہ اصطلاحات میں جو ترمیم منظور ہے وہ عرض ہے - میں اپنے محترم پروفیسر عبدالستار صدیقی صاحب کا ممنون ہوں کہ آپ کے مشورے سے متعدد مقامات پر میری بصیرت افزائی ہوئی -

[۱] صفحہ ۴۱۰ — اتہ ماس اور اتہ مانس کا ایک اور معروف تلفظ اتہ وانس بھی ہے - (ہندستانی ' ج ۲ ' ص ۱۵۹) -

ص ۴۱۱ — اڑانا : اودھ کے بعض اضلاع میں ڈھلوان سائبان کو عام طور پر اُڑانا کہتے ہیں - خط کے ترچھے پن کا اصولی خیال اس مفہوم میں بھی موجود ہے -

اِنتّھا کی صرفی تشریح میں ایلٹ‌ہار کی اصلیت صحت کے خلاف ہے ؛ کیوں کہ انتّھا کے آخر کا ھا وہی ہے جو '' چرواھا '' میں ہے - اسی طرح اِیلتّھا کا تلفظ بھی بے جا درج ہوا ہے -

'' اندھا گولا '' کی تشریح میں آخری الفاظ '' دیکھو گولا '' محذوف ہونے چاھئیں ' کیوں کہ اس سے اوپر کی سطر میں گولا کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے -

ص ۴۱۲ — دوسری سطر میں شروع کے الفاظ '' اس کی ایک صورت '' ضرورت سے زائد ہیں اور محذوف ہونے چاھئیں - اندھیاری کی شکل میں افسوس ہے کہ طباعت میں پہنچ کر نقطے دار خط اور الف ب (جن کا حوالہ تشریح میں ہے) نمودار نہیں ہوئے - داھنی طرف کے خط

---

[۱] — ہندستانی ' جلد اول -

کا کل حصہ ، اوپر کی پیشانی کو چھوڑ کر ، الف ب میں شامل سمجھنا چاہیے -

" اول " کی تشریح میں ایلنٹ کے علاوہ اول قسم کے " کھلنجر " کو بھی شامل کر لینا چاہیے - کھلنجر بھی حقیقت میں ایلنٹ ھی ہوتی ھے ، جو اِدھر اُدھر کی ایلنٹوں کے بے طور دباؤ سے تیڑھی میڑھی ہوجاتی ھے ، اور چوں کہ پزاوے میں پکنے وقت وہ ایلنٹوں سب سے اندر کی صف میں ہوتی ھیں اس لیے گرمی کی شدت سے زیادہ پک کر سیاہ رنگ کی بھی ہوجاتی ھیں - یہ بدنما اور بد رنگ ایلنٹ گو اپنی خوش نما بھائوں کے مقابلے میں مردود ہوتی ھے لیکن مضبوطی میں ان سے بدرجہا زیادہ ہوتی ھے - یہی وجہ ھے کہ کھلنجر کو عموماً تعمیر کی بنیاد میں استعمال کیا جاتا ھے - ایک اور عقیدہ یہ ھے کہ کھلنجر نمی کے اثر سے بھی بہت زیادہ عرصے تک محفوظ رہتا ھے اور اُس میں لونا نہیں لگتا -

" ایز " کی تشریح میں پہلی ھی سطر میں لفظ " عموماً " کو محذوف سمجھنا چاہیے -

" بانکڑی " کی یہ اصطلاح غالباً گوتے کی " بانکڑی " سے مستعار ھے جو زنانہ کپڑوں میں اور مسالے کے ساتھ کنارے کنارے پر ٹانکی جاتی ھے -

" بٹّی مارنا " کے تحت میں " بٹّا " کے مفہوم " کمی ، نقص ، عیب " کی طرف اشارہ کرنا صحیح نہیں ھے -

ص ۲۱۳— بڑیری : اُس لفظ کے تلفظ میں اہل اودہ کبھی ڑ سے پہلے نون غنہ کا اظہار کرکے بنڑیری بولتے ھیں -

'' بسولی '' کا تلفظ زیادہ تر '' بسلی '' (س کے پیش سے) یا '' بسلی '' (س کے سکون سے) کیا جاتا ہے -

ص ۴۱۵ — '' بکس '' کی تشریح میں یہ اور اضافہ کرلینا چاہیے کہ : چونے ' بالو اور راکھی کے پیمانے کو بھی بکس کہتے ھیں ؛ اور یہ بکس اس طرح بنتا ھے کہ اینٹوں کا ایک احاطہ بنا لیتے ھیں اور اسے چونے ' بالو وغیرہ سے بھر دیتے ھیں - اس احاطے کے ناپ سے چونے وغیرہ کی مقدار معلوم کرلی جاتی ھے -

ص ۴۱۷ — '' بیالا '' کی اصل '' بیار '' (ب کے زبر سے) ھے جس کے معنی '' ھوا '' کے ھیں - بیار سے بیارا ' اور بیارا سے بیالا ھوگیا ھے - عام محاورے میں بھی روشندان کو بیالا کہتے ھیں -

ص ۴۱۷ اور ص ۵۹۹ پر '' بیجاوی '' ذات کا ذکر ھے - اس کا تلفظ محض ج ھی سے نہیں بلکہ ز سے بھی ھوتا ھے - ظاھر ھے کہ ز اھل ھند کے لہجے کے مطابق حقیقت میں حرف ض کا تلفظ ھے - اس میں قابل لحاظ امر صرف یہ ھے کہ ض ھمارے ھندی معماروں کے منہ میں پہنچ کر محض ج ھی کی شکل میں تبدیل نہیں ھوگیا ھے ' بلکہ اُن کے ھاں اس کے قریب کا تلفظ (ز) بھی موجود ھے -

ص ۴۲۰ — '' پاڑ '' کی تشریح میں پہلی سطر میں '' کا '' کی جگہ '' کی '' چھپنا چاھیے تھا -

اسی صفحے کی آخری سطر میں '' یہی '' کی جگہ '' یہ '' پڑھنا بہتر ھوگا -

ص ۴۲۲—" پکا ڈھولا " کی تشریح کی پہلی سطر میں " ڈاٹ " کے بعد " کے نیچے " کا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے - اس اضافے کے بعد " اور چوکھٹ کے اوپر والے سوروے کے بیچ " کے الفاظ بالکل غیر ضروری ہو جاتے ہیں ' اس لئے محذوف ہونے چاہئیں -

پلاسٹر اور پلسٹر (ص ۴۲۳) کے لئے ایک اور اصطلاح " استر " (الف اور ت مفتوح) بھی ہے - استر فارسی لفظ ہے ' اور اس کی دوسری صورت آستر ہے - فارسی میں " آستر کاری " اسی معنی میں آتا ہے جو پلستر یا پلاسٹر کا مفہوم ہے - خود ہمارے ملک میں اکثر لوگ " استر کاری " کہتے ہیں -

ص ۴۲۳—پوتیا کی جگہہ " پالت " (لام مفتوح) ہونا چاہئے - اصل یہ ہے کہ اس اصطلاح کے بارے میں خود اہل حرفت مختلف رائے رکھتے ہیں - بعض اسے پالت بتاتے ہیں ' اور بعض پوتیا ہی کہنے پر اصرار کرتے ہیں -

پلستر کی تشریح کی آخری سطر میں گچکاری میں ج چھپ گیا ہے ' اس کی جگہ چ سمجھنا چاہیے -

اِسی صفحے پر نیچے سے دوسری سطر میں " کی عمودی چوکھٹ (پٹی) " کی جگہ " کے بازو " کہنا بہتر ہوگا ' کیوں کہ اس کے لیے بازو بولا جاتا ہے - اُس وقت میرے ذہن میں نہیں آیا تھا -

ص ۴۲۵—سطر ۷ میں انگریزی لفظ Rugh غلط چھپا ہے ' اسے Rough ہونا چاہیے -

ص ۴۲۹—" پیکار " کی تشریح میں سطر ۴ کے بعد " یا چھت کے نیچے تک " اور بڑھا لینا چاہیے -

اسی صفحے پر " پھٹ " کی توضیح میں اتنا اور اضافہ کر لیا جائے تو مفید ہوگا کہ " پھٹ " ضد ہے جٹ کا (جد) " - سائیسوں کی اصطلاح میں ایک اکیلے گھوڑے کو پھٹ اور دو کو جوڑی کہتے ہیں - اسی طرح " پھٹ کا ساز " اور " جوڑی کا ساز " بھی بولا جاتا ہے - بعض مہذب لوگ بجائے پھ کے ف کے ساتھہ " فٹ " بولتے ہیں - کان پور کے سوداگروں کی فہرستوں میں ساز کی صفت میں بھی "فٹ" نظر آتا ہے -

ص ۴۲۷ — پھسیل کی تشریح میں قوسین کے الفاظ " (اور بگڑا ہوا) " غیر ضروری اور نامناسب ہیں - اِن کو محذوف سمجھنا چاہیے -

ص ۴۲۹ — " تپلنچا " کی تشریح میں الفاظ "طماچہ ' طمانچہ ' تپانچہ " کا اندراج غیر ضروری ہے - اُن سب کو خارج سمجھنا چاہیے - تپلچا اور تملچا فارسی تپلچہ اور تفلگچہ کی ہندی صورتیں ہیں -

ص ۴۳۰ — تھاپی کی صرفی تشریح میں ' قوسین کے الفاظ میں " تھپکنا " کی جگہ " تھاپنا " ہونا چاہیے -

ص ۵۸۷ — لفظ تِھیا کی تِھ کے نیچے زیر کی علامت غلط چھپی ہے -

" تھیبا " میں امذ کے بعد قوسین میں تلفظ کے اظہار کے لئے " یاي معروف سے " کا اضافہ کر لینا چاہیے -

ص ۵۸۸ پر " جام " کی تشریح افسوس کہ بالکل غلط درج ہوگئی - میرے پہلے مسودے میں یہ غلطی نمایاں نہیں ہے - معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں تدوین اور ترتیب کے وقت " قیلچی اور گوند " کے استعمال کے دوران میں یہ غلطی واقع ہوئی ہے - بہر کیف " جام " کی تشریح میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حقیقت میں " سبل " (گیلنا ' گدالا) کی کیفیت ہے ؛ اور " جام " سے مراد ہے " چار یا نو انچ یا ایک فٹ کی

وہ جڑائی جو چوکھٹ کی بغل میں ' دائیں بائیں ' بنائی جاتی ھے '' -
لفظ جام اصل میں انگریزی لفظ Jamb کی ھندی شکل ھے ' جس کا
اطلاق انگریزی محاورے میں محراب ' دروازے ' کھڑکی یا آتش دان کی
محراب کے دونوں طرف کے بازوؤں کی عمارت پر ھوتا ھے -

'' جت '' کی تشریح کے آخر میں اِتنا اِضافہ ضروری معلوم ھوتا ھے
کہ '' اِس کا ضد ھے پھت (جد) '' -

جڑائی کے تحت میں تیسری سطر میں لفظ '' چونا '' چھپا ھے -
یہ '' چونے '' ھے -

اسی صفحے پر نیچے سے دوسری سطر میں ''بعد'' کے بعد جو ک ھے
وہ صحیح طور پر چھڑ کے بعد ھونا چاھئے تھا - یہ لفظ چھڑک ھے -

ص ۵۹۱ —'' چسما '' کی توضیح میں انگریزی لفظ Chasm کے
تلفظ میں مجھ سے تسامح ھوا ھے - صحیح تلفظ چیزم نہیں بلکہ
کیزم ھے - لیکن یہ امر بھی ایک گونہ لطف سے خالی نہیں - میں نے
معدودے چند اشخاص کے سوا عام طور پر اوورسیر ' ٹھیکے دار اور کاریگر
لوگوں سے اس انگریزی لفظ کا تلفظ چ ھی سے سنا ھے - یہ غالباً اُن کی کم
سوادی کی دلیل ھے - یہ بھی ممکن ھے کہ چسما انگریزی سے نہیں بلکہ
فارسی لفظ چشمہ سے بنا ھو ' اور اُسی کی ھندی صورت ھو -

'' چلہا '' کی لفظی تشریح میں پہلی سطر کے آخر سے
'' چوناھار '' کو محذوف ھونا چاھئے ' کیوں کہ اس لفظ کی حقیقت
بھی اِنتھا کی سی ھے -

ص ۵۹۲ —'' چوتر '' کے تلفظ میں زیادہ مناسب ھوگا کہ '' چ کے
پیش کی جگہ '' '' واو معروف '' کہا جائے -

اسی صفحے پر '' چوڑی '' کی شکل کا جو خاکا دیا گیا ھے. افسوس ھے کہ غلط دکھایا گیا - چوڑي کی صحیح شکل یوں ھوگی :

ا
ب
ج
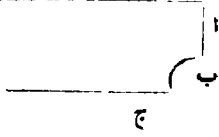
'' چورس '' کے بیان میں قوسین کے اندر ھی '' چورسائي '' کا اضافہ مناسب ھوگا ' جو چورس کا حاصل مصدر ھے -

ص ۵۹۴ــــ'' داغ بیل '' کے بیان میں چوتھی سطر میں لفظ ''ھو'' کے بعد '' یا '' چھپنے سے رہ گیا ھے -

ص ۵۹۸ــــگول ڈات کی تشریح (آخري سطر) میں '' کھڑي اینٹ '' کہنا پوری طرح درست نہیں ھے - اس کی جگہ '' کھرنجا ' یعنی ساڑھے چار انچ چوڑی اینٹ '' کہنا بہتر ھوگا - اسی طرح ص ۵۹۹ پر دوسری سطر میں اگر قوسین کي عبارت یوں ھو تو زیادہ صحیح اور واضح ھوگا : (ایک اینٹ کھڑی یعنی نو انچ کی اونچائی میں ' اور ایک بڑی یعنی ساڑھے چار انچ اونچی) -

ص ۵۹۹ــــنیچے سے چوتھی سطر میں قوسین کا لفظ سندوتچی س سے چھپ گیا ھے ' یہ ص ھونا چاھیے تھا -

ص ۶۰۱ــــڈھاہ کے بیان میں لفظ کگر کی جنس کے بارے میں مجھ سے سہو ھوا - کگر مذکر نہیں بلکہ مونث ھے -

''ڈھولا'' کے بیان کے آخر میں یہ اضافہ کر دینا چاھیے : '' اسے قالب بھی کہتے ھیں '' -

'' راج '' کے بیان میں اتنا اور بڑھا دینا چاھیے : '' ملک اودھ میں راج کو '' تھوئی '' (بڑھئی کے وزن پر) کہتے ھیں '' - اس لفظ کی اصل غالباً '' تھپئی '' ھو (یعنی '' تھاپنے والا '') -

ص ۲۰۶—سطر ۴' اور سطر ۱۳ میں لفظ "زاویے" میں بلا وجہ ایک همزہ اوپر چھاپ دیا گیا ھے' جو تلفظ کے لحاظ سے کسی طرح صحیح نہیں - و کے بعد همزہ نہیں ھے بلکہ ایک ي اور ایک یا ي مجہول ھے -

ص ۲۰۳ پر "ساج" کے بیان میں "تعمیر" کی جگہ "تعسیر" غلط چھپا ھے -

ص ۲۰۴ پر سبل کے آخر میں یہ اضافہ ضرور مفید ھوگا کہ "اودہ میں اسے سابر (ب مفتوح) کہتے ھیں" -

"سندلا" کی اصل غالباً "صندل" ھے - اس چونے کو شاید اس نسبت سے سندلا کہتے ھیں کہ اس کا رنگ صندلي (شربتی) سا ھوتا ھے -

ص ۲۰۵—"سیم" کے بیان میں آخری سطر میں سے بہتر ھے کہ لفظ "نمبر" کو خارج کر دیا جائے -

ص ۲۰۶—کاربل کی چوں کہ صرف یہی واحد شکل نہیں ھے' اس لیے مناسب معلوم ھوتا ھے کہ اس کی تشریح کے آخر میں اتنا اور اضافہ کر دیا جائے کہ "علاوہ اس کے کاربل کی اور بھی مختلف شکلیں ھو سکتی ھیں" -

"کانس" کے بیان میں' دوسری سطر کے شروع سے "عربی: قرناس ؟" کو خارج کر دینا مناسب ھوگا' اس لیے کہ زیادہ قرین صحت یہی امر ھے کہ ھمارا "کانس" انگریزی ھی سے ماخوذ ھے نہ کہ عربی سے' جہاں "قرناس" خود غیر زبان سے آیا ھے -

ص ۲۰۹ پر سطر ۷ میں لفظ سب کے بعد لفظ سے ھونا چاھیے جو چھپنے سے رہ گیا ھے -

کنکر کے تلفظ کی تشریح میں " اور نون غنہ" کو محذوف کر دینا چاهیے - اس کے علاوہ پوری تشریح میں اِس لفظ کو بجاے مونث کے مذکر سمجھنا چاهیے -

ص ۹۱۴ کی دوسری سطر میں بجاے " چوڑائی " کے " موتاں " بہتر اور صحیح تر ہوگا -

" کاتر " کا ایک اور تلفظ " کاتر " بھی سنا جاتا ھے - اس کی تشریح میں لفظ " عموماً " کو خارج سمجھنا چاهیے -

ص ۹۱۹ — " مجھولا " کا دوسرا تلفظ منجھولا (نون غنہ سے) بھی ھے -

ص ۹۲۰ پر دوسری سطر میں لفظ " زرا " سے پہلے " سے " چھپنے سے رہ گیا ھے -

ص ۹۲۱ — " نریا " کے بیان میں یہ اضافہ کر دینا چاهیے کہ " ملک اودھ میں اسے گھونگھی یا گھونگی (نون غنہ ' واو مجہول) کہتے ھیں -

ص ۹۲۲ — " نیہو " کو ملک اودھ میں عوام نہُ (ن کے زیر اور ہ کے پیش سے) اور مہذب لوگ نِہ (ن کے زیر اور ہ کے سکون سے) بولتے ھیں -

" ہول پاس " کی تشریح میں اس کی انگریزی صورت غلط درج ہوئی ھے - صحیح انگریزی لفظ ہولڈ فاسٹ (Hold fast) ھے - اس لفظ کے بیان میں چوتھی سطر کے شروع میں بجاے " پٹیوں " کے " بازؤں " پڑھنا چاهیے -

تبصرے

" کار امروز "

ملنے کا پتہ —قصرالادب آگرہ - قیمت مجلد چار روپئے - غیر مجلد ساڑھے تین روپئے -

" کار امروز " جناب سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا مجموعہ ہے - حالانکہ کار امروز سے تنگ آکر لوگ شعر و شاعری کی دنیا میں پناہ لیتے تھے لیکن اب خود شعر و شاعری جناب سیماب کی بدولت کار امروز میں داخل ہے -

عصر حاضر کے باکمال شعرا میں سیماب صاحب کی ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے - وہ موجودہ دور کے کامیاب اساتذہ میں سے ہیں اور ایک خاصی تعداد شاگردوں کی رکھتے ہیں - ہر چند کہ شعرا کی اس افراط کو کچھ لوگ قوم کے عملی جمود اور ذہنی فرو مائگی سے منسوب کریں گے لیکن اس سے کم از کم سیماب صاحب کی پختگیٔ مشق اور تجربے کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں زبان اور طرز بیان کے اعتبار سے ' سوائے اس کے کہ انہوں نے تراکیب فارسی کے استعمال میں ضرورت سے زیادہ آزادی سے کام لیا ہے ' حرف گیری کی گنجائش کم ہے - ان لوگوں کا ذکر نہیں جنہوں نے شاعری اور زبان کو مقامی بنا لیا ہے اور جن کے نزدیک ہر جدت ایک بدعت ہے خواہ وہ کتنی ہی قابل قبول کیوں نہو -

سیماب صاحب کی شاعری لطف زبان اور حسن بیان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے - خوبصورت الفاظ ' جمیل تراکیب ' چست بندشیں اور لطیف

تشبیہات و استعارات کا بیک وقت اجتماع حسن کلام کے لئے کافی ھے - پھر اس کے ساتھ ساتھ متنوع بحریں ' نظم کی نئی نئی شکلیں اور کلام کی روانی میں ترنم و موسیقی کی رعائت اس حسن کو دوبالا کر دیتی ھیں - تاثیر کا سوال بے کار ھے کہ اس کا تعلق مشق و اکتساب سے نہیں - اور یوں بھی ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ھیں جو اس وقت دھلی یا لکھنؤ کے کسی استاد فن کے لئے باعث فخر و مباھات ھوسکتی ھیں ' البتہ یہ چند الفاظ محل نظر ھیں مثلاً " صفحہ ۱۵۰ پر مہوس بمعنی بوالہوس اور رقیب لکھا ھے - صفحہ 195 میں مجروح رواسم ' پابند رسوم کے مفہوم میں استعمال ھوا ھے ' صفحہ ۳۹ میں تکیۂ بالیں لکھا ھے ' حالانکہ تکیہ و بالش مترادف الفاظ ھیں ' ایک جگہ سمن سے تابہ سما لکھا ھے ' حالانکہ سمک سے تابہ سما " رائج ھے - لیکن ان لفظی مباحث سے قطع نظر -

مجھے تو اصولی حیثیت سے اردو شاعری کی بابت کچھ عرض کرنا ھے - کہا جاتا تھا کہ چند فرسودہ رسم و رواج میں محصور ھونے کی وجہ سے قدیم شاعری نے بالکل ماء راکد کی حیثیت اختیار کرلی تھی اور شاعر کی قوتِ تخلیق کا قریب قریب فقدان ھوگیا تھا - چنانچہ جدید شاعری نے ان بندشوں کو توڑ کر آگے قدم بڑھایا اور ایک نئی راہ نکالی لیکن دیکھا یہ جاتا ھے کہ عام طور پر یہ بھی کچھ دور آگے چل کر تھم گئی ھے اور گھوم پھر کر ایک مخصوص رنگ اور ایک متعین حد سے باھر پانوں نہیں نکالتی - اس کی وجہ بھی وھی ذھنیت ھے جس نے قدما کے یہاں جدت و اختراع کے سوتوں کو خشک کر دیا تھا یعنی کسی مجدد فن کا اتباع اس حد تک کہ وہ تقلید کی حد سے بھی گزر کر نقل بن جائے - اور ھر چند کہ اس کا اعتراف کبھی نہیں کیا جاتا لیکن دنیا جانتی

ھے کہ ان ذروں کی چمک، صرف مصنوعی ھے اور یہ ایک خاموش ادعا ھے اس آفتاب کمال کی ھمسری کا جس سے یہ سب کسب نور کرتے ھیں -

جناب سیماب کی شاعری اس حریص و نقال ذھنیت سے تمام تر ملوث نہیں معلوم ھوتی - ممکن ھے کہ انہوں نے خیالات میں کوئی قابل قدر اضافہ نہ کیا ھو، لیکن ھر شاعر کے لئے یہ کب لازمی ھے کہ وہ تخیلات و تصورات کی نئی نئی دنیاوں کا اکتشاف کرے - ان کی یہ سعادت کیا کم ھے کہ وہ جدید شاعری کے نئے سرمایہ کی از سر نو ترتیب و تہذیب کرنے کے اھل ھیں - سیماب صاحب کی شاعری حقیقتاً ایک نو آبادی ھے - پھر ظاھر ھے کہ کسی نئی سر زمین کا بسانا، اس کی تزئین و ارائش کرنا اتنا ھی ضروری اور قابل ستائش ھے جتنا کہ اس کا دریافت کر لینا - اجتہاد فکر کا نعم‌البدل بداعت اسلوب ھے اور لاریب کہ ان کا کلام ھم کو نو بہ نو اسالیب سے روشناس کرتا ھے - انہوں نے ان تمام نئے نئے خیالات کو جو پہلے کسی ایک نظم یا شعر یا صرف ایک مصرع کا موضوع تھے بہت شرح و بسط کے ساتھ کئی کئی نظموں میں ادا کیا اور رنگ برنگ کے ملبوس پہنا کر تازہ کر دیا ھے - اور ھر چند کہ ان کے پڑھنے کے بعد بھی ذھن صرف اسی زندہ جاوید نظم یا شعر یا مصرع کی طرف منعطف ھوجاتا ھے جو ان نظموں کا ماخذ ھیں پھر بھی کم از کم ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا - شائد ان کی بعض نظمیں مثلاً " غالب " " مہراھم خرام شب " " تاروں کا گیت " اور " رقص برگ " وغیرہ صرف اقبال کی صدائے باز گشت قرار دی جائیں لیکن ان مستثنیات کے جواب میں " سوسائٹی " " گل نافرمان " " ھندوستانی ماں کا پیغام " وغیرہ پیش کی جاسکتی ھیں جو یکسر جناب سیماب کی تراوش افکار اور جدت طبع کا نتیجہ ھوں - اسی طرح

ممکن ہے کہ بعض جگہ ان کا طرز بیان محض چربہ معلوم ہو مگر یہ ان کی شاعری کا عام رنگ نہیں ہے - وہ خوشہ چینی کرتے ہیں لیکن نظر بچاکر نہیں بلکہ حقدار بن کر - پھر ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص میں زور بیان ہے تو بڑے سے بڑے آدمی کا ہم خیال بن سکتا ہے اور اس کی اس جرات پر " بکف چراغ دارد " کا اطلاق مشکل ہی سے واجبی ہو سکتا ہے -

سیماب صاحب کی شاعری عصر جدید کی جملہ تحریکوں کی آئینہ دار ہے - موجودہ زمانے میں قومیت ' حریت اور اشتراکیت کی تحریکوں نے ہندوستانیوں کے خیالات کی رو کو ایک خاص سمت میں پھیر دیا ہے - چنانچہ جدید شاعری میں بھی اس کی ایک لہر دوڑ گئی - سب سے پہلا آوازہ کسی نے بھی بلند کیا ہو لیکن اقبال نے سب سے پہلے اس موضوع پر مکمل اور منظم طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - اس کے بعد اکثر شعرا اس میدان میں طبع آزمائی کرتے رہے لیکن کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہو سکی - اس موضوع پر سیماب صاحب کی نظمیں " کانگریس " " گاندھی " " آزادی " " نوجوان ہندوستان سے " " اے سرمایہ دار ! " " مزدور " وغیرہ بہت کامیاب ہیں اور اپنے طرز ادا کی جدت کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتی ہیں - یہاں بھی حضرت سیماب نے معاملات کو دوسروں ہی کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھا ہے - مثلاً اقبال و دیگر شعرا یعنی جوش و علی اختر وغیرہ اشتراکیت کے حامی ہیں اور موجودہ نظام تمدن کو جس کی بنیاد استبداد پر قائم ہے پیام انقلاب دیتے ہیں - اقبال جنہوں نے سب سے پہلے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا اور جن کے اشعار اب بھی لاجواب ہیں مزدور سے کہتے ہیں :—

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول

غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداری جمہور ہے سامان عیش
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک
آفتابِ تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک
باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک
کرمکِ نادان طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

سیماب صاحب کا ارشاد ہے - تخاطب سرمایہ دار سے ہے :—

جانتا ہوں میں غلط تقسیم ہے تقدیر کی
خواجگی تجھکو عطا کی اور اسے بے چارگی
قسمتِ عالم پہ ہے قبضہ مگر اللہ کا
وہ اگر چاہے بدل ڈالے تری تقدیر بھی
تیرے سرمایے میں قسمت ہے غریبوں کی شریک
ورنہ کیوں تجھ کو ضرورت سے سوا دولت ملی

دولت کی غیر مساوی تقسیم کا الزام تقدیر پر کوئی نئی بات نہیں البتہ تیسرے شعر کا استدلال خوب ہے اگر آپ اسے عامیانہ نہیں بلکہ شاعرانہ سمجھیں ورنہ سرمایہ دار پوچھ سکتا ہے کہ غریبوں کی قسمت کی غریبوں کو کیوں نہ ملی کہ میں اپنے سرمایے میں بھی ان کی قسمت کو شریک سمجھوں ؟ پھر حضرت سیماب سرمایہ دار کو " طوفان

اشتراکیت" سے خبردار کرتے ہوئے ان الفاظ میں مصالحت کے طلب گار ہیں :—

اپنے همجلسوں سے اے ماهم نہ وحشت چاهیے
جن کا تو مخدوم ہے ان کی بھی خدمت چاهیے
وہ معاون هیں ترے ' همدرد هیں همراز هیں
حسب موقع تجھکو ان کی بھی اعانت چاهیے
حقِ خدمت ان کا دینا چاهیے دل کھول کر
جو وفا تجھ سے کریں ان سے مروت چاهیے

اقبال نے اپنی اسی نظم میں سرمایہ دار کی تنگ بخشی پر یوں طنز کیا ہے :—

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رهی
اهل ثروت جیسے دیتے هیں غریبوں کو زکات

مگر واضح رہے کہ وہ کم یا بیش بہر صورت مزد تھی - اب البتہ سیماب صاحب مزدوروں کو زکواۃ دلانا چاهتے هیں - معلوم نہیں کہ مزدور کی خودداری اسے کہاں تک پسند کریگی - ممکن ہے کہ انہوں نے مصلحت وقت اسی " تدبیر مرهم " میں سمجھی هو لیکن یہ ظاهر ہے کہ انہوں نے صرف اوروں کے اقوال پیش کرنا پسند نہیں کیا اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے -

سیماب صاحب بھی اقبال اور ٹیگور کی طرح مغربی تہذیب اور اس کے اصل اصول کو خود غرضی قرار دیتے هیں اور موجودہ سیاسیات و نظام معاشرت کو انانیت کی کار فرمائی سمجھکر صداقت ' محبت '

اخوت ' اور انسانیت کی تلقین کرتے ہیں - " اساس کائنات " " فردوس گم شدہ " " طلوع سیاست " " صبح محبت " انہیں جذبات کی حامل ہیں - اور اپنی شعریت اور رنگینی بیان کے اعتبار سے بہت دلکش ہیں - نمونہ کے لئے " فردوس گم شدہ " کے چند اشعار ملاحظہ ہوں -

اک اندھیری رات میں انسان ہے مصروف جنگ
عظمت باطل کا بھوکا تشنۂ کامِ نام و ننگ
کند تلواریں تکبر کی نیام فکر میں
ترکش تخیل میں کمزور جذبوں کے خدنگ
ہے صدائے دشنہ و نشتر سرودِ ارتقا
موت کی ہر چیخ ہے اس کے لئے آواز جنگ
خون کے چھینٹوں کو سمجھا ہے بہار گلِ فروش
مذبحہ اس کو نظر آتا ہے موج آب و رنگ
معنیٔ انسانیت بھولا ہوا ہے آدمی
کارواں در کارواں ہے قومیت کا عذر لنگ

باغ میں لالہ بھی ہے گل بھی سمن بھی خار بھی
ایک رنگین خاموشی مہرلبِ فریاد ہے
رکھ لئے ہیں نام پھولوں کے ہمیں نے مختلف
فطرتِ گلشن مگر اس قید سے آزاد ہے
اس کے باطن کا کوئی انسان محروم ہی نہیں
آشنائے راز صرف اک بلبل ناشاد ہے
گلستاں کا ہر ورق ہے درس بیداری ہنوز
آہ انسانِ تغافل کیش کیوں برباد ہے

حسن تھا روح صداقت تھی محبت تھی جہاں
مجھ کو وہ فردوس گم گشتہ ابھی تک یاد ہے
جذبۂ حسن و محبت پھر بڑھانا چاہئے
پھر جہنم زار کو جنت بنانا چاہئے

حضرت سیماب کے نزدیک بھی ہماری مشکلات کا حل عہد ماضی کی طرف مراجعت ہے ۔ اس نظریہ کی صحت و غلطی سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ نفس شاعری اور اصول فن پر اس کا کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا ' یہ کہدینا ضروری ہے کہ اس باب میں ان کا تخیل بہت مبہم اور غیر مکمل ہے ۔ چنانچہ " ایک پیغام اہل‌عالم کے نام " اور " نشاط آغاز و خمار انجام " وغیرہ میں ان کے خیالات الفاظ کے خوبصورت طلسم میں گم ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔ مثال کے لئے ارالذکر نظم کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں ان کے خیالات زیادہ مکمل اور واضح ہیں :—

یاد ہیں وہ دن کہ یہ دنیا محبت خانہ تھی
بارش حسن و صداقت، نازش کاشانہ تھی
آدمی اپنے ہی کیفِ سرمدی میں مست تھا
تشنہ کامی بے نیاز ساغر و پیمانہ تھی
اپنے استحکام سے فارغ تھا ذہنِ آدمی
صرف تعمیر جہاں میں ہمت مردانہ تھی
ریت کے ذروں پہ سر جھکتے تھے سجدوں کے لئے
بندگی نا آشنائے کعبہ و بت خانہ تھی
گلشنِ ہستی میں یک رنگی کا عالم عام تھا
پہلے صرف اک قوم تھی انسان جس کا نام تھا

مشکل یہ ہے کہ تاریخ عالم کسی ایسے زمانے کی شہادت نہیں دیتی جب ساری دنیا میں یہ اِتفاق یہ اتحاد اور یکرنگی رہی ہو جناب سیماب اکثر عہد گذشتہ اور نشاط رفتہ کا ماتم کرتے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا دور ماضی تھا جب صرف اخوت و محبت تھی ظلم و ستم نہ تھا ' ایثار و قربانی تھی خود غرضی و نفسانیت نہیں پائی جاتی تھی عیش و عشرت تھے اور مصائب و آلام ان کے پہلو بہ پہلو نہیں تھے - اگر ان کے پیش نظر کوئی مخصوص عہد ایسا ہے جس کو وہ موجودہ زمانے کے لئے مثال اور معیار بنانا چاہتے ہیں تو اس کی صراحت کرنے میں کیا تکلف ہے ؟ پھر فرماتے ہیں :—

رفتہ رفتہ سادگی کے پیرہن بدلے گئے
کچھ نئے پہلو میانِ انجمن بدلے گئے
آدمیت کو پسند آیا درندوں کا لباس
فکر کے تیور نظر کے بانکپن بدلے گئے
خود پرستی نے حکومت کی حدیں تیار کیں
جنگلوں میں انقلاب آیا چمن بدلے گئے
کی گئی تقسیم مقبوضات میں سطحِ زمیں
دھر کے نقشے بہ عنوان وطن بدلے گئے
سجدہ گاھوں میں تعصب نے نئی تفریق کی
خانقاھوں میں عبادت کے چلن بدلے گئے

جب دنیا وطنیت کے مفہوم سے نا آشنا تھی اسوقت کیا زمین مقبوضات میں تقسیم نہیں کی جاتی تھی - اب اگر توپ و تفنگ کے پس پردہ قومیت کا جذبہ مصروف کار نظر آتا ھے تو کیا پہلے تیغ وسناں

ذاتی اغراض و مقاصد کا ذریعۂ حصول نہیں تھے جو نسبتاً زیادہ مذموم و ناپسندیدہ ہیں ؟ آپ صرف ایک مخصوص زمانے میں مسلمانوں کی مثال پیش کرسکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اصولوں کے لئے تلوار اٹھائی تھی لیکن نہ تمام دنیا مسلمان تھی اور نہ ان کا زمانہ دیرپا تھا کہ پورے دور ماضی کو اس سے منسوب کیا جائے - مذہبی تعصب و افتراق بھی کچھ آج کی بات نہیں ، خدا کا نام لیکر ہمیشہ انسان کا خون بہایا گیا ہے - خیر اس قصۂ ماضی کو چھوڑ کر اس خواب مستقبل پر آئیے جسے سیماب صاحب دیکھ رہے ہیں :—

دور کر سکتی ہے اک انگڑائی اب بھی روح کی
شخصیت کی تشنگی جمہوریت کا اضطراب
صرف تم انسان بن کر اپنی دنیا میں رہو
پُر سکون آزاد و یکسو ، کامگار و کامیاب

" روح کی انگڑائی " ! معلوم نہیں اس کا کیا انداز ہوگا - " انسان بن کر رہنا " ! یعنی آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا - لیکن کیا کیا جائے ، زندگی کی حقیقتیں اتنی ہی تلخ ہیں اور اس کی مشکلات اسیقدر دشوار ، ورنہ شائد اس خواب سے پہلے ہی اس کی تعبیر ممکن ہوسکتی، عام اس سے کہ وہ خواب ٹیگور نے دیکھا ہے یا جناب سیماب نے -

اپنی دوسری نظم " نشاط آغاز و خمار انجام " میں سیماب صاحب نے اسی خیال کو اور زیادہ شاعرانہ پیرایہ میں پیش کیا ہے - اس کے آخری دو بند یہ ہیں -

مدتیں گذریں اسی انوار میں جھولے ہوئے
آدمی ہے اب نشاطِ اولیں بھولے ہوئے

وہ تجلی پھر دکھا دے جو دکھائی تھی کبھی
جلوہ آرا منظرِ ہستی میں ہو جا بے حجاب

بےحجاب

بےحجاب اے فطرت ہمراز و محرم بےحجاب
پھر وہی امن و سکون ہو پھر وہی کیف و نشاط
پــر تــو صبح ازل هــو شمع بزم انبساط
اے فضائے عالم ہستی بدل دے اپنا رنگ
اے دعــاے ارتقائے دهــر هــوجا مستجاب

مستجاب

مستجاب اے التجائے جانِ پُر غم مستجاب

لیکن اگر مستقبل کو ماضی کے نقش قدم پر چلنا ھے تو یہ "ارتقا" ھوا یا "رجعت"؟—معلوم نہیں ٹیگور اسے کیا سمجھتا ھے—ایک شخص کہہ سکتا ھے کہ اگر اسی خواب مستقبل کا نام فکر فردا ھے اور اسی غم دوش کو "کار امروز" کہتے ھیں تو ھماری گل و بلبل والی شاعری کیا بری تھی جس میں ھم ان سب سے بیک وقت بے نیاز تھے -

سیماب صاحب نے وطنیت و قومیت کی مخالفت بھی کی ھے اور موافقت بھی - وہ ایک طرف اس تفرقہ و امتیاز اور جغرافیائی حد بندی کو انسانیت کے منافی قرار دیتے ھیں تو دوسری طرف دوسرے عنوانات کے تحت میں اس کی تعریف کا راگ بھی گاتے ھیں - اقبال کے یہاں بھی یہی بات پائی جاتی ھے لیکن اقبال نے ایک مخصوص زمانے تک جو ان کی شاعری کے دور اول تک محدود تھا وطنیت کی پاسداری کی ھے اس کے بعد اس کو بالکل ترک کرکے ملیت کے علمبردار ہوگئے اس

لئے یہ تغیر اقبال کے یہاں صرف خیالات کا ارتقا ھے لیکن سیماب صاحب کے یہاں کھلا ھوا تناقص - معلوم ھوتا ھے کہ اس معاملہ میں سیماب صاحب کے پیش نظر کوئی مخصوص نظریہ نہیں ھے اور نہ انھوں نے اس پر زیادہ غور و فکر سے کام لیا ھے - چنانچہ ان کی نظمیں ''میرا وطن'' ''ایک پیغام اہل عالم کے نام'' اور ''نوجوان ہندوستان سے'' ''کانگریس'' وغیرہ گو اپنی اپنی جگہ قابل قدر ھیں لیکن خیالات کے اعتبار سے ھم آھنگ نہیں -

در اصل یہ کچھ موصوف ھی کی شاعری پر منحصر نہیں موجودہ شاعری عام طور پر مستعار ذھنیت کی حامل ھے جس میں اپنے وجدان و ذوق کی رعائت دشوار اور اپنے معتقدات سے خلوص رکھنا تقریباً ناممکن ھے - شعرا نے لوگوں کے رجحان کو جدھر دیکھا ادھر خود بھی مائل ھوگئے - قبولیت عام حاصل کرنے کا سیدھا راستہ بھی یہی ھے کہ دوسروں کی پسند سے خود مجبور ھوجائے نہ کہ دوسروں کو پسند کرنے پر مجبور کرے - اقبال نے تو صاف صاف اسلام اور اصول اسلام کو انسان کے درد کا درماں بتایا ھے جس کی وجہ سے ان کا پیغام کم از کم مبہم اور متضاد تو نہیں ھے - پھر ظاھر ھے کہ جہاں ان کو داد بہت ملی وھاں ان کے خلاف صدائیں بھی کافی بلند کی گئیں مگر اس کے لئے اخلاقی جرات کے علاوہ ایک زبردست شخصیت کی ضرورت تھی جس کا نصب العین اس کے فکر و غور کا نتیجہ ھو ' جو زمانے کی مصلحتوں پر اپنے اصولوں کی قربانی گوارا نہ کرے اور اس اختلاف کو خوش اسلوبی اور ثابت قدمی کیساتھ نباہ لے جائے - لیکن ھر شخص اقبال اور ٹیگور نہیں ھوسکتا - سیماب صاحب کےیہاں یہ الجھاؤ اگرچہ ایک بڑی حد تک اسوجہ سے ھے کہ انھوں نے اپنے تفکر و تدبر سے کام نہیں لیا ھے اور جو کچھ کہا ھے اسے پہلے خود نہیں سمجھ لیا ھے - لیکن اس کی وجہ ایک یہ بھی ھے کہ وہ

رواداری کے قائل ہیں اور کسی کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگانا چاہتے - وہ اپنے مذہب و مسلک ' ملت و قومیت کو شاعری کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں اور پڑھنے والے کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس حیثیت سے سامنے آتے ہیں ایک مسلمان بن کر یا ایک ہندوستانی کے جامے میں اور یا ان لوازم سے ماوراء اُس ہیولے کی شکل میں جو ذہن فطرت میں پہلے پہل مرتسم ہوا تھا یعنی محض انسان کی حیثیت سے - چنانچہ سوائے ان دو ایک نظموں کے جن کا تخاطب براہ راست مسلمانوں سے ہے وہ اسلام کا نام لینے میں خاص احتیاط سے کام لیتے ہیں - اگر ہندوستانیوں سے تخاطب ہے تو قومیت بھی ہے اور وطنیت بھی لیکن جب ساری دنیا کو پیغام سنانا ہے تو مجرد انسان ہیں اور پیکر انسانیت - اور پھر وہ اپنی ان مختلف شخصیتوں کو مجتمع بھی نہیں کرسکتے - اب اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو ان کے کلام کے جملہ اسقام جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے صرف ضرورت و مصلحت اور مجبوری قرار پاتے ہیں اور اس لحاظ سے یقیناً ناقابل عفو نہیں -

یہاں سیماب صاحب کی ایک خصوصیت قابل ذکر ہے - ان کا پیرایۂ بیان خشک سے خشک موضوع کو دلچسپ بنا دیتا ہے - وہ اپنی نظموں میں شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے - یہی وجہ ہے کہ ان کے سامعہ نواز ترانوں کے پس پردہ پند و موعظت کی تلخی نہیں محسوس ہوتی - وہ حقائق کو ایک فلسفی یا مدبر کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے وہ صرف شاعر ہیں اور شاعری پر اکتفا کرتے ہیں - ان کی صحت ذوق کا یہی کیا کم ثبوت ہے کہ وہ اپنے مخصوص حد سے باہر پانوں نہیں نکالتے - جن نظموں کے اشعار اوپر درج کیے گئے ہیں تغزل اور رومانیت کی لطافتوں سے مالا مال ہیں - بالخصوص " نشاط آغاز اور خمار انجام "

کی جدت ترکیب قابل داد ہے جس نے خیالات سے متناسب ہوکر نظم میں ایک عجیب ترنم پیدا کردیا ہے -

یوں تو سیماب صاحب کی شاعری میں جذبات وحسیات کا عنصر بھی کافی حد تک موجود ہے جیسا " فطرت کی جوگن " " دل کی پیاس " اور " شام لحد " وغیرہ سے ظاہر ہے لیکن جہاں ان کی شاعری ان کی شخصیت اور زندگی سے قریب ہوجاتی ہے وہ زیادہ کامیاب جذبہ نگاری کرتے ہیں - " تیرے ماضی کی یاد میں " " انتباہ " اور " حسن کا آخری حربہ " خاص تاثرات میں ڈوبی ہوئی چیزیں ہیں جن میں داخلی رنگ بہت گہرا ہے - " تیرے ماضی کی یاد میں " سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں - ایک سے ایک بہتر شعر کہا ہے کہ انتخاب دشوار ہے - تخاطب ایک ایسے محبوب سے ہے جس کے عہد طفلی کی یاد ' کہ اب شباب نے اس کی معصومیت کو ہمیشہ کے لئے چھین لیا ہے ' شاعر کو بیتاب کیے ہوئے ہے :—

مری نظر میں ہے دیباچۂ شباب ترا
کہ مست حسن کے نغموں سے تھا رباب ترا

وہ تیرا عالم طفلی وہ تیرا عہد جمیل
سرود و شعر سے وہ ذوق بے حساب ترا

مری خوشی پہ وہ تیرا تبسم رنگین
وہ میرے جذبۂ برہم پر اضطراب ترا

وہ شوق کے لب تشنہ وہ تیرا عارض تر
وہ مشت خاک کے قبضے میں آفتاب ترا

وہ ابشار رواں مے کے تیرے ہونٹوں پر
وہ بوے بادہ میں ڈوبا ہوا گلاب ترا

وہ ابتدائے محبت وہ چاندنی راتیں
مرے کنار میں وہ پر سکون خواب ترا
وہ شب کے سایے میں کافر ملاحتیں تیری
سحر کے بھوس میں وہ حسن لاجواب ترا
وہ تیرے کیف تر نم میں میرا کھو جانا
وہ میرے گرم تنفس سے پیچ و تاب ترا
مری نظر میں تری ہر نظر پیام حیات
وہ میری آنکھ میں ہر جلوۂ کامیاب ترا
کہاں گیا وہ زمانہ وہ اک جہانِ نشاط
چھری لیے ہوے کیوں آگیا شباب ترا
سلام شوق تری اس حیات رفتہ کو
پیام مرگ محبت ہے انقلاب ترا

سیماب صاحب نے رنگا رنگ عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں اور اگر ان کی دلکشی اور شعریت سے کوئی غیر معمولی توقع پہلے سے نہ قائم کر لی جائے تو یہ کہنا بےجا نہوگا کہ سیماب صاحب نے انہیں خوب نباہا ہے - لیکن " ارض تاج " کے سلسلے میں انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں ان کی قوت شاعری کی صحیح ترجمان ہیں - یہ نظمیں منظر نگاری ' محاکات اور لطافت تشبیہ کے لحاظ سے ممتاز ہیں - " ارض تاج " کی ابتدائی بارہ یا تیرہ نظموں میں ایک طرح کا تسلسل ہے - اس میں جناب سیماب ایک رہبر یا گائڈ کی حیثیت اختیار کرتے ہیں وہ مسافر کو بہ نفس نفیس آگرہ کے آثارالصنادید کی سیر کراتے ہیں اور حسب قاعدہ ہر ایک کی مختصر تاریخ اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں بیان کرتے جاتے ہیں - لیکن انہوں نے اس رسم کی اخیر تک پابندی

نہیں کی ہے - یہ اس لئے لکھدیا ہے کہ مسافر سے مراد خود ناظرین کرام ہیں - اس سلسلے میں " ارام باغ " والی نظم خاص طور پر قابل ذکر ہے - اردو میں کم نظمیں ایسی ہوں گی جن میں اتنی رومانیت ہو - کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :—

اس کی شادابی سے قائم تھی بہار کائنات
سبزہ تھا ہمراز اس کا اور دریا ہمنشیں
اب بھی اس کے پانوں چھو لیتی ہیں موجیں بار بار
اس کی بربادی میں گو ذوق پذیرائی نہیں
پرورش پاتی تھی اس کے سایہ میں روح بہار
شام تھی اسکی چندار اور صبح اسکی یاسمیں
ہاں یہ ہے دیکھے ہوئے گلگشت انداز و جمال
ثبت ہیں اس پر حسینوں کے خرام نازنیں
سرو ہے افسردہ خاطر ' پا بگل شمشاد ہے
لیکن ان کو اب بھی اپنا خواب رنگین یاد ہے
دیکھ وہ شہزادیاں پھرتی ہیں اتھلاتی ہوئی
ہر روش پر انکھڑیوں سے پھول برساتی ہوئی
تازہ کلیاں توڑ کر دوڑی وہ اک کمسن کنیز
نکلی کنج گل سے وہ اک خادمہ گاتی ہوئی
نذر لے کر تازہ پھولوں کی چلی باد نسیم
وہ ہوا آئی دماغ و دل کو مہکاتی ہوئی
وہ پپیہے کی صدائیں - وہ نوا طاوس کی
زندگی کی آگ سے سینوں کو گرماتی ہوئی
آج اس فردوس میں باقی کہاں وہ زندگی

آج پھرتی ھیں بہاریں ٹھوکریں کھاتی ہوئی
سب جسے رسماً کہا کرتے ھیں اب ارام باغ
اس نے دیکھی ھیں ھماری عظمتیں جاتی ہوئی
انقلاب رفتہ سے لالے کا دل پر داغ ھے
ھے بہاروں کا یہ رنگین مقبرہ یا باغ ھے

سیماب صاحب یہ بہتر سمجھ سکتے ھیں کہ ان کی شاعری کہاں کامیاب ھوسکتی ھے لیکن ھم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ نظم ان کی شاعری کی معراج کمال ھے - اس سلسلے کے علاوہ " تاج کنار شفق میں " رنگینی بیان اور محاکات کے اعتبار سے بہت مکمل نظم ھے - " صبح تاج " بداعت اسلوب اور جدت تخیل کا اعلیٰ نمونہ ھے - دوسری نظموں میں شاھان مغلیہ کی یاد تازہ کرکے انہوں نے عبرت کا پہلو بہت کامیاب طریقے سے پیش کیا ھے - حقیقت یہ ھے کہ حضرت سیماب نے اس موضوع پر اتنا کچھ لکھ ڈالا ھے کہ گویا " ارض تاج " کو اپنا بنا لیا ھے اور وہ بجا طور سے " شاعر تاج " کہے جانے کے مستحق ھیں -

زمانہ خود بہترین ناقد ھے اور گو اس کے پاس حسن و قبح کا کوئی مخصوص معیار نہیں لیکن وہ رفتہ رفتہ انہیں علیحدہ کرکے چھوڑتا ھے اس لئے " کار امروز " پر ابھی اور کچھ لکھنا شاید قبل از وقت ھو لیکن اتنا ضرور وثوق کےساتھ کہا جاسکتا ھے کہ اس میں شعر و سخن کے شائقین کے لئے غیر معمولی سامان دلچسپی موجود ھے -

صغیر احمد صدیقی - ایم - اے

" سیرالصحابہ حصہ ہفتم "— مرتبہ مولوی شاہ معین‌الدین رفیق دارالمصنفین شائع کردہ دارالمصنفین مطبوعہ معارف اعظم گڑہ حجم ۳۲۷ صفحات ' اہتمام طبع و اشاعت دیدہ زیب کاغذ چکنا ' دبیز ' قیمت درج نہیں

ملنے کا پتا—دارالمصنفین آعظم گڈہ -

دارالمصنفین آعظم گڈہ کے علمی اور ادبی کارنامے عرصے سے خراج تحسین و قدردانی وصول کرنے کی وجہ سے ملک میں تعارف سے مستغنی ہیں -

غالباً اس کا اعتراف نا مناسب نہ ہوگا کہ مولانا شبلی مرحوم پہلے شخص ہیں جنہوں نے ٹھیٹھ مذہبیات کو بھی قابل قبول اردو بلکہ ادبیات کے رنگ میں ملک کے سامنے پیش کیا ہے ' دارالمصنفین کے وسیع حلقہ علم و ادب کے ارکان اسی نقش قدم پر کامیابی سے چل رہے ہیں -

اب تک اس حلقے نے جتنی کتابیں شائع کی ہیں کتاب زیر نظر اُس سلسلے کی چوالیسویں کڑی ہے -

سیرت‌النبی کی طرح سیرالصحابہ کی تعمیر کی بھی بنیاد مولانا شبلی نے اپنے ہاتھ سے رکھی تھی جس کا سلسلہ اس ساتویں جلد پر ختم ہوتا ہے -

اس میں شبہ نہیں کہ اخلاق کی درستی موقوف ہے اخلاقی کارناموں کی پسندیدگی اور کوشش عمل پر پسندیدگی اور کوشش عمل کے لئے کوئی معیار ہونا چاہئے ' مولانا شبلی مرحوم کی ژرف نگاہی اور ان کے متبعین کے عمل نے جس سلسلے کو سامنے رکھا ہے وہ اخلاق انسانی درستی کی لئے اعلیٰ معیار ہے -

اخلاق کے ساتھ علمی اور مذہبی مسائل کا حل ادبیات کی چاشنی اور بیان کی سلاست کے دوش بدوش اس کتاب میں موجود ہے -

عام طور پر اس قسم کی کتابوں میں جو بے آہنگی اور بے ربطی ہوا کرتی ہے یہ کتاب اس سے بالکل مستثنیٰ ہے -

استناد و درایت و روایت ' قبول احادیث و روایات صحیحہ کا بھی اس کتاب میں خاص اہتمام ہے اس کتاب میں ڈیڑھ سو ایسے صحابہ کے حالات ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا یا اس سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوے لیکن ہجرت نہ کر سکے یا عہد رسالت میں صغیرالسن تھے -

اس کتاب کی اہمیت اس نقطۂ نظر سے اور بڑھ جاتی ہے کہ جن جزئیات کا اس میں احصا کیا گیا ہے وہ متداول اور مشہور کتابوں میں عام طور پر نہیں ملتیں اس لئے فراہمی مواد میں جو کوشش کی گئی ہے اس کی عظمت قابل تسلیم ہے -

(ک)

'' محبت کے پھول ''—زمانہ موجودہ میں جس طرح انسانوں پر نیا دور آیا ہے یعنی اب ان میں طوالت اور تعدد افراد نا پسند سمجھا جانے لگا ہے اور صرف ایک شخص کے افکار و افعال کی تحلیل نفسی مگر مختصر' رائج ہوئی ہے - ٹھیک اسی طرح ڈرامے (تمثیل) کا بھی حشر ہوا - پہلے گانے ' تفریح و نقل ' مختلف زمان و مکان کا نظارہ اور تعدد افراد اس کے لوازم سمجھے جاتے تھے اب اس کا حسن یہ قرار دیا گیا ہے کہ ایک ایکٹ کا ہو ایک ہی جگہ واقع ہوا ہو ' زمان واقعات میں فصل نہ ہو وغیرہ - اس قسم کا ایک ڈرامہ ٹیگور کا انگریزی میں تھا جس کا

ترجمہ اب مسٹر فرید جعفری مچھلی شہری نے کیا ہے ٹیگور کے افسانے یا ڈرامے تعریف یا تعارف سے مستغنی ہیں - رہا ترجمہ تو اس کی زبان صاف اور سادہ ہے جو ترجمہ نہیں معلوم ہوتا -

مسٹر فرید ابھی دنیائے ادب میں صرف چھہ برس کے ہیں (جیسا انھوں نے خود لکھا ہے) امید ہے کہ آئندہ انکا ذوق ادب کچھ مفید کام پبلک میں لائیگا - کتاب کے شروع میں خواجہ حسن نظامی کی تقریظ بھی ہے - چھبی تقطیع ہے ضخامت ۱۲۹ صفحات - قیمت ۸ آنہ کتاب خود مصنف سے مل سکتی ہے -

(ز س)

" رباعیات اخگر "— شعر کا ذوق وھبی ہوتا ہے اور اگر اسے سلیقہ سے برتا جائے تو بہت کچھ مفید بھی ہوسکتا ہے مگر عوام کی اس خیرہ ذوقی کو کیا کہجئے کہ جو شخص بھی اپنے اندر مصرعے موزوں کرنے کی صلاحیت پاتا ہے وہ آنکھ بند کر کے غزل گوئی پر اتر آتا ہے گویا غزل اور شعر کو مترادف سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ دیگر اصناف کا بھی دروازہ کھلا ہوا ہے - پھر مشاهدہ گواہ ہے کہ انھوں نے اپنی فطرت نہ سمجھنے کی غلطی کرکے کس طرح نگاہ عام میں اپنے کو کم کر دیا اور کس طرح زمانہ نے ان کی غزل کو قبول و پزیرائی سے محروم کر دیا اور اس بھیڑ چال میں معین ہوئیں دو باتیں - ایک تو مشاعروں کی دعوتیں اور ان میں داد و تحسین کی غلط بخشیاں اور دوسری تذکرہ نویسوں کی یہ روش کہ انھوں نے بعض شعرا کی جانبداری کرتے ہوئے مدح کے لجھ میں یہ لکھ دیا کہ " تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی " حالانکہ یہ امر طے شدہ ہے کہ ایک فن کا پختہ کار دوسرے فن میں

مبتدی ہوتا ہے - سعدی کا رزم میں پھیکا رہنا - مرزا غالب کا مرثیہ سے ہاری مان لینا بے معنی نہیں تھا - اصل یہ ہے کہ امیر خسرو کی سی فطرتیں ایک ہی دو ہوتی ہیں اور مادر گیتی مدتوں بعد ان کو پیدا کرتی ہے جو ہر میدان میں جولانی کر سکیں - حضرت اخگر نے غالباً کچھ اسی قسم کے خیال سے غزل گوئی کے فرسودہ راستہ سے ہٹ کر رباعیوں کو اپنی زور طبع کا جولانگاہ بنایا ہے - اور اس میں شک نہیں بہت عمدہ رباعیاں کہی ہیں کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :—

ذات انسانی خدا کی مظہر ہے - اس پر لکھتے ہیں -

میں ہوں مگر اتنا تو نہیں کچھ مجھ میں
صورت نہیں آئی تری تصویر ہوں میں

مخلوق کا رغبت یا نفرت کرنا خدا کی جانب سے -

اس کو کس مزے سے ادا کیا ہے خاص کر تیسرا مصرعہ جس بلاغت کا حامل ہے - ارباب نظر پر مخفی نہیں - کہتے ہیں :—

دنیا نے مجھے چھوڑ دیا خوب کیا
رخ اُن کی طرف موڑ دیا خوب کیا
میں دوڑا تھا سایہ کو پکڑنے کے لئے
پاؤں کو مرے توڑ دیا خوب کیا

اس کتاب میں ۱۵۲ رباعیاں ہیں شروع میں مصنف کی تصویر اور ذاتی حالات ہیں - پھر صفحہ ۲ سے ۱۴ تک ایک مقدمہ ہے جس میں اردو شاعری کی تعریف اور اخگر کی شاعری کا تعارف ہے - صفحہ ۱۵ پر اخگر کی ایک غزل بھی بطور نمونہ کے لکھدی ہے - اس کے بعد مولوی عبدالحق صاحب ' بی - اے کی رائے ہے - وہ لکھتے ہیں " جناب اخگر

نے خوب خوب مضمون پیدا کئے ہیں اور ان کو شستہ زبان میں خاص انداز سے ادا کیا ہے -

(س)

" اردو کا پہلا ناول نگار "—اویس احمد صاحب بی اے آنرز' الہ آباد نے گذشتہ سال ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں انعامی کتابوں کے سلسلہ میں یہ مضمون بھیجا تھا اور اکیڈمی کے انتخاب میں یہی مضمون قابل انعام سمجھا گیا - اب مصنف نے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے جیسا عنوان سے ظاہر ہے مصنف نے اِس میں اس امر کی تحقیق کی ہے کہ اردو کا پہلا ناول نگار کون ہے اور آخر میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ شمس العلماء مولوی نزیر احمد دہلوی اردو کے پہلے ناول نگار ہیں - اردو میں عام طور پر سرشار کو پہلا ناول نگار مانا گیا تھا - اویس احمد صاحب نہایت کامیابی کے ساتھ اس تحقیق سے عہدہ برآ ہوے ہیں کہ یہ رائے صحیح نہیں ہے اس سلسہ میں محض دونوں مصنفین کے افسانوں کی تواریخ تصنیف و طباعت سے قیاس آرائیاں کرنا فضول سی بات تھی مصنف نے پہلے ناول کے لوازم و خصائص اور حدود و قیود معین کئے ہیں چنانچہ ناول کے موضوع ' خاکہ ' اشخاص ' مکالمہ اور مقصد کی بحثیں کی ہیں - ہم نے صرف پہلی بحث پڑھی ہے اور کلیتاً مصنف کے ہم خیال ہونے پر مجبور ہوگئے - یہ تصنیف یقیناً اردو ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ ہے - اور اکیڈمی کی قدردانی اور ہمت افزائی بالکل بر محل ہوئی ہے -

(س)

" نغمۂ دل "—یہ دیوان ہے جناب ضمیر حسن خاں صاحب دل شاہجہان پوری کا جس میں شروع میں بترتیب حروف تہجی غزلیات

هیں اور اس کے بعد ۱۷ صفحہ میں فرد رباعی مخمس اور ترجیع بند ابتدا میں ۵۷ صفحات کا ایک مقدمہ ہے نیاز فتحپوری کا لکھا ہوا جس میں شعر کی ماہیت ' دل صاحب کی مختصر سوانح عمری ' اُن کی شاعرانہ خصوصیت کا بیان ہے اور اپنی رائے کا اظہار نہایت فراخ دل و دریادلی سے کیا گیا ہے - اس کے بعد مرزا ہادی عزیز لکھنوی کا ایک تبصرہ بھی تین صفحوں میں ہے -

جناب دل ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ روز مرہ اردو پر پوری قدرت رکھتے ہیں - خیال کو فصیح روز مرہ میں اس برجستگی سے ادا کر جاتے ہیں کہ طبیعت دیر تک مزہ لیتی رہتی ہے لکھتے ہیں :—

نگاہ شوق رہی ہم زبانِ دل لیکن   کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے

دوسرا مصرعہ فصاحت ' روز مرہ ' زبان ' برجستگی کا ڈھلا ہوا نمونہ ہے - ایک جگہ لکھتے ہیں :—

مصرعہ - نہیں نہیں وہ فسانہ نہیں سنانے کا - نہیں سنانے کا یہ روز مرہ اُن معنوں میں کہ میں نہ سناؤں گا - یا یہ سنانے کے قابل نہیں ہے - اس پر نہیں نہیں کی تکرار و تاکید جیسی کچھ برجستگی و لطف رکھتی ہے ظاہر ہے -

حسن زبان کے ساتھ مضمون آفرینی بھی اُن کی خصوصیت ہے لکھتے ہیں :—

تلاش یار کجا آرزوے دید کجا   ہمیں تو عمر ہوئی اپنی جستجو کرتے

نفس مضمون تو یہ تھا کہ انسان کا خود اپنے کو سمجھنا بھی تلاش یار ہے - من عرف نفسہ الخ مگر طرز بیان سے یہ لطیف مضمون پیدا کردیا گیا

ھے کہ ھم کو تلاش یار کا موقع کہاں ملا - اس سے زیادہ مشکل تو اپنے کو پہچاننا ھے -

بہر حال کلام کی خوبی لوگوں سے خراج قدر و تحسین لئے بغیر نہیں رہ سکتی - کاغذ ' طباعت و کتابت عمدہ ھے - تقطیع اسکولی کتابوں کی ھے - قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں ھے -

(س)

" حضرت امجد کی شاعری "—سید احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی ایک صوفی منش شاعر ھیں - ان کا کلام اکثر اردو رسائل میں طبع ھوتا رھتا ھے آپ کی شاعری کا اعتراف زبان اردو کے مایۂ ناز حضرات مثل سید سلیمان ندوی - سر اقبال - عبدالماجد دریا بادی - وحیدالدین سلیم مرحوم و طباطبائی وغیرہ نے کیا ھے جس کے اقتباسات اس کتاب میں صفحہ ۸۷ پر درج ھیں -

یہ کتاب اُن کے ایک عقیدت‌مند شاگرد نصیرالدین صاحب ھاشمی نے لکھی ھے اور ۸۰ صفحات میں اپنے استاد کے کلام پر نظر ڈالی ھے اور مثال و نمونہ سے ظاھر ھوتا ھے کہ وہ "چودھویں صدی ھجری کے شعرائے اردو میں مہر تاباں قرار دیئے جا سکتے ھیں "

چند رباعیاں ملاحظہ ھوں -

حمل امانت -

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکر صفات ' ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی جاھل سہی نادان سہی
سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

وحدت مطلب -

سارى دنيا سے هاتھ دھو كر ديكھو
جو كچھ بھي رها سها هے كھو كر ديكھو
سب كچھ نه ملے اگر تو ميرا ذمه
ايک مرتبه تم ايک كے هوكر ديكھو

غزل كے نمونے -

نورِ زمين و آسماں ديدۂ دل ميں آے كيوں
ميرے سياه خانه ميں كوئى ديا جلاے كيوں
ديكھے تجھے جو اک نظر هوش ميں پھر وه آے كيوں
جس كو ترے قدم مليں سجدے سے سر اٹھاے كيوں
امجدِ خسته حال كى پوري هو كيوں كر آرزو
دل هى نهيں جب اُس كے پاس مطلب دل برائے كيوں
(س)

نیرنگ خیال

ہندوستان کا مقبول ترین علمي اور ادبي
ماہوار مجلہ - دس سال سے برابر شائع
ہو رہا ہے - سال بھر میں تریباً
--- ایک ہزار (۱۰۰۰) صفحات ---
اور
کئي درجن رنگین تصاویر
--- شائع ہوتي ہیں ---

ملک کي کئی ہزار تعلیم یافتہ خواتین اسے پڑھتی ہیں - نیرنگ خیال کي اشاعت ہندوستان بھر کے تمام علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ ہے ہر ماہ تقریباً ایک لاکھ تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ میں رہتا ہے - نیرنگ خیال کي مقبولیت کا راز صرف یہ ہے کہ اس میں تمام بڑے بڑے اہل قلم مضامین لکھتے ہیں اور اس کا چندہ بے حد قلیل ہے -

چندہ سالانہ : تین روپئے چار آنے - سالانہ سمیت چار روپئے بارہ آنے - سالانہ دسمبر کے پرچے کے علاوہ بطور زائد خاص نمبر علیحدہ شائع ہوتے ہیں ' جس کی جدا گانہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہوتي ہے -

نیرنگ خیال میں اشتہار دینا ہندوستان کي تمام متمول پبلک تک پہونچنے کا بہترین ذریعہ ہے -

اُردو

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن) کا خالص
ادبی سہ ماہی رسالہ
جو
جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے
جس میں
ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے -
اُردو مطبوعات اور رسالوں پر تبصرے بھی کئے جاتے ہیں -

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب، بی - اے -
سکریٹری انجمن ترقی اُردو اور پروفیسر اُردو جامعۂ عثمانیہ،
حیدرآباد (دکن) -

سالانہ چندہ: سات روپئے - ایک نسخے کی قیمت ایک روپیہ ۱۲ آنے -

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)

یا

کتابستان

۱۷ - سٹی روڈ، الہ آباد -

سال نو کا غیر فانی

تحفہ

رسالہ "جہانگیر" لاہور کا

سالنامہ سنہ ۱۹۳۵ع

اپنی تمام دلاویزیوں کے ساتھہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوچکا ہے - اس میں تقریباً ہر موضوع پر ملک کے بلند پایہ ادباء اور سحر طراز شعرا نے اپنے شاہکار پیش کئے ہیں - بہترین آرٹ کی سہ رنگی و یکرنگی تصاویر اُس کی دلفریبیوں میں اضافہ کر رہی ہیں - صفحات تقریباً پونے دو سو اور قیمت فی پرچہ صرف ایک روپیہ -

لیکن

جو صاحب مبلغ تین روپے چھہ آنے سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماکر سال بھر کی خریداری منظور فرمائیں گے ان کی خدمت میں سالنامہ مذکور کے علاوہ اگست سنہ ۱۹۳۵ع میں شائع ہونے والا مہتمم بالشان نظام نمبر جو گذشتہ نظام نمبر سے ہر طرح بڑھہ چڑھہ کر ہو قیمتی ۲ روپیہ بلا قیمت پیش ہوگا -

عام پرچے ماہ بماہ پوری پابندی سے حاضر خدمت ہوتے رہیں گے -

نیاز مند

منیجر رسالہ جہانگیر ' ریلوے روڈ ' لاہور

ہندُستانی

ہندُستانی اکیڈیمی کا تِماہی رِسالہ

سنہ ۱۹۳۵ء

ہندُستانی اکیڈیمی صُوبۂ متحدہ، اِلہ آباد

سالانہ چندہ پانچ روپیہ

هندستانی ' سنہ ۱۹۳۵ع

ایڈیٹر : اصغر حسین ' اصغر

مجلس مدیران

فہرست مضامین

صفحہ

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۵ | اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ع | حصہ ۴

ہندوستان کا قدیم تمدن[۱]

(از ڈاکٹر بینی پرشاد ' ایم ' اے - پی ' ایچ ' ڈي - ڈی ایس ' سی)

یوں تو پوری تاریخ ایک ہے ' لیکن مطالعہ کی سہولت کے لئے

ہندوستان کي تاریخ

غیر ملکوں کے مانند ہندوستان کي تاریخ کے بھی تین حصے کئے جا سکتے ہیں :—(۱) قدیم ' یعنی جو قدیم زمانے سے لیکر بارھویں صدي عیسوي تک رہا ' جس کے تمدن کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہیں پایا ' اور جس کے دھرم ' سماج ' سیاست ادب اور آرٹ (فن) کے چشمے اپنے خاص انداز سے تمام ملک کو سیراب کرتے رہے ' اور جس کے اصولی نظام کو کسی بڑی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا - بارھویں صدی میں یہ حالت تبدیل ہوگئی ' شمال مغرب سے نئي قوموں نئے مذھب اور نئے تمدن کا داخلہ ہوا ' جنھوں نے ملک کی سیاسي حالت بالکل بدل دی ' جنھوں نے سوسایٹی پر بھی بہت اثر ڈالا اور ملکي زبانوں کے ادب اور آرٹ کے راستوں کا رخ تبدیل کردیا -

---

[۱] یہ مضمون ڈاکٹر بینی پرشاد کي کتاب کے ترجمے کا ایک ٹکڑا ہے - پورا ترجمہ علیحدہ کتابي صورت میں اکیڈیمی کي جانب سے شائع ہورہا ہے - مدیر

اس وقت سے زمانۂ وسطی کا آغاز ہوتا ہے جو اٹھارھویں صدی تک رہا - پرانی تہذیب کے بہت سے اصول و عناصر اس زمانے میں بھی موجود تھے ' ملک کے بہت سے حصوں میں انھوں نے نشو و نما بھی پائی لیکن نئی قوتوں اور نئے اثرات سے مل کر انھوں نے ایک نئے تمدن کی صورت اختیار کر لی - اٹھارھویں صدی سے ہماری تاریخ کا جدید دور شروع ہوتا ہے ' جس میں مغربی اثرات کے باعث ملک کی سیاسی اور معاشیاتی حالت پھر تہ و بالا ہو جاتی ہے اور زندگی کے تمام حصے بڑی تیزی سے رنگ بدلنے لگتے ہیں - ہر ایک ملک کے لئے جدید تاریخ سب سے زیادہ مفید ہوتی ہے ' کیونکہ وہ موجودہ حالات پر سب سے زیادہ روشنی ڈالتی ہے اور موجودہ گتھیوں کو سلجھانے میں سب سے زیادہ مدد دیتی ہے - لیکن کئی وجوہ سے ہندوستان کی قدیم تاریخ کا سمجھنا بھی بہت ضروری ہے - ایک تو بہت سے پرانے خیالات اور رسم رواج اب تک باقی ہیں ' پرانے ویدانت کی عظمت اب تک قائم ہے ' پرانا سنسکرت کا ادب آج بھی ملکی زبانوں کی ادبیات پر پورا اثر ڈالے ہوئے ہے ' پرانے دھرموں کے اصول ابھی تک مانے جاتے ہیں ' دوسرے یہ کہ زمانۂ وسطی اور حال کی تاریخوں کی اصلیت کا بغیر قدیم تاریخ کے صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا - تیسرے یہ کہ قدیم زمانے میں مغربی اور مشرقی ایشیا کے ہندوستانی دھرم اور تہذیب کا ایسا اثر پڑا تھا کہ وہ آج تک نہیں مٹ سکا ہے - ان دور دراز ملکوں کی تہذیب کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کی قدیم تاریخ سے واقفیت ضروری ہے - چوتھے علمی نقطۂ نظر سے پرانی زبان ' روایات ' مذہب ' شاعری ' علم‌الحساب ' نجوم ' سوشل اور سیاسی نظام کی یوں بھی خاص اہمیت ہے - پرانے زمانے میں بہت سی تصنیفیں ہوئی ہیں جو آج کل کے سوشل علوم '

فلسفہ اور لسانیات کے جاننے میں بہت مفید ثابت ہوئی ہیں - سچ تو یہ ہے کہ انیسویں صدی میں بوپ - گرم اور میکس مولر وغیرہ نے جو نئے نئے نظریئے تیار کئے وہ ہندوستانی تہذیب کی اصل بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتے تھے - جب ہندوستانی مواد کا پورا استعمال ہو چکے گا تو آج کل کے سوشیالوجی (علم تمدن) کی صورت بدل جائیگی -

مواد اور مسالا

سو برس سے اہل علم کو شکایت ہے کہ قدیم زمانے میں ہندوستانیوں نے تاریخ بہت کم لکھی ' اپنی کتابوں عمارتوں یا مورتیوں پر تاریخ کی روشنی ڈالنے کی پروا نہیں کی اور اب ہمارے لئے پوری تاریخ لکھنا نا ممکن سا کردیا ہے ' سیاسی تاریخ کے بارے میں آج باوجود بہت سی تحقیق کے یہ شکایت درست معلوم ہوتی ہے - تاریخ تمدن کے متعلق بھی یہ شکایت صحیح ہے کہ تاریخ کے نہونے سے سلسلہ ارتقا معقول طور پر قائم نہیں ہوتا - لیکن اس کے بعد جو دقت پیش آتی ہے وہ مواد کی کمی سے نہیں بلکہ اس کی افراط اور بہتات سے پیدا ہوتی ہے -

ادب

سنسکرت اور پالی زبان کا ادب اس قدر وسیع ہے کہ برسوں کی لگاتار محنت کے بعد ان پر کچھہ دسترس ممکن ہے - وید ' برہمن ' آرینک اور اپنشد ہی برسوں کے لئے کافی ہیں - ان کے بعد بہت سے شروت سوتر ' گرہ سوتر اور دھرم سوتر آتے ہیں جن کے لفظ لفظ میں تاریخ تمدن کا مسالا گویا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے - دو بڑی رزمیہ منظومات راماین اور خصوصاً مہا بھارت بحر بے پایاں کے مانند معلوم ہوتی ہیں - اس زمانے کے بعد بدھوں کا ادب شروع ہوتا ہے جسکے پانچ " پالی نکاے " اور دوسری کتابیں ہزاروں صفحات میں ہیں - دوسری صدی عیسوی

کے قریب سنسکرت ادب کے چشمے پھر نکلنے لگتے ھیں - ایک طرف تو منو ' وشنو ' یاگ ولک ' نارد ' برھسپت ' پراشر وغیرہ کے دھرم شاستر ھیں جن کا سلسلہ اتھارویں صدی عیسوی تک جاری رھا - دوسری طرف وہ تصنیفات ھیں جو کسی قدر تغیر کے ساتھ آتھویں صدی کے قریب اتھارہ پرانوں کی صورت میں نمایاں ھوئیں - تیسرے دھرم شاستر ' (مذھبیات) کام شاستر ' (زوجیات) نیت شاستر (سیاسیات) وغیرہ ھیں جو دھرم سے قریبی تعلق رکھتے ھیں - چوتھے بھاس ' کالیداس ' بھارو ' بھو بھوتی ' بان بھٹ ' ماگھ ' دنڈی ' شوبندہ ' شمندر ' گوڑاتھہ سوم دیو وغیرہ کی غیر مذھبی نظمیں ھیں جن میں ہر ہر دور کے تمدن کی تصویر کھنچی ھوئی ھے - پانچویں بودھوں کا سنسکرت ادب ھے جسکی بہت سی کتابوں کا پتہ حال میں نیپال ' چین اور تبت میں لگا ھے - چھٹے سنسکرت اور پالی زبانوں میں جینیوں کا ادب ھے جو برھمن اور بودہ کے ادب سے کسی طرح کم نہیں ھے اور جو زیادہ تر انہیں مواد اور مسالے پر مشتمل ھے - ساتویں برھمن ' بدہ اور جین مصنفوں کی قواعد (صرف و نحو) لغات ' ریاضی ' نجوم اور دیگر فنون پر کتابیں ھیں جو اپنے موضوع کے علاوہ کبھی کبھی سیاست و تمدن پر بھی اشارے کرتی ھے - آتھویں ان سب اقسام ادبیات کے شروح و حواشی ھیں جو تقریباً ساتویں صدی سے لیکر آجتک لکھے گئے ھیں - نویں اقصاے جنوب میں تامل زبان کا ادب ھے جسکی ابتدا سنہ قبل مسیح تک پہنچتی ھے - اس سے زائد کار آمد کتابوں کا ذکر آگے کیا جائیگا اور حتی الوسع انکی تاریخ بتانے کی کوشش کی جائیگی - یہاں صرف اس بات پر زور دینا ضروری ھے کہ ویدوں سے لے کر بارھویں صدی تک کا ادب ھمارے قدیم تہذیب و تمدن کی تاریخ کا اصلی اساس ھے -

لیکن خوش قسمتی سے کچھہ اور مسالا بھی ہے جو ادب کی کمی

تانبے کے پتر اور پتھر کے کتبے

کو بالکل تو نہیں لیکن بہت کچھہ پورا کردیتا ہے - تیسری صدی قبل مسیح میں بودہ راجہ اشوک نے بہت سے مضامین رعایا کے فائدے کے لئے پتھروں پر کھدوائے جو آجتک اسی طرح موجود ہیں اور جن کا مطلب پرنسیپ ' فلیٹ ' هلٹز اور بھانڈرکر ایسے عالموں نے صاف کردیا ہے - دوسری صدی قبل مسیح میں اُتکل کے جین راجہ کھار ویل کا ھاتھی‌گمفا تحریر ہے - پہلی صدی عیسوی کے بعد آندھر ' چھترپ وغیرہ راجاؤں کے ' چوتھی صدی کے بعد گپت مہاراج دھراجوں کے ' اور اس کے بعد بارھویں صدی تک ملک کے عموماً تمام راجاؤں کے خاندان کے کتبے پتھر اور تانبے کے پتروں پر کثرت سے ملتے ہیں - بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ' رائل ایشیاٹک سوسائٹی ' اور اس کی بمبئی کی شاخ ' اور بہار اور اوڑیسہ ریسرچ سوسائٹی کے رسالوں میں ' کا پس انسکریپشنم انڈیکرم ' انڈین ایلنٹی کویری اور اپیی گرافیا انڈکا میں ایسے هزاروں مضامین بیسوں اهل علم نے مرتب کرکے اپنی شرحوں کے ساتھہ شایع کرائے ہیں - دکن کے کتبے جو تعداد میں اور زیادہ ہیں اور جو سترویں صدی تک ملتے ہیں ایپی گریفیا کرناٹکا ' ساؤتھہ انڈین انسکرپشنس اور مدراس ' ایپی گریفسٹس رپورٹ میں بھی شائع ہوئے ہیں - ان کتبوں سے سیکڑوں راجاؤں اور مہاراج دھراجوں کی تاریخ اور ان کے کارنامے معلوم ہوتے ہیں ' اور ان کے زمانۂ حکومت کا نقشہ کھنچ جاتا ہے - اور کبھی کبھی سماج ' معاشیاتی حالت اور ادبیات کا بھی پتہ لگ جاتا ہے -

یہی بات سکے اور مہروں سے بھی ثابت ہوتی ہے جو سنہ قبل مسیح کی ابتدا سے پنجاب ، سندھ اور مالوہ وغیرہ میں ملتے ہیں ، کبھی کبھی تو یہ سکے مذہبی اور تمدنی مسئلے کو معجزہ کی طرح حل کر دیتے ہیں -

سکے اور مہر

تمدنی اور مذہبی تاریخ کے لئے پرانی مورتیاں اور مکانات کے کھنڈر بھی بہت کارآمد ہیں نقش شلا ، سارناتھ پاٹلی پتر وغیرہ کو کھود کر جو برتن ، مورتیں اور مکانات نکالے گئے ہیں ، الورہ ، اجنتا اور کارلی وغیرہ میں جو گپھائیں اور چیت (بدھ خانقاہیں) ہیں ، سانچی وغیرہ میں جو لاٹ ہیں وہ قدیم فن تعمیر کے اچھے نمونے ہیں - ہندو تمدن کے اس حصے کو سمجھنے کے لئے لنکا ، ورما ، سیام ، کوچین ، چانڈا ، جاوا ، سماترا اور والی کے اُن مندروں اور مورتیوں پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے جن کے اصول اور قاعدے ہندوستان سے لئے گئے تھے اور جو اصل میں ہندو تمدن کے اجزا ہیں -

مکان اور مورت

قدیم ہندوستان کے بارے میں کچھ غیر ملکی سیاحوں اور مصنفوں نے بھی اپنی دیکھی یا سنی ہوئی باتیں لکھی ہیں ان کے بیانات میں بہت سی ضروری باتوں کا تذکرہ ہے جن کو ہندوستانیوں نے معمولی سمجھکر کہیں نہیں لکھا - سنہ ۵ - ۶ ق - م میں دریائے سندھ کا مغربی حصہ ایران کی وسیع سلطنت میں مل گیا تھا - ہیروتس وغیرہ یونانی مورخین نے جن کے ملک کا تعلق ایران سے تھا ہندستانیوں کے بارے میں بھی دو چار باتیں لکھی ہیں - سنہ ۳۲۷ ق - م میں مسیدونیہ کے بادشاہ سکندر اعظم کے ساتھ کچھ یونانی مورخ بھی آئے تھے جن کے تاریخوں اور بیانات کے حصے مابعد کی تاریخوں میں ملتے ہیں - دس پندرہ برس کے بعد سیلوکس نکتر کے سفیر

غیر ملکی تحریریں

میگھستنیز نے اپنا دیکھا اور سنا ہوا بہت سا حال لکھا - اس کی اصل تحریر تو ضائع ہو گئی لیکن اس کی بہت سی باتیں اور تاریخوں میں ادھر اُدھر پائی جاتی ہیں اسی طرح کچھہ دوسري یونانی اور لاطینی کتابوں میں ہندوستان کے بارے میں سنہ عیسوی کے آگے پیچھے کي کچھہ باتیں لکھی ہوئی ہیں - قدیم مغربی ادب کے ان بکھرے ہوئے بیانات کو سنہ ۱۸۴۶ ع میں جرمن عالم ای ' اے شوانوک نے یکجا کر کے شرئع کیا تھا - ان کا انگریزي ترجمہ جے ' ڈبلو میکریڈل نے کیا ہے - ان تحریروں کا استعمال کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ زبان اور رسم و رواج سے ناواقف ہونے کے باعث غیر ملکی سیاح کبھي کبھی دھوکا کھا جاتے ہیں - دوسرے ہمارے پاس جو باتیں پہنچ سکی ہیں ان میں شاید بیچ کے لکھنے والوں نے جو ہندوستان سے بالکل اجنبی تھے کچھہ نمک مرچ لگا دیا ہے -

چینی	پانچویں اور ساتویں عیسوي صدي کے حالات کے لئے چینی سیاح بڑے کام کے ہیں جو بدھ بھگوان کي زندگی سے تعلق رکھنے والے مقامات کا درشن کرنے 'بودھ شاستر پڑھنے

اور جمع کرنے آئے تھے فاہیان (پانچویں صدی) کا ترجمہ جائیلس نے اور لیج نے بھی انگریزي میں کیا ہے - اور ٹامس وارٹس نے " چائنا ریویو " کے آٹھویں حصے میں شرح کی ہے - ہیوں سانگ یا یوان چانگ (ساتویں صدي) کا ترجمہ سیموئیل ویل نے اور تھوڑا سا وارٹس نے کیا ہے - ائسنگ (ساتویں صدي) کا ترجمہ جاپانی تکاکشو نے کیا ہے -

عرب	مغربی ایشیا سے ہندوستان کا تجارتی تعلق سنہ ۸ - ۹ ق . م سے چلا آتا تھا ' اس کے بعد بہت سے ہندو راجاؤں نے مغربي حکمرانوں سے میل ملاپ کے تعلقات بھی پیدا

کئے - آٹھویں صدی کے مسلمانوں سے سیاسی تعلق شروع ہوا - آٹھویں

صدی میں سندھ پر محمد بن قاسم کی عرب فوج نے حملہ کرکے فتح پائی - عربوں میں تاریخ نویسی کا فن بہت ترقی پا چکا تھا - سلیمان ' ابوزیدالحسن ابن خرددا ' المسعودی ' الادریسی وغیرہ عربوں نے نویں اور دسویں صدی میں ہندوستان کا کچھ حال لکھا - تیرھویں صدی میں چچ نامہ یعنی تاریخ ہند و سندھ لکھی گئی جس میں آٹھویں صدی کی لکھی ہوئی بہت سی باتیں شامل کرلی گئیں - گیارھویں صدی میں پنجاب اور سندھ پر حملہ کرکے محمود غزنوی نے ہندوستان کا دروازہ شمال مغرب والوں کے لئے پھر کھول دیا - اس کے دربار کا ایک عالم البیرونی ہندوستان آکر سنسکرت کا پورا پنڈت ہوگیا - اس نے ہندو دھرم ' ادب اور ' سائنس وغیرہ کا ایسا نقشہ کھینچا جیسا پہلے کسی کے خیال میں بھی نہ آیا تھا - اس کے بعد اور مسلمان مورخوں کی تحریروں میں بھی ہندو تہذیب کا کچھ ذکر آگیا ہے - یونانی ' لاطینی' چینی اور عربی کتابوں کا بہت سا ترجمہ انگریزی کے ذریعہ ہندی میں بھی ہوچکا ہے -

اس تمام مسالے کی بنیاد پر تاریخ لکھنے سے پہلے عرصہ گاہ تمدن پر

جغرافیہ کا اثر

ایک نظر ڈالنا ضروری ہے براعظم ایشیا کے جنوب میں ہندوستان تقریباً ۱۸ سو میل لمبا اور ۱۸ سو میل چوڑا ملک ہے جس کا رقبہ (برھما کو چھوڑ کر) تقریباً پندرہ لاکھ مربع میل ہے - لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شمال کے جانب نیپال ' افغانستان اور وسط ایشیا کا کچھ حصہ اور جنوب میں لنکا یہ سب ہندو تہذیب کے دائرے میں شامل تھے - دوسرے فارس ' بلوچستان ' سندھ اور راجپوتانہ کا ریگستان پہلے اتنا بڑا نہ تھا جتنا کہ آج ہے - آریل اسٹاین وغیرہ نے زمین کھود کر ریت کے نیچے سے جو شہر اور مکانات بر آمد کئے ہیں وہ ثابت کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں ہندوستان کے باہر مغربی ریگستان کی جگہ پر

هوئے بھرے کھیت اور گھنی آبادی تھی - ان سب دلیلوں کو جمع کرنے سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ نویں صدی ق - م سے نویں صدی عیسوی تک قدرتی اسباب کے وجہہ سے زمین آهسته آهسته خشک هوتی گئی' پانی کم هوتا گیا اور ریت کے تھور نکلنے لگے - جب تک ریگستان نه تھا یا تھوڑا هی تھا اس وقت هندوستان اور مغربی ملکوں میں تجارت اور آمدورفت برابر جاری تھی - اس لئے ان ملکوں کی تہذیبوں نے ایک دوسرے پر بہت اثر ڈالا -

آب و هوا کا تغیر

آب و هوا کے بارے میں بھی یہ کہدینا ضروری ہے (جیسا ایلزورتھ هنٹنگٹن نے " تہذیب اور آب هوا " اور " ایشیا کی نبض " وغیرہ کتابوں میں اور دوسرے مصنفین نے دنیا بھر کی نئی پرانی معلومات جمع کرکے ثابت کیا ہے) کہ بہت سے مقاموں کی آب و هوا تبدیل هوگئی ہے - پرانے هندوستان کے بارے میں قطعی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا - لیکن سرسوتی وغیرہ ندیوں کے وجود سے ' ریگستان کی کمی سے ' جنگلوں کی بہتات سے اور اس اعتبار سے کہ سرد ملک سے آئے هوئے آریوں نے اپنے ویدک لٹریچر میں گرمی کی شکایت نہیں کی ہے یہ ضرور اندازہ هوتا ہے کہ شمالی هندوستان کی آب و هوا تین چار هزار سال پہلے آج کل کی طرح گرم نہ تھی - شاید یہ بھی ایک وجہ هو کہ رگ وید کے زمانے کی سی پر مسرت زندگی کبھی نصیب نہیں هوئی - چھ هزار برس پہلے کے ثبوت تو اب اچھی طرح پیش کئے جا سکتے هیں - هڑپا اور موهنجودڑو میں گینڈے اور هاتھی کے نشانات تو ملتے هیں مگر شیر ببر کا کوئی نشان نہیں ملتا - اس سے صاف ظاهر ہے کہ اسوقت سندھ اور مغربی پنجاب میں نمی اور تر یالی زیادہ تھی - یہ بھی ثابت هو چکا ہے کہ سندھ میں اسی وقت سندھ ندی کے علاوہ ایک اور ندی بہتی تھی -

ہندوستان کے شمال میں کوہ ہمالیہ ہے جو دنیا کے تمام سلسلۂ ہائے

ہمالیہ پہاڑ

کوہ میں سب سے بڑا پہاڑ ہے ' جسکی ایک ہی گھاٹی میں چورا آلپس سما سکتا ہے اور پندرہ سو میل تک پھیلا ہوا ہے - اگر ہمالیہ نہ ہوتا تو تبت کی تیز سرد ہوائیں شمالی ہندوستان میں آدمیوں کا رہنا ہی مشکل کر دیتیں اور زمین کو زرخیز بنانے والی ندیاں کہیں بھی نہ ہوتیں ' یہی دیکھ کر ایک زمانے میں ہندوؤں نے ہمالیہ کو دیوتا مانا تھا - جنوب مشرق اور جنوب مغرب سے آنے والی موسمی ہوائیں ہمالیہ سے رک کر ٹھنڈی ہو جاتی ہیں اور شمالی حصوں میں موسلا دھار پانی برساتی ہیں - تاریخ پر ہمالیہ پہاڑ کا ایک بڑا اثر یہ بھی ہوا ہے کہ تبت اور ترکستان سے یا یوں کہنا چاہئے کہ منگولیا کے حصے سے ہندوستان کا تعلق کم رہا ہے - شمال کے درے اتنے چھوٹے ' تھنڈے اور ڈراونے ہیں کہ اُن میں سے ہوکر گذرنا بہت مشکل ہے -

شمال مشرق کا سلسلۂ کوہ

شمال مشرق کی طرف یہ سلسلۂ کوہ نیچا ہو گیا ہے اور اسلئے اس طرف سے کچھ آمد و رفت بھی ہوتی رہی ہے - اِدھر سے کچھ منگولیا کے لوگ آکر آسام یا شاید مشرقی بنگال میں بھی آباد ہوئے تھے لیکن اسطرف کا ملک جنگلوں اور جنگلی لوگوں سے ایسا گھرا ہوا ہے کہ اس طرف سے تجارتی اور ذہنی تعلق بہت نہیں ہو سکا - چین اور ہندوستان سے جو تعلق تھا وہ زیادہ تر سمندر کی راہ یا وسط ایشیا کی طرف سے تھا -

شمالی مغربی گھاٹیاں

بر خلاف اس کے ہمالیہ پہاڑ کے شمالی مغربی نیچی گھاٹیوں کے دروں نے ہندوستان کی پوری تاریخ پر اپنی مہر لگادی - اس طرف کئی درے ہیں جن میں سے ہوکر آریہ لوگ ہندوستان آئے تھے اور انکے بعد ایرانی ' یونانی ' کوشن '

سٹھین ' ہونڈ ' افغان اور ترک آئے جنھوں نے ہندوستان کی تہذیب وسیاست پر انقلابی اثرات ڈالے - ان ریاستوں سے گیارھویں صدی تک وسط ایشیا ' مشرقی ایشیا اور یورپ سے تجارت بھی بہت ہوتی رہی اور ادب ' فن اور فلسفہ کے خیالات کا بھی باہمی تبادلہ ہوتا رہا -

شمالی میدان

شمالی میدان جس میں سندھ ' گنگا ' برھمپتر اور معاون ندیاں بہتی ہیں دنیاں کے بڑے زر خیز اور آباد حصۂ ملک میں شمار کیا جاتا ہے - کلکتے سے پیشاور تک چلے جائیے کہیں نہ کوئی پہاڑی ٹیلا ملے گا اور نہ کوئی ریگستان - ہر جگہ ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہیں ' کھیتی کے لئے اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی جتنی فرانس ' انگلستان ' جرمنی وغیرہ ایسے ٹھنڈے اور کچھ کچھ پہاڑی ملکوں میں کرنی پڑتی ہے - یہاں ہمیشہ سے زراعت ہی ایک خاص پیشہ ہے اور ساری تہذیب پر زراعت کی عظمت کی مہر لگی ہوئی ہے - لوگ زیادہ تر گاؤں میں رہتے ہیں ' گاؤں ہی زندگی کا مرکز ' سیاسی نظام کی بنیاد اور اقتصادی زندگی کی اصل ہے - اس میدان میں کوئی قدرتی روک نہ ہونے کے باعث ' تہذیب و مذہب کا نظام یکساں رہا ہے - چھوٹی چھوٹی باتوں میں تھوڑا بہت فرق ضرور تھا لیکن اصول کا کوئی اختلاف نہ تھا - جہاں تہذیب و عادات میں اتنی یکسانیت ہو وہاں سیاسی اتحاد کی کوشش بھی ضرور ہی ہوگی - برھمن گرنتھوں کے وقت ہی میں یعنی سنہ عیسوی سے تقریباً ایک ہزار برس قبل سمندر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلنے والی سلطنت کا تصور پیدا ہوگیا تھا ' موریہ خاندان ' کھارویل ' آ ایندر ' گپت ' وردھن اور گُرجر پرتہار خاندانوں نے اس تخیل کو عملی جامہ بھی پہنا دیا ' لیکن ریل ' تار '

اور السلکی وغیرہ کے پہلے دنیا بھر کی بڑي سلطنتوں کے دور دراز مقامات کا انتظام و حکومت بہت مشکل کام تھا - اس لئے کبھی تو بہت بڑي مملکت بن جاتی تھی اور کبھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے - اٹھارویں صدي تک ہندوستان کی سیاسي تاریخ اسی چکر میں مبتلا رہی - بڑی بڑي سلطنتوں کے زمانے میں بھی سفر کی موجودہ سہولتیں نہ ہونے کے باعث صوبوں کو بہت کچھ آزادی دینا پڑتی تھی ' ایسا سیاسی نظام جغرافی وجوہ کي بنا پر ناگزیر تھا - قدیم یونان سے مقابلہ کیجئے تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ یہاں اتھینس اور کارنتھ ایسے شہر بن ہی نہیں سکتے تھے ' نہ ویسي شہری مملکت بن سکتی تھی اور نہ ویسی سرگرم سیاسی زندگی پیدا ہو سکتی تھی - سندھ اور گنگا کا دوآبہ میدان اتنا بڑا ہے اور اس کے معمولی حصے بھی اتنے بڑے ہیں کہ یہاں جمہوری سلطنت کے لئے سلطنت کے تمام لوگوں کا جمع ہونا یا نمائندوں کا بھی اچھی طرح ملنا جلنا مشکل تھا - یہی وجہ ہے کہ کئی معاملوں میں جمہوري سلطنت کا اصول تسلیم کرنے کے باوجود یہاں مرکزي حکومت میں جمہوریت کا رنگ پیدا کرنا مشکل تھا -

ندیاں

شمالی ہندوستان کے ساری زندگي پر ندیوں کا زیادہ اثر پڑنا ضروری تھا - پہاڑی دریاؤں کی مٹی کنارے کے میدانوں کو بہت زیادہ زرخیز بنا دیتی ہے - اس لئے ان صوبوں کی آبادي سب سے زیادہ تھی ' دریائی راستوں کے وجہ سے تجارت بھی ترقی پر تھی اور اُن کي شان بھی بہت زیادہ تھی - شہر بھی زیادہ تر ندیوں کے کنارے آباد تھے اور تہذیب کے مرکز تھے - کوئی تعجب نہیں کہ متعدد پرانے شہروں کی طرح یہاں بھی گنگا ' جمنا ' گوداوری اور کاویري ایسی بڑی ندیاں پاک اور مقدس مانی گئی ہیں -

شمالی میدان کے جنوبی کنارے پر ستپرا اور وندھیاچل کے سلسلے میں جو کہیں بھی بہت اونچے نہیں ہیں اور ادھر اُدھر خصوصاً مشرق میں اتنے نیچے ہوگئے ہیں کہ آنے جانے میں کوئی روک نہیں ہوتی - اس طرح کے پہاڑوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال اور جنوب میں ایک بین فرق ہوگیا ' ذاتوں کا فرق ' زبانیں مختلف رہیں ' سیاسی تاریخ بھی اپنے اپنے علحدہ راستوں پر چلتی رہی ' لیکن تہذیب کی اصل ایک رہی - مذہب کے وہی اصول دونوں طرف رائج رہے ' سنسکرت اور پالی زبان کی تعلیم بھی ویسی ہی رہی ' زندگی پر ایک ہی طرح کی نظر رہی ' دونوں حصوں کے آپس میں تجارتی تعلقات بھی رہے - اور چوتھی صدی قبل مسیح کے بعد کئی بار دونوں میں گہرے سیاسی تعلقات بھی پیدا ہوگئے - شمال اور جنوب کی تہذیب کے اصل اصول ایک ہی تھے لیکن ان کے سلسلہ ہائے تاریخی کبھی کبھی علیحدہ رہے - ایک بڑا فرق اُن میں یہ تھا کہ شمال مغرب سے آنے والی قومیں یا تو دکن تک پہونچتی ہی نہ تھیں یا تھوڑی تعداد میں پہونچتی تھیں - نربدا اور کرشنا ندی کے بیچ کا حصۂ ملک اتنا ہموار اور زر خیز نہیں ہے جتنا شمالی میدان - نہ اُس کی آبادی اتنی گھنی تھی ' اور نہ خشکی کی تجارت اُس درجے کی تھی - لیکن مغربی اور مشرقی کنارے پر سمندر کے ذریعہ دور دور کے ملکوں سے تجارتی تعلقات کی سہولت تھی - سمندر کے راستے سے ہندو تہذیب اور ملکوں میں جاسکتی تھی اور غیر ملکی خیالات یہاں آسکتے تھے -

دکن

کرشنا ندی کے نیچے جو حصہ ہے اور جسے انتہائے جنوب کہہ سکتے ہیں وہ پورب میں تو اکثر مقامات پر ہموار ہے لیکن مغرب میں پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے آنے جانے کی کوئی

انتہائے جنوب

قدرتی روک نہ ہونے کے باعث یہ بھی تہذیب کے اصل اصول کے اعتبار سے دکن اور شمال کے مانند ہوگیا ہے لیکن دور ہونے کی وجہ سے اس پر شمال کا اثر کم رہا ہے - شمال کی قومیں تھوڑی تعداد میں یہاں آئیں اس لئے یہاں کی تہذیب بعض حصوں میں شمال سے مختلف رہی ' کچھ اجتماعی ادارے سب سے نرالے ہی رہے ' زبان پر سنسکرت کا اثر بہت کم ہوا - مندر ' مورت اور مکانات وغیرہ بنانے کے طریقے بھی مختلف رہے - سیاسی نظام میں بھی گاؤں کا انتظام وغیرہ بھی ایک ہی طرز کا رہا - اقصائے جنوب کی تاریخ بقیہ ہندوستان کا جزو ہونے کے باوجود اپنی ایک خصوصیت رکھتی ہے جس کا لحاظ تمدن کی تنقید اور تجزئے میں رکھنا ضروری ہے -

لنکا

اقصائے جنوب سے کسی قدر دور سنگلدیپ یا جزیرۂ لنکا واقع ہے جس کی سیاسی تاریخ ہندوستان سے زیادہ الگ رہی ہے لیکن جس کی تہذیب یعنی مذہب ' زبان ' تخیلات و عادات ' فن اور علوم پر ہندوستان کا اور خصوصاً اقصائے جنوب کا اثر ہمیشہ سے بہت رہا ہے - لنکا کے بارے میں بہت کہنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہندوستانی تہذیب کی تاریخ میں اس کو بالکل چھوڑ دینا بھی ناممکن ہے -

پہاڑی قومیں

ہندوستان کے شمال میں شمال مغرب ' شمال مشرق ' وسط ہند اور مغرب میں تمام کوکن اور ملابار کے کنارے پر جو کوہستانی سلسلے ہیں انہوں نے تہذیب پر ایک اور اثر ڈالا ہے - ہموار میدانوں کو فتح کرنے والی قوموں سے شکست پاکر پرانے باشندے پہاڑیوں میں پناہ لے سکتے تھے وادیوں اور جنگلوں کی آڑ میں وہ اپنی ہستی ' اپنی زبان اور رسم و رواج کی حفاظت کرسکتے تھے - باہر کا تھوڑا بہت اثر پڑنے کے باوجود یہ قومیں اپنے پرانے ہی راستوں

پر چلتی رهیں ، آج بھی اُن میں طرح طرح کے بھاؤ ، رواج ، بھاگ ، مذھبی معتقدات اور جماعتی ادارے قائم هیں - عام هندوستانی تہذیب کے اثر سے یہ الگ رهی هیں - اس کتاب میں ، اُن کا ذکر بہت کم آئیگا ، لیکن اُن سے تھوڑی سی واقفیت ضروری ہے -

آب و هوا

آدمی کی سیرت پر صنعت و حرفت کا اثر بہت پڑتا ہے ، صنعت و حرفت آب و هوا کے مطابق هوتی هیں - یہ تو صاف ہے لیکن پچھلے سو برسوں میں اهل علم نے یہ پتہ لگانے کی بھی کوشش کی ہے کہ خود آب و هوا کا اثر سیرت پر کیسا پڑتا ہے - اس مشکل مسئلے پر یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن دو چار قیاسات ممکن هیں - همارے ملک کا دار و مدار کھیتی پر ہے ، کھیتی موسم پر منحصر ہے بارش کا هونا اپنے اختیار کی بات نہیں ہے - بلکہ خدا کی مرضی پر ہے - اسارہ کے میدانے سے پہاڑوں تک تمام لوگ آسمان پر ٹکٹکی لگائے رهتے هیں اور بارش کے لئے دعائیں مانگتے هیں - اور اگر پانی نہ گرے تو اپنی مجبوری پر هاتھ ملتے هی رہ جاتے هیں ، اگر کبھی زیادہ بارش هوجائے یا پالا پڑ جائے تو بھی مجبور هوکر کھیتوں کی تباهی دیکھنی پڑتی ہے - لوگ سوچتے هیں کہ آدمی کی طاقت کچھ نہیں ہے ، خدا هی قادر مطلق ہے - شاید یہی وجہ ہے کہ هندوستان میں لوگ قسمت کو بہت مانتے هیں ، دیوی دیوتاؤں کی پوجا بہت کرتے هیں - دوسری طرف دن میں سورج کی چمک ، رات کی روشن چاندنی اور ستاروں کی دیوالی ، یہ سب چیزیں توجہ کو اوپر لیجاتی هیں اور دیوتاؤں کا خیال کراتی هیں - انگلستان کی طرح هندوستان میں زیادہ کہرا نہیں پڑتا - خوب اوجالا رهتا ہے - اس کا اثر طبیعت پر یہ پڑسکتا ہے کہ کھلے هوئے خیالات اور منطق کو تقویت

ہو ' کچھ ہو مگر منطق کی محبت ہندوستانی تہذیب میں ضرور دکھائی دیتی ہے ' دھرم اور ادب کے خیالات کا بھی کچھ تعلق شاید جغرافیہ سے ہے - ہمالیہ کی اونچی چوٹیاں ' ہزاروں میل لمبے میدان ' جھوم جھوم کر بہنے والی لمبی چوڑی ندیاں ' موسلا دھار مینھ اور طوفان ' آسماں پر نظام شمسی کا اجتماع ' یہ سب قدرتی مناظر خیالات میں جولانی پیدا کرتے ہیں -

ہندوستان کی وحدت

وسیع ہونے کے باوجود ہندوستان کی وحدت نقشے اور تاریخ پر صاف لکھی ہوئی ہے ' جیسا کہ جغرافیے کے زبردست عالم چیزوم نے کہا ہے ' دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو ہمسایہ ممالک سے اتنا مختلف ہو جتنا کہ ہندوستان ہے - بہت پرانے زمانے میں جب آمد و رفت بہت مشکل تھی ہندوستانیوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہمارا ملک اور ہمارے عادات و رسوم ' باہر والوں سے جدا ہیں ' رامائین اور مہابھارت کے زمانے میں " کشمیر اور کنیا کماری تک کے اور سندھ سے برھموپتر تک کے حصہ ملک کو " بھارت ورش " کے نام سے پکارا جاتا تھا - آپس میں کتنا ہی فرق ہو لیکن دوسروں کے مقابلے میں سب " بھارت باشی " ایک ہی طرح کے معلوم ہوتے تھے - تہذیب کے بہت سے حصوں میں اس وحدت ویکرنگی کا اثر پایا جاتا تھا - گنگا جمنا ' سرسوتی ' سندھ ' نربدا ' گوداوری اور کاویری جو مقدس ندیاں مانی گئی ہیں ' وہ ملک کے تمام حصوں سے لیگئی ہیں ' آٹھویں صدی میں شنکراچارج نے بدری ناتھ کدار ناتھ ' رامیشور ' دوارکا اور جگناتھ یہ چار خاص تیرتھ کے مقامات ملک کے ایک ایک گوشے سے منتخب کئے تھے - دوسرے تیرتھ کے مقامات مثلاً ہردوار ' پریاگ ' بنارس ' گیا ' اوجین اور کانچی بھی ملک

بھر میں پھیلے ہوئے ہیں - برہم پران وغیرہ میں جو مقدس مقام سردوور وغیرہ گنائے گئے ہیں وہ بھی ملک کے تمام حصوں سے لئے گئے ہیں ' جیسے کہ تیرتھ کے مقامات ' سمید شکھر ' پاواپوری ' شرونتیسبیل گوں ' آبو پہاڑ وغیرہ بھی تمام ملک میں بکھرے ہوئے ہیں ' پرانے زمانے میں ادب ' سائنس ' اور مذہب کی زبانیں سنسکرت اور پالی سارے ملک میں بوجھی جاتی تھیں - تکشلا ' نالندہ بکرم شلا وغیرہ ودیا پیٹھوں میں ملک کے گوشے گوشے سے طالب علم آتے تھے ' اپنی شہرت قائم کرنے کے لئے اہل علم سارے ملک میں گھوم کر ''وگ وجے'' کیا کرتے تھے ' جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ' اقتصادی اور سیاسی تعلقات ملک کے تمام صوبوں کو ایک دوسرے سے متحد کر دیتا تھا -

ملک کی پرانی تہذیب کا کچھ حال اس کتاب میں لکھا جائیگا'

تہذیب سے پہلے

لیکن تہذیب سے پہلے کی بحث اس کے دائرہ سے باہر ہے ' اتنا کہدینا کافی ہو گا کہ کسی تہذیب کی تخلیق یکا یک نہیں ہوتی ' آدمی کی زندگی کے پرانے آثار جو دنیا کے قریب قریب تمام حصوں میں گپھاؤں سے ' زمین کے اور ندیوں کے نیچے سے نکلے ہیں اور جن کو ایک ساتھ پڑھکر عالموں نے سب سے پرانی زندگی کی جو تصویر کھینچی ہے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں جیسے تیسے کچے گوشت اور جنگلی کند مول پر بسر کرتا تھا اور پتھر یا ہڈی کے بھدے اوزار بنا کر شکار کرتا تھا ' بہت زمانہ گذر جانے پر اوزاروں کی شکل اور طاقت سدھر گئی ' اور پرانا پتھر کا زمانہ بدل کر نیا پتھر کا زمانہ ہو گیا ' اسکے بعد آہستہ آہستہ اور ترقی ہوئی اور کانسے کے ہتھیار بنے لگے جس سے یہ زمانہ کانسے کا زمانہ کہلاتا ہے - ان زمانوں کا ثبوت ہزاروں برس سے ملا ہوا ہے' اس زمانے میں جانوروں کے پالنے کی رسم بھی

جاری ہو گئی تھی ' اسکے بعد کھیتی شروع ہوئی اور پھر صنعت و حرفت کا زمانہ آیا ' آپس کی زندگی میں بھی تبدیلیاں ہوئیں ' شادی بیاہ کے طریقے قائم ہوئے ' خاندانوں کی بنیادیں پڑیں ' ہر ایک جماعت ایک مکھیا یا بڑا سردار ماننے لگی ' غیر شایستہ و نیم شایستہ زندگی کی یہ ہزاروں برس کی کہانی بہت دلچسپ ہے اور ان صفحوں سے غیر متعلق ہونے کے با وجود یاد رکھنے کے قابل ہے - ہندوستان کے یہ پرانے باشندے کس خاندان سے تھے ؟ - اس سوال کا جواب دینا ناممکن ہے ' پرانی کھوپڑیوں اور ہڈیوں پر بہت غور کیا گیا لیکن نہ تو اُن کا زمانہ ہی ٹھیک ٹھیک متعین ہوسکا اور نہ یہ پتہ لگ سکا ہے کہ اُن آدمیوں کا تعلق دوسری قوموں سے کیا تھا ' ممکن ہے کہ جس وقت آدمی کی پیدائش ہوئی اُس وقت ہندوستان یا تو اسٹریلیا سے جڑا ہوا تھا یا افریقہ سے یا دونوں سے ' اور ان صوبوں میں اور دیگر بے نشان حصوں میں کوئی ایک ہی قوم رہتی تھی ' لیکن اس کے بعد بڑھتے ہوے سمندر کے ذرایع مسدود ہو جانے سے ادھر اُدھر کے لوگ ایک دوسرے سے علحدہ ہو گئے اور اپنے اپنے ڈھنگ پر نئی نئی جماعتیں قائم کرنے لگے ' لیکن ہزاروں برس سے کہیں کہیں زمین خشک ہو جانے سے یا آبادی بڑھ جانے سے یا دوسروں کی دولت پر قبضہ کرنے کی خواہش سے یہ مختلف جماعتیں ایک دوسرے کو ڈھکیلتی رہیں ' ادھر سے اُدھر جاتی رہیں ' کبھی ایک دوسرے کو تباہ کرتی رہیں ' کبھی ایک دوسرے سے ملتی رہیں ' کبھی ایک دوسرے کو غلام بنا کر دباتی رہیں ' یہ انقلابات اتنے بار ہوئے ہیں اور کبھی کبھی اتنے بڑے پیمانے پر ہوے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم اپنے مقام پر قائم نہیں رہ سکی اور نہ کوئی قوم دوسری قوم کی آمیزش سے بچ سکی ہے ' تاریخ میں بلا آمیزش کوئی قوم کہیں نہیں ملتی ۔

ہندوستان میں جہاں بہت سی قوموں کی نشو و نما ہوئی ہے

ہندوستان میں

اُن مقامات کو دیکھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قوموں کی مخالطت باہمی یہاں تاریخ سے پہلے ہو چکی ہے ' وسط ہند کی دور دور کی گھاٹیوں اور جنگلوں میں ایک ہی طرح کی جماعت آباد ہے ' جن کی زبان ملتی جلتی ہے اور رسم و رواج یکساں نہیں ' معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی پرانے زمانے میں میدانوں میں رہتے تھے لیکن کسی طاقتور قوم کے حملوں سے تنگ آکر انہیں پہاڑیوں کی پناہ لینی پڑی ' یہ طاقتور قوم کون تھی ؟ - آریہ ' یا ڈریوڑ یا اور کوئی یہ بڑا مشکل سوال ہے جس کا جواب یقین کے ساتھ نہیں دیا جاسکتا - بلوچستان کے ایک حصے میں " براھوی " زبان بولی جاتی ہے جو اقصاے جنوب کے ڈریوڑ زبان سے ملتی جلتی ہے اور جو گرد و پیش کی کسی زبان سے تعلق نہیں رکھتی ' اس کا مطلب (۱) یا تو یہ ہے کہ ڈراوڑ لوگ شمال مغرب سے آئے تھے اور بلوچستان میں اپنا ایک جتھا چھوڑ کر یا کسی گروہ پر اپنا نقش قائم کرکے فوراً ہی یا کچھ دن بعد کسی وجہ سے دکھن چلے گئے (۲) یا کسی زمانہ میں یہ ڈراوڑ لوگ سارے ہندوستان کے قدیمی باشندے تھے ' اس کے بعد آریوں نے ان کو شمال سے نکال دیا یا اپنے میں ملا لیا ' لیکن کسی وجہ سے ایک ٹکڑا شمال مغرب میں رہ گیا ' ان دونوں خیالات میں سے ایک کا بھی ثبوت نہیں دیا جاسکتا ' لیکن یہاں اتنا اور کہدینا ضروری ہے کہ ڈراوڑ لفظ کا استعمال صرف سہولیت کے لیے کیا جاتا ہے - ورنہ واقعی ڈراوڑ کوئی قوم نہیں ہے ' دکن میں کئی قومیں ہیں اور ہر قوم ایک دوسرے میں خلط ملط ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہمیں شمال میں رہنے والی قدیم قوموں کا پتہ بھی لگ جائے تو اُس سے تاریخی زمانے کے باشندوں کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں ہوسکتی '

پچھم سے آئی ہوئی قوموں کے آباد ہونے سے ایک نئی قوم پیدا ہو گئی ۔

آریوں کے آنے سے پہلے شمال میں کون کون سی قومیں تھیں ؟ اسکی تفصیل ویدک لٹریچر کی بنیاد پر آیندہ باب میں کی جائیگی ' یہاں اس بات پر زور دینا ضروری ہے

ہڑپا اور موہنجوداڑو

کہ آریوں کے آنے سے پہلے ملک میں تہذیب کافی طور پر پھیل گئی تھی ' پچھلے سات برسوں میں آرکیالاجیکل ڈیپارٹمنٹ (محکمۂ آثار قدیمہ) کے جان مارشل ' راکھال داس بنرجی ' دیا رام سنہی ' وغیرہ نے سندھ اور مغربی پنجاب میں ہڑپا اور موہنجوداڑو کے مقامات کو کھود کر بہت سے برتن ' مکان مندر ' تالاب ' غسل خانے اور شہر نکالے ہیں جو اعلیٰ درجہ کی تہذیب کا ثبوت دیتے ہیں - یہ تہذیب کم سے کم چھہ سات ہزار برس پرانی ہے ' اور سندھ ' پنجاب اور راجپوتانہ میں اور شاید اِدھر اُدھر کے اور حصوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی ' مصر اور بابل کی تہذیب سے موازنہ کرتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اُس پرانے زمانے میں بھی ہندوستان میں ان کے مقابلے میں آسائش زندگی کا زیادہ سامان تھا - ایک مثال لیجئے :- موہنجوداڑو شہر میں صفائی کا جیسا انتظام تھا ' گندگی بہانے کے لئے جیسی اچھی نالیاں تھیں ویسی جنوبی میسوپوٹامیا کے مشہور شہر اُر میں بھی نہ تھیں -

ہڑپا میں ایک سو پچاس سے زیادہ مٹی کی مہریں ملی ہیں ' جن پر طرح طرح کی تصویریں بنی ہوئی ہیں ' ان تصویروں اور باقی چیزوں کے مطالعہ سے چھہ سات ہزار برس پہلے کی زندگی کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں ' اس زمانے میں سندھ اور مغربی پنجاب میں آج کل کی بہ نسبت پانی کہیں زیادہ برستا تھا ' سندھ

ندی کے پورب میں ایک اور ندی بہتی تھی جو اب موجود نہیں ھے' آبپاشی کا انتظام بہت اچھا تھا - کھیتی خوب ہوتی تھی - موہنجوداڑو میں جو

خوراک

گیہوں کے دانے ملے ھیں وہ آج کل کے پنجابی گیہوں کے ھیں ' کھانے پینے میں روٹی کے علاوہ دودھ کا بھی بہت استعمال ہوتا تھا ' نیم سوختہ ہڈیاں جو مکانوں میں ملی ھیں ' اُن سے معلوم ہوتا ھے کہ اُن دنوں مچھلی ' کچھوا ' گھڑیال ' بکری ' سور اور گائے کے گوشت کھانے کا بھی رواج تھا ' بہت سے مکانوں میں چرخے کے گھیرے (پنڈلیاں) بھی ملے ھیں ' جن سے معلوم ہوتا ھے کہ گھر گھر چرخا چلا کرتا تھا -

بہت باریک بنے ہوئے روئی کے کپڑوں سے اندازہ ہوتا ھے کہ کپڑا

کپڑا

بننے کا ہنر بہت ترقی پر تھا ' مرد ' اکثر ایک دھوتی پہنتے تھے اور ایک دوشالہ ہوتا تھا جو بائیں کندھے کے اوپر سے ہوکر داھنے کندھے کے نیچے آجاتا تھا ' لیکن داھنے ھاتھ کو کھلا چھوڑ دیتا تھا ' مردوں میں بعض بعض لوگ مونچھیں منڈاتے تھے اور بعض نہیں - زیادہ تر لوگ چھوٹی سی ڈاڑھی رکھتے تھے ' بالوں کو ماتھے سے اوپر لیجاکر پیچھے ایک بڑی سی چوٹی بناتے تھے - بدقسمتی سے عورت کی ایک بڑی مورت ملی ھے ' اس کے بال بندھے ہوئے نہیں ھیں بلکہ کھلے ہوئے ھیں ' لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ عام رواج تھا یا نہیں -

اُس زمانے میں زیور پہننے کا بہت رواج تھا ' مرد اور عورت

زیور

دونوں ہنسلی اور چھاپ (ایک زیور) پہنتے تھے - عورتیں ' کان میں بالی ' ھاتھ میں چوڑی ' کمر پر کردھنی اور پاؤں میں سانکھ وغیرہ بھی پہنتی تھیں - امیر آدمیوں کے

زیور سونے ' چاندي اور طرح طرح کے جواهرات کے هوتے تھے ' هاتھی دانت کا بھی استعمال هوتا تھا - زیور بنانے کے هنر میں اُس زمانے کے لوگ آج کل کے سناروں اور جوهریوں سے کسی طرح کم نہ تھے ' سونے کے بعض بعض زیور اس صفائی سے بنے هیں کہ تعجب هوتا ھے - غریب آدمی سیپ اور کوڑی وغیرہ کے زیوروں سے تسکین حاصل کرلیتے تھے ' یہ کپڑے بہت کم پہنتے تھے ' غریب عورتیں صرف کمر پر ایک دھوتی باندہ لیتی تھیں ' ایک طوائف کي چھوٹی سی مورت ملی ھے جو بالکل برهنہ ھے -

گاڑي	سواری کے لئے امیروں کے پاس گاڑیاں تھیں ' جن میں دو پہئے هوتے تھے ' اوپر چھت هوتی تھی اور هانکنے والا آگے بیٹھتا تھا - هڑپا میں اسي گاڑي کا جو نمونہ کانسے کا

بنا هوا ملا ھے ' وہ مصر یا میسوپوٹامیا سے بہت پرانا ھے ' اور دنیا میں گاڑی کا سب سے پرانا ڈھانچا ھے -

مکان	رهنے کے مکانات اور سرکاری دفاتر کبھی بہت بڑے بنائے جاتے تھے ' ایک مکان ملا ھے ' جو اُتر سے دکھن ۱۹۸ فٹ اور پورب سے پچھم ۱۳۶ فٹ ھے ' جس میں دونوں

طرف بہت سے مربع کمرے اور دالان هیں اور بیچ میں ایک بڑا کمرہ چلا گیا ھے ' یہ جزیرۂ کریت کے مائنوس تہذیب کے زمانے کے پرانے محلات سے ملتا جلتا ھے ' ممکن ھے کہ کریت کی طرح یہاں بھی لگان کی شکل کی چیزیں وصول کرکے جمع کیجاتی هوں ' افسوس ھے ' کے بہت سے مکانات اس بری حالت میں هیں کہ اُن سے کچھہ نتیجہ نہیں نکلتا ' لیکن دو باتیں صاف معلوم هوتی هیں ' ایک تو یہ کہ نہانے کے لئے غسلخانے بہت شاندار بنائے جاتے تھیں ' اُن کی بعض بعض

دیواریں دس دس فت موتی هیں ' دهوپ یا آگ سے بنائی هوئی اینٹیں بڑی خوبصورتی سے لگائی گئی هیں ' فرش بهی اینٹوں کے هیں اور بہت خوبصورت هیں ' دوسرے یہ کہ تالاب بہت تھے ' اور شاید اُن میں سے کچھہ مقدس مانے جاتے تھے - مہروں سے معلوم هوتا هے کہ چیتے ' وغیرہ کا شکار بہت کھیلا جاتا تھا -

هتیار وغیرہ

لوهے کی کوئی چیز نہیں ملی هے ' بهالے ' کٹار ' گنڈاسے ' هنسلے ' چاقو وغیرہ وغیرہ تانبے کے بنتے تھے ' تین اور سیسے کی بهي بہت سی چیزیں بنتی تهیں ' اکثر اوزاروں کے لئے کانس کا بهی استعمال کیا جاتا تها ' تانبا شاید بلوچستان ' موجودہ راجپوتانہ اور شمالی افغانستان سے آتا تها ' تین شاید ' کهراوں سے یا اور زیادہ پچھم سے آتا تها ' یہ بهي ظاهر هے کہ تجارت دور دور سے هوتی تهی اور صنعت و حرفت بهی ترقي پر تهي ' مہروں سے پتہ چلتا هے کہ ملک کی حفاظت کے لئے سپاهی هوتے تهے ' جو دهات کی بنی هوئی مضبوط ٹوپیاں پہنتے تهے ' ابتک کوئی ایسی چیز نہیں ملی جسکی بنیاد پر سیاسي و تمدني نظام کے بارے میں کچھہ لکها جا سکے '

سومیریاں تہذیب

هڑپا اور مہنجوداڑو کی تہذیب میسوپوٹامیہ کے سومیرین تہذیب سے بہت ملتی جلتی هے لیکن اسکا کوئی ثبوت نہیں هے کہ ایک نے دوسرے کی نقل کی ' گمان هوتا هے کہ بیچ میں ریگستان نہ هونے سے هندوستان اور مغربی ایشیا میں باهم بہت آمد و رفت تهی اور اسلئے بہت سی باتوں میں یکرنگي هو گئی تهی ' هندوستان سے لیکر میڈیٹرینین سی تک شاید ایک هی عظیم‌الشان تہذیب تهی جسکی مختلف ملکوں میں مختلف شکلیں تهیں ' لیکن وہ بہت سی باتوں میں ملتی جلتی تهیں '

بہر صورت کچھ ہو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کے پرانے زمانے میں ہندوستان مغربی ملکوں سے بالکل الگ نہ تھا بلکہ غیر ممالک سے بہت تعلق رکھتا تھا ، دوسری یہ بات بھی خیال رکھنی چاہئے کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب آریوں کی تہذیب سے بھی پرانی تھی اور جہاں تک ممکن تھا اس نے آریہ تہذیب پر بہت اثر ڈالا ، موہنجوداڑو میں پوجے کے بہت سے لنگ ملے ہیں ، ویدک ادبیات میں ششن دیوتاؤں کی برائی کیگئی ہے ، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ آریوں میں پہلے لنگ کی پوجا نہیں ہوتی تھی ، لیکن ویدک زمانے کے بعد انہوں نے غیر آریوں سے شیو لنگ کی پوجا اختیار کی ، ہڑپا اور موہنجداڑو کے متعلق ابھی تک تحقیقات جاری ہے ، ممکن ہے کہ آگے چل کر آریوں کے غیر آریوں سے اور بہت سی باتوں کے لینے کے بھی ثبوت ملیں -

میرے کتاب خانے کے پرانے چھپے ہوئے اردو دیوان

(از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی)

(۲)

دیوان ذوق دہلوی

میر محمد حسین آزاد دہلوی نے آبحیات میں استاد ذوق کے حالات میں لکھا ہے کہ حافظ غلام رسول ویران نے بعض دردخواہ دوستوں کی مدد سے کلام ذوق جو کچھہ فراہم ہو سکا اوسکو سمیٹ کر ۱۲۷۹ میں ایک مجموعہ چھاپکر نکالا جس میں اکثر غزلیں تمام' اکثر ناتمام، بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں -" خلاصتاً -

پچھلے دنوں اس دیوان کا ایک نسخہ دلی میں کباڑی کے یہاں سے مجھکو ملا - اوسکا دیباچہ سید امراؤ مرزا انور کا لکھا ہوا ہے - فارسي زبان میں ہے - جسکا انداز میرزا غالب کے فارسی سے ملتا ہوا ہے - اس دیباچہ میں جو کیفیت فراہمي کلام کی لکھی ہے وہ آبحیات کے بیان سے زیادہ مفصل ہے -

لکھتے ہیں - کہ استاد ذوق کو اپنی زندگی میں اپنے کلام کے فراہم کرنے کی مہلت نہ ملی - جو " انبار در انبار " بستوں میں بندھا ہوا اور گھڑوں اور مٹکوں میں بھرا ہوا تھا - بہت کچھہ بیاض میں تھا اور کچھہ حافظے میں - " شایقین و طالبین " کو یہ تمنا رہی وہی کہ استاد کی زندگي میں کلام مرتب ہو جاتا بالآخر سنہ ۱۲۷۱ ھ پیام اجل آگیا - شاید اسی کی پیشین گوئی تھي -

ذوق کہیں کر ہو اپنا دیوان جمع   کہ نہیں خاطر پریشان جمع

اسکے بعد نہ اونکے صاحبزادے کو نہ کسی شاگرد کو حالات زمانہ
نے اتنی فرصت دی کہ " مسودات متفرقہ " کی فراھمی کی کوشش کر کے
دیوان کو جمع و مرتب کرتے - اسی دوران میں وہ ھنگامہ پیش آگیا
(یعنے ھنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء مطابق سنہ ۱۲۷۳ھ) جسنے شہرازہ جمعیت
درھم برھم کر دیا - اسی فتنہ و آشوب میں استاد کے صاحبزادے ھلاک
ھو گئے - نہیں کہہ سکتے کہ وہ " انبار در انبار کاغذ " کیا ھوئے - اور
نوستی کی کس آگ نے اوس مرقع سخن کے اوراق کو خاک سیاہ کر دیا -
دو تین سال کے بعد دلی کے اُجڑے خانمان برباد بمقتضاے حب وطن
اس " گلستان سراپا خارستان " میں پھر واپس آئے - کسی کو مال و متاع
کی بربادی کا ماتم تھا - کوئی مکانوں کے ڈھھنے اقربا کے مرنے کا
نوحہ خواں تھا - کوئی کتابوں اور دوسری اشیاء نادر کے تلف ھونے پر
کف افسوس ملتا تھا - اھل ادب کے دل پر استاد ذوق کے کلام کے غارت
ھونے کا داغ تھا - بالآخر اس خود فراموش (امراؤ مرزا انور) اور اس کے بھائی
(ظہیر دھلوی) اور حافظ غلام رسول ویران نے (جو سب کے سب اس
شہریار سخن کے حاشیہ نشین و شاگرد ھیں) باھم معاھدہ کیا کہ
تا امکان کمر ھمت باندہ کر برادران معلوی کی تلاش و تجسس میں
کوشش کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں - اسی کوشش و کاوش
کے اثنا میں محمد حسین خانصاحب مہتمم مطبع مصطفائی دھلی
متخلص بہ تحسین اور عمدۃالتجار میاں محمد ابراھیم (جو حافظ
ویران کے شاگرد ھیں) نے ھم سے فراھمی کلام کی تاکید شدید شروع کی -
الغرض جس قدر اشعار تذکروں ، شاگردوں اور حاضران خدمت استاد سے
ھاتھ آئے اور جس قدر ھم کو خود یاد تھے سب کو جمع کرکے ترتیب

شروع کی - سب سے زیادہ آفرین ہے حافظ غلام رسول ویران کو جو ارشد تلامذہ ہیں جنہوں نے باوجود ظاہری بینائی سے معذوری کے اکثر علوم حاصل کئے ہیں - اور بیس سال تک "ہمہ وقت و ہمہ ساعت" حاضر خدمت استاد رہ کر سرمایہ سعادت حاصل کیا ہے - استاد کا سارا کلام خود ان کی زبان سے سن چکے ہیں - کثرت سے اشعار - غزلیات نایاب - قصاید اور قطعات و رباعیات وغیرہ جو ان کو یاد تھے لکھوا دئے - اس کے علاوہ خود استاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو کلام ان کے پاس تھا اور جس کو حرز جان بنا کر رکھا تھا دیدیا - اگرچہ دل گوارا نہ کرتا تھا کہ اس کلام میں سے جو اگر جمع ہوتا تو ایک شترہار ہوتا اس قدر قلیل کلام شائع کیا جائے مگر بمقتضائے و "مالایدرک کلہ لایترک کلہ" و مشتے از خروار اوراندک از بسیار قصاید و غزلیات و مخمسات و مسدسات تمام و ناتمام اور رباعیات و قطعات و متفرقات جس قدر ہاتھ آیا جمع کر لیا گیا - اس کے بعد میرے بھائی سید ظہیر الدین ظہیر تخلص نے (جو سید جلال الدین حیدرالمخاطب بہ صلاح‌الدولہ مرصع رقم خان خط نسخ میں استاد حضرت ظل‌اللهی کے فرزند ہیں) اور اس نقش باطل سید امراؤ مرزا انور نے حافظ صاحب موصوف کی مدد سے سنہ ۱۲۷۹ھ میں اس مجموعے کو الحاقی کلام سے پاک و صاف کرکے کمال تصحیح و تنقیح کے ساتھ مرتب کیا - کاپی اس کی اس خامہ سیاہ نے لکھی حالانکہ خط نسخ کے سوا جو تمغائے آبائی ہے مجھکو خط نستعلیق میں چندان امتیاز حاصل نہیں - (دیوان کا خط پورا استادانہ ہے شیروانی) حافظ صاحب موصوف ویران اور محمد حسین خان کی فرمایش سے یہ دیباچہ بھی لکھا - شیخ حفیظ‌الله سوداگر شاگرد حافظ ویران نے تصحیح کے بعد صحت نامہ مرتب کیا - سنہ ۱۲۷۹ھ میں مطبع احمدی

(واقع شاہدرہ دہلی) میں طبع ہوا - نقاشی " نقاش ثانی " میاں خدا بخش نقاش نے کی -

بیان بالا سے واضح ہوا ہوگا کہ دیوان ذوق کا پہلا نقش کس اہتمام سے صورت پزیر ہوا - اور ذوق ادب ہر طبقے میں کس طرح ساری تھا - اثنائے دیباچہ میں انور نے ذوق کی قادرالکلامی کے بیان کے سلسلے میں لکھا ہے کہ بارہا دیکھا کہ ایک ہی وقت میں حضور والا کی غزل درست کر رہے ہیں - جو شاگرد حاضر ہیں ان کے کلام کی اصلاح ہو رہی ہے - اور مدح خاقانی میں قصیدہ بھی کہا جارہا ہے - غالباً قادرالکلامی کی یہ نادر مثال ہے -

ترتیب دیوان کے متعلق بیان بالا سے واضح ہوا ہوگا کہ ذوق کے انتقال کے بعد ان کے کسی شاگرد کو یا صاحبزادہ کو ترتیب کلام کا موقع نہ ملا - اسی اثنا میں سنہ ۱۸۵۷ع کا ہنگامہ ہوا - خلیفہ اسمعیل نے سافر ہلاکت نوش کیا - سرمایہ کلام جو فراہم تھا برباد ہوگیا - اور ایسا کہ یہ بھی پتا نہ چلا کہ کیا ہوا - اب اس کے ساتھ تذکرہ آب حیات کا بیان ملاکر پڑھو کچھ اختلاف محسوس ہو تو غور کرو -

آزاد نے لکھا ہے—ان کی (ذوق کی) وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں - متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹلیں تھیں - بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے گویا بڑی احتیاط سے ان میں بھرتے جاتے تھے - ترتیب ان کی پسینے کی جگہ خون بہاتی تھی - کیونکہ بچپن سے لیکر دم وایسیں تک کا کلام انہی میں تھا - بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی' بہترین غزلیں شاگردوں کی

بھی ملی ہوئی تھیں - چنانچہ اول ان کی اپنی غزلیں اور قصاید انتخاب کر لئے - یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا - غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں - اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں لے چلا گیا مگر باطمینان کیا......خلیفہ محمد اسمعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی ان کے فرزند روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے - اس کے بعد لکھا ہے کہ فتحیاب فوج کے سپاہی گھر میں گھس آئے اور نکل جانے کا حکم دیا - آزاد سب سامان چھوڑ کر اور " غزلوں کا چنگ اٹھا بغل میں دبا کر " ۲۲ جانوں کو ساتھ لیکر دلی سے نکل گئے - یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کام کئی مہینے تک باطمینان خلیفہ اسمعیل اور آزاد کی مشترکہ کوشش سے ہوتا رہا اس سے ذوق کے شاگردان رشید حافظ ویران ظہیر اور انور کا ناواقف رہنا کس طرح ممکن ہے - اسی کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آزاد کے پاس کلام ذوق کا وہ سرمایہ تھا جو دوسرے شاگردوں کے رسائی سے باہر رہا اور جس کے ذریعے سے اونھوں نے مطبوعہ دیوان ذوق پر بہت کچھ اضافہ کرکے دیوان ذوق سن ندارد میں شائع کیا -

سنہ ۱۲۷۹ھ والا نسخہ جلی قلم کا بخط نستعلیق خوشخط بلکہ استادانہ لکھا ہوا ہے - کثرت سے منقش ہے - کاغذ باریک ہے - مگر ایسا مضبوط کہ پچھتر برس گزر جانے پر بھی اس کی آب و تاب میں فرق نہیں آیا ہے - شکستگی یا فرسودگی کا کیا ذکر -

مذکورہ بالا نسخے کی رجسٹری بموجب قانون سنہ ۱۸۳۵ع حافظ ویران ، ظہیر اور انور نے کرا دی تھی - طبع دیوان کی بعض تاریخیں ، حافظ ویران " طرفہ کلام ذوق فزا " " میاں " نواب مرزا داغ - " بہاض

سرور " - ٹھہر - ع " یہاں ذوق ہے دریائے معنے " - حفیظ - " بہن باغ و بہار " -

• غزلیات وغیرہ کے خاتمے پر قصاید سے پہلے ایک دیباچہ اردو ہے جو محمد حسین خاں تحسین مہتمم مطبع مصطفائی کا لکھا ہوا ہے - واقعات تقریباً وہی ہیں جو انور نے اپنے دیباچے میں لکھے ہیں - انور کا دیباچہ خاتمہ دیوان پر ختم قصاید کے بعد ہے -

ایک اور پرانا مطبوعہ نسخہ میرے یہاں ہے جو سنہ ۱۲۸۳ھ میں (نسخہ اول کے پانچ برس بعد) غازی‌آباد کے مطبع مخزن‌العلوم سے شائع ہوا - اس کے خاتمے میں لکھا ہے کہ یہ نسخہ مجلس پریس کے مطبوعہ نسخے سے نقل کیا گیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ غازی‌آبادی نسخہ، مجلس پریس کے جس نسخے سے نقل ہوا وہ مطبع احمدی کے سنہ ۱۲۷۹ھ کے نسخے کی نقل تھا -

نسخہ اول میں حسب ذیل کلام ہے -

		اشعار			اشعار
قصاید	۱۴	۸۲۴	رباعیات	۱۰	۲۰
غزل تمام	۱۲۳	۱۳۹۴	سہرا	۱	۱۵
غزل ناتمام	۵۵	۲۵۴	تمت کے بعد لکھا ہے		
فرد	۹	۹	کہ یہ اشعار ختم		
مطلع	۸۹	۸۹	دیوان کے بعد دستیاب		
مقطع	۲	۲	ہوئے — ۱۲		
قطعہ	۸	۳۸	اشعار قصاید وغیرہ		۷۹
					۲۷۳۱

قطعہائے تاریخ انطباع دیوان -

حافظ غلام رسول - ویران -

چوں بسعی شیخ ابراھیم ابن نور بخش
طبع شد دیوان ابراھیم ذوق پاک مرد
خامۂ مشکیں رقم تحریر سال طبع او
نسخۂ گلزار ابراھیم والا جاہ کرد

۱۲۷۹ ھ

ایضاً

مطبوع اے ویران چو شد دیوان ابراھیم ذوق
از معانی رنگیں او گلہائے گونا گوں شگفت
ھر دم بتجبیب فکر سر از بھر سال طبع دل
گلدستہ گلزار ابراھیم و زیبا طرح گفت

۱۲۷۹ ھ

ایضاً

کلام ذوق فراھم ھوا جو اے ویران
تو ذوق اھل مذاق سخن دو چلد ھوا
قلم نے یوں سر قرطاس کی رقم تاریخ
وفور ذوق سے طرفہ کلام ذوق فزا

۱۲۷۹ ھ

میاں نواب مرزا متخلص بہ داغ شاگرد ذوق -

جب کہ استاد کا کلام چھپا

فکر تاریخ میں تھی طبع سلیم
یک بیک داغ مجھکو ہاتف نے
دی ندا ہے یہ نظم ابراہیم
۱۲۷۹ھ

ایضاً

چو دیوان نور علی نور ذوق
مجلی شدہ صورت شمع طور
صفا کاغذش روئے صاف پری
سواد مدادش چو گیسوے حور
خجل میکند مطلع صبح را
بہ نور سفیدی بین السطور
برفتم پئی فکر تاریخ او
ندا داد ہاتف بیاض سرور
۱۲۷۹ھ

سید ظہیرالدین - ظہیر -

ہوا مطبوع جب دیوان استاد
بہار گلشن گل ہائے معنے
ظہیر آئی ندائے غیب مجھ کو
کہ اے دردے کش صہبائے معنے
تامل کیا ہے لکھ دے سال تاریخ
بیان ذوق ہے دریائے معنے
۱۲۷۹ھ

میاں حفیظ اللہ - حفیظ - شاگرد ویران -

وہ چہ زیبا طبع شد دیوان ذوق

کس ندیدست این چنین باغ و بہار

خواستم از دل چو تاریخش حفیظ

بے تامل گفت ہین باغ و بہار

۱۲۷۹ھ

مير محمد حسین آزاد نے جو مجموعہ شائع کیا ہے (افسوس ہے کہ اس پر سنہ درج نہیں) اُس کے اشعار کی تعداد حسب ذیل ہے - اس دیوان کا کاغذ اتنا کمزور ہے کہ ابھی سے ترخنے لگا ہے - چند سال میں معلوم نہیں کہا سے کہا ہو جائے گا -

		اشعار
قصاید	۲۴	۱۴۰۳
غزل تمام	۱۴۱	۲۵۸۶
غزل نا تمام	۳۸	۱۸۷
قطعہ	+	۳۷
رباعیات	۲۸	۵۶
متفرق	+	۲۷
مخمس	۱	$۷\frac{۱}{۲}$
اشعار متفرق غزل ردیفیا		۱۴۷
تاریخ وغیرہ مثنوی (یک)		۱۳۲
		۴۵۸۲

فہرست بالا کے ملاحظہ سے واضح ہوگا کہ آزاد کی کوشش سے کلام ذوق تریباً دگنا شائع ہوگیا اور یہ دنیائے ادب پر بڑا احسان ہے -

(۲)

دیوان آتش

دیوان آتش مطبوعہ کارخانہ علی بخش لکھنؤ جلد اول سنہ ۱۲۶۷ھ - شیخ اشرف علی اشرف کی تاریخ کا مادہ '' مخزن شعر '' (۱۲۶۷) - و جلد دوم ۱۲۶۸ھ - مادہ تاریخ از شیخ اشرف علی' کلام استاذ (۱۲۶۸) - باہتمام کپتان مقبول الدولہ و بہ فرمایش شیخ رجب علی' مرتبۂ ثانیہ - صفحات ۲۹۰ -

آتش کا دیوان اول مرتبہ خود آتش کی حیات میں چھپا تھا کمیاب ہوگیا دوبارہ یہ نسخہ چھپا - اس میں ایسا بھی کلام ہے جو آتش نے طبع دیوان سابق کے بعد کہا تھا - جلد دوم میں وہ کلام اضافہ کیا گیا - خوش خط - مذہب - محفوظ ہے - کاغذ دیسی بے داغ شفاف - دیوان اول کے ۴ صفحے اول میں نہیں - کلام میں صرف غزلیں ہیں - کوئی اور صنف کلام نہیں - غزلوں کے نمبر دئے ہیں - نیز ہر غزل کے اشعار کے - دیوان اول میں ۴۸۲ غزلیں ہیں - دیوان دوم میں ۱۲۹ جملہ ۶۱۱ غزل - آتش کا انتقال سنہ ۱۲۶۳ھ میں ہوا - دوسرے دیوان کے حاشیے میں خواجہ آتش کی وفات کی بھی تاریخیں درج ہیں ایک منشی مظفر علی اسیرکی' دوسری مہر ولد حسن فوق کی' تیسری منشی اشرف علی اشرف کی - تاریخ اشرف :—

دُر بحر معانی خواجہ آتش سوئے ملک عدم آورد رو حیف

زہاتف سال رحلت جست اشرف بگفتا انتخاب لکھنؤ حیف

۱۲۶۳ھ

(۳)

دیوان غالب

دیوان غالب مطبوعہ مطبع نظامی کانپور سنہ ۱۲۷۸ھ—یعنی وفات غالب سے آٹھ برس پہلے کا چھپا ہوا اور خود غالب کا صحیح کیا ہوا - محمد عبدالرحمان خاں مرحوم خاتمہ طبع میں لکھتے ہیں - '' اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسداللہ خاں غالب کا دھلی میں چھپا - لیکن بسبب سہو و نسیاں کے بعض مقام میں تغیر تبدل ہوا - اس لئے جناب.....محمد حسین خاں صاحب دھلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا - میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخے کے شہر ذی‌حجہ سنہ ۱۲۷۸ھ میں مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تامّہ اور درستی کمال سے چھاپا '' -

اس دیوان میں غالب کا فارسی مختصر دیباچہ ھے - تمام و ناتمام ۲۱۷ غزلیں ھیں - غزلوں پر مطبع نے نمبر دئے ھیں - تعداد اشعار غزل ۱۶۶۰ ھے - غزلیات کے بعد چار قصیدے ھیں - قصیدہ اول حضرت علی کی منقبت میں ھے - اس میں تخلص اسد ھے - زبان میں فارسیت غالب ھے - دوسرا قصیدہ بھی منقبت بالا میں ھے - تخلص کا شعر ھے -

جنس بازار معاصی اسداللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

باقی دو قصیدے بہادر شاہ بادشاہ دھلی کی مدح میں ھیں - ان کی زبان خوب صاف ھے - تخلص دونوں میں غالب ھے - قصاید کے بعد ایک مثنوی ''صفت انبہ'' ھے - مثنوی کے بعد قطعات ھیں - تعداد میں

۱۹ - ایک چکلی ڈلی کی مدح میں بعنوان ' در مدح چکنی ڈلی ' ۔ قطعات کے بعد ۱۹ رباعیات ھیں - تاریخ طبع طالب حسین طالب نے کہی ھے - مادہ تاریخ ع تھری تاریخ کہ مرغوب ھے یہ - ۱۲۷۸ھ

(۴)

کلیات میر تقی میر

کلیات میر تقی میر - ٹائپ کا چھپا ھوا - ٹائٹل پیج اور خاتمہ ندارد ھے اس لئے سنہ طبع اور مطبع معلوم نہیں ھوسکا - بہر حال قدیم ھے - ابتداءً چھ قصیدے منقبت اور مدح کے ھیں اس کے بعد تین دیوان غزلیات کے ھیں - دیوان اول کے آخر میں تحریر ھے '' تمام شد دیوان اول میر تقی عفی اللہ عنہ '' - قرینۂ تحریر چاھتا ھے کہ یہ نقل خود میر صاحب کی عبارت کی ھے - ایک خاص بات یہ ھے کہ رسم خط اس کی وھی ھے جو آج پنجاب کا خراج ادب سمجھی جاتی ھے - ' ھے ' کا املا اول سے آخر تک 'ہے ' ھے - یائے معروف گول ھے ' ' ی ' مجہول ' ے ' مثلاً ھووے ' نون غنہ بے نقطہ ھے - نون ظاھر با نقطہ ھائے مخلوط دو چشمی ' آنکھ ' - ھائے سادہ ' کہے ' صحت کا پورا اھتمام معلوم ھوتا ھے - تینوں دیوانوں کے صفحے ۵۳۶ - آخر سے کس قدر کم ھے معلوم نہیں - نولکشوری نسخے کے دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ دیوان سوم کی ($2\frac{1}{2}$) غزل دیوان سوم میں نہیں ھے -

نولکشوری مطبع کے نسخے میں سات دیوان ھیں اور ۲۰ مثنویاں - سنہ ۱۸۷۴ع میں دوبارہ چھپا - اول مرتبہ سنہ ۱۸۶۷ع میں دو مصرعہ چھپا تھا - ایک عجیب لطیفہ ھے - خاتمہ میں لکھا ھے - الحمدللہ کہ کلیات سر آمد شاعران صبح نفس میر تقی ھوس مرحوم......کہا

میر تقی میر کا دوسرا تخلص 'ہوس' تھا - صحیح نفس کاسجع چاھتا ھے کہ ہوس قصداً لکھا ھے نہ سہواً - گلشن ھند میں مرزا علی لطف نے میر کو صاحب چار دیوان لکھا ھے - اس سے معلوم ہوتا ھے کہ سنہ ۱۲۱۵ھ تک چار دیوان ہوئے تھے - باقی اس کے بعد - وفات میر سنہ ۱۲۲۵ھ میں ہوئی - آخری دس برس میں تین دیوان کہہ ڈالے - ہوس تخلص تھا مرزا محمد تقی خاں کا - کاتب مطبع معلوم نہیں کس محویت میں میر محمد تقی کو محمد تقی خاں بنا گئے - مرزا محمد تقی خاں ہوس کا کلیات قلمی میرے یہاں ھے -

(۵)

دیوان وزیر

دیوان وزیر - المسمی بہ نام تاریخی "دفتر فصاحت" مطبوعہ مطبع مصطفائی سنہ ۱۲۷۲ھ باھتمام عبدالواحد خاں خلف محمد مصطفی خاں - سنہ ۱۲۷۱ھ میں مرتب ہوا - شیخ اشرف علی اشرف کے قلم کا لکھا ہوا ھے - خط کی شان اور جلی قلم جلائے چشم ھے - دیوان میں غزلیں ھیں - آخر میں کچھ تاریخیں ھیں کچھ متفرق کلام - مثلاً ترجیع بند - حاشئے پر طبع کی تاریخوں کا ایک دفتر ھے - تاریخ گو کون کون ھیں - مشاھیر میں محمد رضا برق - شیخ امداد علی بحر - کپتان مقبول‌الدولہ قبول - مرزا حاتم علی بیگ مہر - لالہ رام سہائے رونق - میر ضامن علی جلال - آفتاب‌الدولہ قلق - مرزا اصغر علی خاں نسیم دھلوی - احمد حسین صاحب عرف' امیراللہ تسلیم - بہترین تاریخیں نسیم و تسلیم کی ھیں - تاریخ نسیم کا مادۂ تاریخ -

بسال طبع دلم اے نسیم ایما کرد

بگو - کلام وزیرست لایق شاھاں

۱۲۷۲ھ

تسلیم نے خود خواجہ وزیر کے مطلع کے مصرعہ دوم سے تاریخ نکالی ہے - مطلع ہے -

ہوا شاہ دواوین نام بسم اللہ سے دیوان کا
سر دیواں پہ ہے الحمداللہ تاج قرآنکا

تاریخ ہوئی -

شکست پائے خامہ سے صدا تاریخ کی نکلی
سر دیواں پہ ہے الحمداللہ تاج قرآن کا

اللہ اللہ - ایک وہ زمانہ تھا کہ ایک شہر میں اتنے مشاہیر ادب بزم ادب کی رونق تھے- آج دامن زمانہ میں ایک بھی ایسا در شاہوار نہیں -

مقدمہ دیوان سید ہادی علی بیخود شاگرد خواجہ وزیر کا لکھا ہوا ہے - قابل قدر یہ بات ہے کہ محض سخن آرائی نہیں مفید معلومات بھی ہیں - حالات خواجہ وزیر حسب ذیل درج مقدمہ ہیں - نام خواجہ محمد وزیر خلف خواجہ محمد فقیر - سلسلہ نسب حضرت خواجہ بہاوالدین نقش بند سے ملتا ہے - نانا میرزا سیف اللہ بیگ خاں تھے - جو برادر حقیقی تھے امیرالدولہ حیدر بیگ خاں کے - خواجہ صاحب فنون شاعری اخلاق اور فروتنی میں شہرہ آفاق تھے - توکل و استغنا میں طاق - شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد - ایسے کہ ناسخ انہی کو حاصل تلامیذ جانتے تھے - دوبارہ واجد علی شاہ نے یاد کیا عذر علالت کرکے ٹال دیا - استاد کی زندگی میں کلیات ضخیم تلف ہوگیا - افسردہ خاطر ہوکر شعر کہنا چھوڑ دیا - فرمایش و اصرار سے جو کہا جمع نہ کیا - عبدالواحد خاں صاحب مہتمم مطبع مصطفائی نے کچھ کلام جمع کرکے پیش کیا

اور اجازت طبع چاھی - اور بار بار چاھی - یہی فرمایا - "کلام سابق بالکل ناپسند طبیعت ھے ابتدائی مشق کے شعروں سے مجھکو نفرت ھے - اگر مکارہ زمانہ نے مہلت دی اور عوارض لاحقہ سے مہلت ھوئی تو دو مہینے کی توجہ میں جیسا جی چاھتا ھے بہت کچھ موزوں ھوجائیگا" - اجل نے فرصت نہ دی اس کی نوبت نہ آئی - ۲۲ ذی قعدہ سنہ ۱۲۷۰ھ کو انتقال ھوگیا - بعد انتقال عبدالواحد خاں مہتمم مطبع مصطفائی نے ھادی علی بیخود مقدمہ نگار اور محسن علی محسن تخلص کو فراھمی کلام کا اھتمام سپرد کیا - چنانچہ دونوں صاحبوں نے کمر ھمت باندھ کر کلام جمع کیا - دو برس میں یہ مجموعہ تیار ھوگیا - دفتر فصاحت ۱۲۷۱ھ تاریخی نام رکھا -

مقدمہ کے بعد ترتیب دیوان کی تاریخیں ھیں - تاریخ ھائے ترتیب دیوان کے بعد وفات وزیر کی تاریخیں ھیں جن میں مشاھیر مذکور کی تاریخیں بھی شامل ھیں - رام سہاے رونق نے تاریخ کہی ع

"خسرو ایں زمانہ بود وزیر" -

تسلیم -

تسلیم بسالش ھمہ بیدل شدہ افسوس

لطف و کرم و علم و عمل شعر و سخن فکر

(۹)

دیوان ابو ظفر پادشاہ

ابو ظفر بہادر شاہ کے کلام کا ایک مجموعہ مطبوعہ مطبع احمدی مرزا امو جان واقع شاھدرہ دلہائی ضلع میرٹھ ھے - اس میں تین دیوان ھیں - دیوان دوم - سوم - چہارم دیوان اول نہیں - یہ بھی کہار خانے کا

مال ہے - تینوں دواوین کے صفحات کی تعداد ۸۱۱ ہے - چونکہ کلام
متن اور حاشیہ دونوں پر ہے اور حاشیے کے اشعار تقریباً متن کی برابر
ہیں لہذا ۱۶۲۲ صفحے خیال کرنا چاہئیں - اگر دیوان اول کے صفحات
کی تعداد اسی طرح ۴۵۰ تصور کر لیجائے تو مجموعہ کلام دو ہزار صفحہ
تک پہنچتا ہے - تعداد اشعار فی صفحہ (۱۳ سطر کے حساب سے)
۲۶ ہزار ہوگی - بہر حال پیش نظر ناقص مجموعے میں تعداد اشعار کم
و بیش ۲۱۰۸۶ ہے - اس مجموعے میں سے دیوان دوم یکم شوال
سنہ ۱۲۷۸ھ میں چھپا - دوسرا ۱۲ ذی‌قعدہ سنہ ندارد اور تیسرا
۲۴ ذی‌قعدہ سنہ ۱۲۷۸ھ کو طبع ہوا - اول دوم کے سنہ طبع سے یہ قیاس
بیجا نہ ہوگا کہ دیوان دوم بھی سنہ ۱۲۷۸ھ میں چھپا - نسخہ خوشخط
محفوظ ہے - کلام عموماً غزلیات ہیں دیوان اول کے خاتمے میں بعد غزلیات
ایک سلام ہے چھ مخمس - ایک میر کی غزل کا دوسرا ذوق کی غزل کا -
تیسرا ایضاً - چوتھا قدسی کی مشہور نعتیہ فارسی غزل کا - پانچواں
ذوق کی غزل کا - چھٹا سودا کی غزل کا - تیسرے دیوان کے آخر میں
بعد غزلیات ایک مستزاد ہے - ایک سلام - ایک قطعہ عزائے اہل بیت کربلا
میں - ایک بھاکا کی نظم - ایک مخمس ہے خود اپنی غزل کا - اس کے
بعد ایک قطعہ - اس کے بعد تین تضمینیں بزبان پنجابی - چوتھے دیوان
میں بعد غزلیات ایک سلام ہے - دو قطعے - ایک مخمس - دو تضمینیں '
تین رباعیات ہیں - دو غزلیں پنجابی کی ہیں - ان دیوانوں کے طبع
میں علاوہ مرزا امو جان کے محمد حسین خان مہتمم مطبع مصطفائی
دہلی کا اہتمام بھی تھا - اور حسن خان نے تصحیح و مقابلہ کیا - یہ
دیوان بہادر شاہ کی حیات میں طبع ہوئے تھے - دیوان سوم کے خاتمے کی
عبارت ملاحظہ ہو - '' این دیوان فیض بنیان.........رشحہ طبع وقاد
و بیختہ فکر نقاد حضرت ظل سبحانی چراغ شبستان گورگانی نور بصر

صاحب قرانی شہنشاہ دین پناہ محمد ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی خلداللہ ملکہ و سلطنتہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ " - یہ زمانہ وہ ہے کہ بہادر شاہ بحال تباہ رنگون میں جلا وطن تھے - اس پر بھی دلوں میں جو عظمت تھی اس کے شاہد خاتمے کے الفاظ ہیں - بہادر شاہ کا انتقال نومبر سنہ ۱۸۶۲ع مطابق سنہ ۱۲۷۹ھ میں ہوا - منشی نول کشور کے مطبع نے کانپور میں اس دیوان کی اشاعت کے پانچ برس بعد سنہ ۱۲۸۳ھ میں ایک انتخاب چاروں دیوانوں کا شائع کیا جس کے کچھ کم دو سو صفحے اور اندازاً ۲۵۸۸ شعر ہیں -

(۷)

دیوان گویا

دیوان حسام الدولہ فقیر محمد خان تہور جنگ - مطبوعہ " مطبع مفرح القلوب واقع کراچی سندھ " کاغذ پچ رنگا - باھتمام مرزا محمد شفیع سنہ ۱۲۸۱ھ - شروع میں دو صفحہ کا " دیباچہ " بقلم مرزا محمد شفیع ہے - لکھا ہے کہ ۱۸۴۱ع میں گویا کا دیوان لیتھوگرافک پریس واقع دارالسرور کانپور میں باھتمام روق صاحب مہتمم مطبع مذکور چھپا تھا اب نایاب ہے - اھل ذوق اس کے متلاشی تھے- میرے پاس بہت جگہ سے خطوط آئے تو میں نے بڑی تلاش کے بعد ایک نسخہ بہم پہنچایا - یہ نسخہ مرزا محمد علی صاحب سرشتہ دار پوسٹ آفس کراچی کی معرفت منشی محمد ابراھیم صاحب ساکن پونہ صاحب انگریز کے استاد کے پاس سے ملا جو آج کل صدر بازار کراچی میں مقیم ہیں - میں نے پورے اھتمام صحت کے ساتھ چھاپ دیا - تقطیع خرد صفحات ۱۹۲ -

دیوان میں غزلیات ہیں - غزلیات کے بعد ترکیب بند - اس کے

بعد سلام اور مرثیہ - ختم دیوان پر قطعہ ہائے تاریخ طبع دیوان ہیں -
ناسخ کی تاریخ ہے - ع

گفت دل است کتاب دلکش

۱۲۴۱ھ

خواجہ وزیر نے تاریخ کہی - ع

کہ ترتیب دیوان ہمایوں الہی

ایک متوسل گویا کرامت‌اللہ خاں نے خوب تاریخ کہی - لکھا ہے "-
چوں حکم تاریخ سال ترتیب و تقسیم فرمود ملازم و مداح سرکار
کرامت‌اللہ خان ہما ندم گفت ' دیوان فقیر محمد خان گویا -

کراچی میں اس اہتمام سے دیوان گویا کا چھپنا ادب اردو کے
عالم گوری کی صاف شہادت ہے -

* نسخہ دوم دیوان گویا *

دیوان مطبوعہ بالا کے دیباچہ میں جس دیوان کو نایاب لکھا تھا
وہ یہی دیوان ہے - جلی قلم - فی صفحہ دس سطر - بے جدول -
۳۸۳ صفحے - کلام کی تفصیل وہی ہے جو دیوان گویا مذکور بالا میں
ہے - گویا نقل مطابق اصل ہے - " مسٹررادو صاحب طبع خانہ " نے بمقام
کانپور سنہ ۱۲۴۱ھ " ہجری قدسی " مطابق سنہ ۱۸۳۱ " مسیحی "
میں " مطبع اشیاطک لیہتو گرافک کمپنی میں چھاپا بخط منشی
گنیش پرشاد متوطن شاہجہان‌آباد" خط کي شان ایسی ہے جیسی آج کل
ٹائپ کی نستعلیق خط میں ہے -

گویا کا انتقال سنہ ۱۲۶۶ھ مطابق سنہ ۱۸۵۰ع میں ہوا
(قاموس‌المشاہیر) اس طرح یہ دیوان گویا کی وفات سے بیس برس قبل
شائع ہوا تھا -

(۸)

دیوان نسیم

دیوان میرزا محمد اصغر علی خاں نسیم دھلوی - مسمی بدیوان
شگرف، مطبوعہ مطبع مصطفائی سنہ ۱۳۱۲ھ - طبع دوم - طبع اول
سنہ ۱۲۸۵ھ - شروع میں دو صفحے کا اردو دیباچہ شیخ امیراللہ تسلیم
شاگرد نسیم کا نوشتہ ہے - لکھا ہے - کہ سنہ ۱۲۲۴ھ میں مرزا محمد
اصغر علی خاں نسیم دھلوی ابن نواب آقا علی خاں ناچار - شاگرد مومن
دھلوی خطۂ دھلی سے لکھنو میں آئے - غلغلہ کمال بلند ہوا - بہت
سے صغار و کبار و امراء کبار شاگرد ہوئے - معاملہ بلندی کی حقیقت
معلوم ہوئی - زبان کی شستگی اور بلاغت مسلم ہوئی - چستی بندش
میں جائے کلام نہیں - ترتیب دیوان کا کبھی خیال نہ کیا - نہ کلام فراہم
کیا - بہت سا تلف ہوگیا - مثنویاں متعدد تھیں - الف لیلہ کی ایک
جلد باقی رہ گئی تھی - نظر ثانی کی نوبت نہ آئی - چھپ گئی ہے -
چودھویں رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۲ھ میں نسیم کا انتقال ہوگیا - نواب
محمد تقی خان سالار جنگی شاگرد نسیم نے فراہمی کلام کا اهتمام کرکے
دیوان مرتب کیا - مطبع مصطفائی میں اپنے مصارف سے چھپوایا - دیباچہ
کے بعد تاریخ وفات نسیم کے قطعات ہیں - تاریخ گویوں میں اسیر
لکھنوی - قاضی صادق محمد خان اختر - نواب محمد تقی خان افسر
شاگرد نسیم دھلوی - فدا علی عیش - منجھو بیگ عاشق شاگرد نسیم -
کھیراتی لال شگفتہ شاگرد نسیم - شامل ہیں - تلمیر کی تاریخ خوب
ہے ع - نسیم شد بہوا داری ارم سفری - سنہ ۱۲۸۲ھ - دیوان کے شروع میں قصاید
ہیں جو واجد علی شاہ - نواب شرف الدولہ - ظفرالدولہ - نواب امیرالدولہ -
وصی علی خان - نواب حضور محل کی مدح میں ہیں - سب سے زیادہ

شرف الدولہ کی مدح میں - قصاید کے بعد دو رباعیاں - اس کے بعد غزلیات - غزلیات کے بعد مخمس ھیں جو سب کے سب نواب اشرف الدولہ ابراھیم خاں خلیل تخلص کی غزلوں کے ھیں - مخمسات کے بعد قطعات تاریخ ھیں - کل صفحات دیوان ۲۴۱ - بعد خاتمہ طبع کے قطعات طبع اول درج ھیں - منشی اشرف علی اشرف شاگرد نسیم کا مصرع تاریخ ھے - ع

خرد بگفت ریاض کلام پاک نسیم
۱۲۸۵ھ

برق کا مادہ تاریخ ھے - ع

کھا دل نے کھلا باغ نسیم دھلوی اچھا
۱۲۸۵ھ

(۹)

دیوان شیفتہ

دیوان نواب مصطفے خاں شیفتہ - مطبع رضوي دھلی سنہ ۱۲۸۴ھ - آغاز دیوان سے قبل مختصر دیباچہ مہتمم مطبع سید محمد حسن کا لکھا ھوا ھے - لکھا ھے کہ نواب صاحب کا کلام فارسی پہلے طبع ھوچکا اب بہ جستجوئے تمام اردو کلام بہم پہنچا کر چھاپا جاتا ھے - دیباچہ کے بعد غزلیات ھیں غزلیات کے بعد افراد - کوئی اور صنف کلام نہیں - تعداد صفحات خرد ۱۰۸ - خاتمہ میں لکھا ھے - " دیوان شیفتہ کمیاب و نایاب تھا - کلام اردو بھی کلام فارسی کی طرح بہت تھا مگر ھم کو صرف یہی منتخب دیوان ملا جس کو ' قبل از غدر خود مصنف نے ترتیب دیا تھا ' اور یہ بھی بہ مشکل تمام مصنف کے برادر زادہ نواب علی محمد خاں صاحب کی وساطت سے ملا - اور انھیں کی اجازت سے چھپا " - مادّہ تاریخ از راسخ - ع

ہے لاجواب و دلکش دیوان شیفتہ کا

ایضاً

کلام شیفتہ لاریب شیفتگی کی حکایت ہے

۱۲۸۴ھ -

(۱۰)

دیوان ناظم

دیوان نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور - مطبوعہ مطبع حسنی - رام پور سنہ ۱۲۷۶ھ - خوشخط جلی قلم - کاغذ نیلگوں - گلکار - شروع غزلیات سے ہے - باوجود صفحہ کلاں سطر فی صفحہ ۹ - نواب صاحب کی حیات میں چھپا - غزلیات کے بعد خمسہ ' خود اپنی غزل کا ' خمسہ کے بعد سہرے - جن میں ایک نواب حیدر علی خاں بہادر کا ہے - مطلع

ملائک کے رگ جاں کا ہے سہرا مگر حیدر علی خاں کا ہے سہرا

مقطع ہے -

نہ کیوں کر خوش ہو سارا ملک ناظم

میری آسایش جاں کا ہے سہرا

سہروں کے بعد سلام ہیں - سلاموں کے بعد رباعیات - ایک رباعی سن لو - رباعی

پہلا کے تصور کے اثر کو میں نے

مشہور کیا سحر نظر کو میں نے

ظاہر در و بام سے ہے نقش رخ دوست

بت خانہ بنا رکھا ہے گھر کو میں نے

رباعیوں کے بعد ایک قطع تاریخ ہے - ہنگامہ سنہ ۵۷ ع کے بعد جو ملک خیرخواہی میں ملا اوس کے ملنے کی تاریخ "بخشش حکم" ۱۲۷۶ھ

سے نکالی ہے - تعداد صفحات دیوان ۲۴۳ آخر میں طبع دیوان کی تاریخیں ' امیر کی تاریخ ہے - ع

کہ افکار نواب یوسف علی خاں

۱۲۷۸ھ

بحر نے تاریخ کہی - ع

سال طبع دیوان ست گنج جوہر ناظم

۱۲۷۸ھ

(۱۱)

دیوان رند

دیوان سید محمد خان رند لکھنوی - مسمی بہ گلدستۂ عشق - مطبوعہ مطبع مصطفائی - دو دیوان - دیوان اول صفحات ۱۶۸ - متن اور حاشیہ دونوں پر اشعار ہیں - غزلیات ۱۴۸ صفحہ - باقی متفرقات - چند اشعار فارسی کا قطعہ تاریخ - ۹ رباعیات - یک مخمس - یک مسدس موسوم بہ فسانہ محبت - نامہ شرقیہ - آخر میں خاتمہ فارسی نوشتہ رند ہے لکھا ہے کہ "شعر سے لگاؤ فطری تھا - شروع میں مراثی و سلام و رباعیات نظم کرتا تھا - وفا تخلص تھا - بیشتر غزل کہتا تھا - میر مستحسن خلیق سے تلمذ تھا - اس زمانے کے کلام کا مجموعہ بصورت دیوان ضخیم مرتب ہوا - کچھ زمانے کے بعد میر خلیق فرخ آباد چلے گئے - راقم سنہ ۱۲۴۰ھ میں فیض آباد سے لکھنؤ آیا اور آتش کا شاگرد ہوا - تخلص حسب حال وبا یمائے استاد بدل کر رند رکھا - دیوان سابق کہ "مثل یوسف عزیز" تھا اخوان زماں کے سامنے تمام و کمال کنوئیں میں ڈال دیا - آخر ماہ رجب سنہ ۱۲۵۸ھ تک جو کچھ کلام موزوں ہوا مرتب کرکے دیوان کا نام گلدستہ عشق رکھا - انتہی - خلاصتاً " -

یہ دیوان عبداللہ خان مہر کے اہتمام سے حسب درخواست مصطفی خان مالک مطبع کے مطبع مصطفائی میں سنہ ۱۲۶۸ھ میں بمقام کانپور رند کی حیات میں طبع ہوا - منشی اشرف علی اشرف نے تاریخ کہی - ع

بگو اشرف انیس جان کلام شاعر یکتا

۱۲۶۸ھ

لکھتے ہیں کہ الفاظ ہندیہ کے املا کی تصحیح میں بہت جد و کد کی گئی -

دیوان ثانی - غزلیات - متفرقات - اس کے ضمن میں لکھا ہے کہ " ایک روز اتفاقاً ایک مطلع نئی بحر میں موزوں ہوگیا - میں نے اس کو شیخ ناسخ کے پاس بھیجا تو جواب میں لکھا " - " معلوم می شود کہ بحر نو از قوت فکر و طبع رسا پیدا گشتہ ......از دوائر خارج است..... سبحان اللہ " - مطلع یہ ہے -

مدت ہوئی نہیں دیکھا دلدار کو قیامت ہے

تدبیر کچھ نہیں بنتی موت سے ندامت ہے

مستفعلن مفاعیلن مستفعلن مفاعیلن -

متفرقات کے بعد ایک قطعہ مدح امجد علی شاہ بہادر میں ہے -
ایک قصیدہ وزیر الممالک " نواب علی نقی خان بہادر " کی مدح میں -
ایک اپنی غزل کا مخمس " حسب الارشاد امجد علی شاہ بہادر مرحوم "
یہ رند کی مشہور غزل کا مخمس ہے -

کھلی ہے کلیِ قفس میں مری زبان صیاد

میں ماجرائے چمن کیا بیاں کروں صیاد

آج کل اہل ہند کے ترنم آزادی پر کس قدر یہ مطلع صادق ہے -
۱۸ شعر کی غزل ہے - ایک مخمس ''غزل واجد علی شاہ بہادر خلداللہ
ملکہ '' - اس کے بعد رباعیات - رباعی کے بعد قطعات تاریخ - اپنے والد کا
نام رند نے ان کی تاریخ وفات کے عنوان میں یوں لکھا ہے - ''سراج الدولہ
مرزا غیاث الدین محمد خان بہادر نصرت جنگ '' - یہ دیوان ربیع الاول
سنہ ۱۲۶۸ھ میں چھپا اس کے تاریخ کہی ہے -

ہوا طبع دیوان دوم انتخاب—

"عود ہندی" کی ترتیب

(از منشی مہیش پرشاد مولوی فاضل بنارس یونیورسٹی)

مرزا غالب دہلوی کے رقعات و خطوط کے دو اہم مجموعے ہیں ایک عود ہندی دوسرا اردوے معلیٰ - عود ہندی کی ضخامت اگرچہ اردوے معلیٰ سے کم ہے لیکن یہ مجموعہ اردوے معلیٰ سے پہلے شایع ہوا ہے اس لئے پہلے اِسی کے بارے میں کچھ لکھنا مناسب ہے -

عود ہندی دو فصلوں پر مشتمل ہے - پہلی فصل میں مرزا کے لکھے ہوے ۱۳ خط ہیں اور اسی میں ایک دیباچہ چودھری عبدالغفور سرور صاحب کا لکھا ہوا ہے جو قصبہ مارہرہ (ضلع ایٹہ) کے ایک رئیس اور مرزا کے ایک عزیز شاگرد تھے - چودھری صاحب اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں :—

"جب کلام بلاغت نظام رشک صائب فخر طالب جناب اسداللہ خاں صاحب غالب کا دیکھا دل کو بھایا یکتا پایا ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا ہر کتابت کا جواب آیا سبحان اللہ وہ زبان کہاں پاؤں کہ اُن کے خلق کا بیان لب پر لاؤں مجھ سے نا چیز حقیر پر وہ ذرہ نوازی مہر وار فرمائی کہ میری نظر میں میری آبرو بڑھائی کبھی جواب مراسلہ میں تساہل و درنگ اور اصلاح شعر و عبارت میں دریغ اور ننگ نہ فرمایا جو نامہ کہ بنام میرے بہ عبارت اردو تحریر کیا مکتوب سادہ رویوں سے دلرباتر اور ہر سطر اُس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا زیادہ ہے جس آنکھ نے دیکھا وہ بھلا ہے جس کان نے سنا وہ شنوا ہے پس تنہا معلذذ

ہونا اور آپ ہي آپ مزہ اُٹھانا خلاف انصاف جانا دل مائل تمام بشہرت عام ہوا اور ہنوز یہ قصد نا تمام تھا کہ بحسن اتفاق فخر زمان وحید دوران جناب ممتاز علی خاں صاحب متوطن میرٹھ کہ ریعاں شباب میں بہ تہذیب نفس شب بیدار تہجد گزار دل نرم ہنگامۂ محبت گرم اخلاق مجسم شفیق مکرم فطرت ارجمند ہمت بلند خصایل حمیدہ اوصاف پسندیدہ پاک نہاد معتقد باعتماد پاکیزہ روشن اخلاق ملنسار سخن شناس انصاف اساس خوش تقریر عدیم‌المظیر ہیں - رونق افزاے مارہرہ ہوئے اور قدوم تقدس لزوم سے اِس قصبہ کو مشرف کیا اور ایک روز محفل ممدوح میں ذکر ہمہ دانی و شیوا بیانی جناب استاذي و مخدومی درمیان آیا ارشاد کیا کہ کلام مرزا صاحب نسیم جانفزا اور شمیم دلکشا ھے - فارسي کا کیا کہنا اردو بھی یکتا ھے نظم و نثر فارسی تو متحلی بحلیۂ انطباع ہوا لیکن نثر اردو زیور طبع سے عاري رھا اگر وہ خطوط کہ بنام تمہارے آئے اور تم نے سنائے ہیں جمع کرو تو میں اُس کے انطباع کا بیڑہ اُٹھاتا ہوں اِس تقریر سے نسیم تاثیر نے غنچۂ دل کھلایا منشاء خاطر ظہور میں آیا وہ مکتوب کہ بنام میرے آئے تھے ترتیب دئے گویا جواہر بے بہا کان قلمدان سے نکل کر کشتی اوراق میں جمع کئے چونکہ محبت جناب غالب میرے حال پر بہت غالب ھے لہذا نام اس انشاء کا مہر غالب بکسر میم مناسب ھے سال ختم تالیف بھی اِس نام سے مطابق پایا طبیعت اور بڑھی تحریر تاریخ کو دست و قلم بڑھایا

انشا مملو بصد مطالب لکھی یعنی پئے دوستان طالب لکھی
مو سوم کیا جو مہر غالب سے سرور تاریخ بھی اس کی مہر غالب لکھي

کوکب شعر شاعران ہند پر تو التفات غالب سے روشن اور خاک فکر ہندیان آبیاری مکرمت ممدوح سے گلشن ہو جہو - آمین ثم آمین " -

مگر فصل اول سے ظاہر ھے کہ اِس میں صرف مرتب ھی کے نام کے خطوط شامل و داخل نہیں ھیں بلکہ چلد وہ خطوط بھی ھیں جو کہ حضرت صاحب عالم و شاہ عالم کے نام ھیں - وجہ یہ کہ تہنوں حضرات کے باھمی تعلقات بہت زیادہ تھے مثلاً مرتب کے نام کے ایک خط میں مرزا لکھتے ھیں :—

" اب روئے سخن حضرت صاحب عالم کی طرف ھے خدمت خدام مخدوم خادم نواز میں بعد تسلیم معروض ھے تفقد نامہ نامی میں صورت عزو شرف نظر آئی اللہ اللہ تم نے میری نظر میں میری آبرو بڑھائی حضرت کی قدر دانی کی کیا بات ھے آپ کا التفات موجب مباھات ہے - الخ " -

(خط ۲۸ [۱])

ایک اور خط چودھری صاحب کے نام یوں ھے :—

" ایک عبارت لکھتا ھوں چوں کہ لفافہ جناب چودھری عبدالغفور صاحب کے نام کا ھوگا پہلے وہ پڑھیں پھر میرے پیرو مرشد کی نظر سے گزرانیں پھر مرشد زادہ شاہ عالم صاحب کو دکھائیں - برس دن سے فساد خون کے عوارض میں مبتلا ھوں ثبور و اورام میں لد رھا ھوں - الخ "-

(خط ۳۰)

دوسری فصل میں ۱۳۷ خط ۲ تقریظیں اور تین دیباچے مرزا کے لکھے ھوے ھیں - میرٹھ کے رئیس اور مرزا کے دوست حاجی محمد ممتاز

---

[۱] —یہ مطابق شمار نسخہ مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد درج کیا گیا ھے اور آئندہ بھی اس مضمون میں اسی نسخے کے عدد لکھے گئے ھیں لیکن جو اقتباسات نسخہ مطبوعہ رفاہ عام پریس آگرہ کے ھیں اُن میں اُسی نسخے کا نمبر دیا گیا ھے لیکن اور اڈیشنوں میں شمار غلط درج ھیں لہذا ایسے نسخوں میں بعض خط کچھ آگے پیچھے ملیں گے - مضمون نگار-

علی خاں نے عود ہندی کا جو دیباچہ لکھا ہے اُس سے ظاہر ہے کہ مرزا کے خطوط کی تدوین کی نوبت کیونکر آئی تھی اور چودھری عبدالغفور " سرور " اور اُس وقت کے لفٹننٹ گورنر کے میر منشی خواجہ غلام غوث " بے خبر " کو اُنھوں نے اپنا شریک کار بنایا تھا چنانچہ حاجی صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں :—

" مجھے مدت سے اِس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو اُن کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں لوگوں نے فیض اُٹھائے تعویز بازو بنائے مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی یہ دولت ارباب شوق کے ہاتھ نہ آئی حالانکہ نثر اردو اُن کی اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے یہ سلاست بیان شستگی زبان روز مرہ کی صفائی اور اُن کی شوخی کسی کو کب میسر ہے اُسے بھی ترتیب دیجئے ۔ قدر دانوں پر احسان کیجئے میرے عنایت فرما اور مرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا تو اُنھوں نے جتنے خطوط مرزا صاحب کے اُن کے نام آئے تھے سب کو ایک جاکر کے اور اُس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا عرصہ تک سر گرم تلاش رہا جا بجا سے تحریریں مرزا صاحب کی بہم پہنچائیں بڑی محنت اُٹھائی تب تمنا بر آئی اور مجموعہ مرتب ہوا آج پورا اپنا مطلب ہوا - خواجہ غلام غوث خاں صاحب بہادر بے خبر تخلص جو نواب معلی القاب لفٹننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص با اِختصاص ہیں اِس تلاش میں میرے معین اور مدد گار رہے بہت کچھ ذخیرہ اُن کی بدولت بہم پہنچا - اِس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کئے ہوئے خطوط اور اُن کا لکھا ہوا دیباچہ دوسری

فصل میں میرے جمع کئے ہوئے رقعات اور خاتمہ میں چند نثریں میں جو جناب غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں - عود ہندی اِس کتاب کا نام ہے خوشبو اِس کی تمام عالم میں پھیلے - اِسی دعا پر ختم کلام ہے "-

---o---
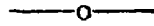
' فغان بے خبر ' میں خواجہ غلام غوث بے خبر کے وہ خطوط ہیں جو اُنھوں نے بعض حضرات کے نام لکھے ہیں اُن میں سے بعض خطوں سے جو مرزا غالب یا بعض اور مکتوب الیہم کے نام ہیں یہ ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب نے عود ہندی کی ترتیب و تدوین میں مولوی ممتاز علی صاحب کا بہت کچھ ہاتھ بٹایا تھا چنانچہ خواجہ صاحب ایک خط[۱] میں مرزا غالب کو لکھتے ہیں :—

" حضرت ' نسخہ عود ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمایش سے مرتب ہو رہا ہے چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور اُن کا دیباچہ آگیا میں نے سوائے اِس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبرآباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں خود سب کو دیکھا جو مضامین لایق اعلان کے نہ تھے اُن کو نکال ڈالا کاتب لکھ رہا ہے میں مقابلہ کرتا ہوں اب تک بڑے ورقوں کے دس جزو مرتب ہوچکے ہیں اور ہو رہے ہیں امید ہے کہ اُدھر اگست کا آغاز ہو اِدھر اِس مجموعہ کا انجام ہو میں اپنے حق سے ادا ہوں چھپوانے کے لئے اُن کے حوالہ کروں اِس وقت بھی مقابلہ میں مصروف ہوں - پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفی خاں

---

[۱]—فغان بے خبر ' صفحہ ۸۲ ' ۸۳ -

صاحب " شیفتہ " منشی حبیب‌اللہ صاحب " ذکا " - میاں داد خاں صاحب " سیاح " اِن حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور ہونگے آپ اِنہیں ایسا کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو بسبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیں رام پور میں تو میں نے خود لکھا ہے شاید وہاں سے بھی کچھ آجائے جب تک کتاب تمام ہو اور جس قدر خطوط ہاتھ آویں اور اُس میں شامل ہوں غنیمت ہے " -

اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں [۱] :—

" قبلہ آپ بیشک ولی صاحب کرامت ہیں کم و بیش ایک ہفتہ گذرا ہوگا کہ ایک امر جدید مقتضی اِسکا ہوا کہ آپ کو اُس کی اطلاع دوں خانۂ کاہلی خراب آج لکھوں کل لکھوں اب کون لکھے کل صبح کو لکھوں گا صبح ہوئی غالب اِس وقت نہ لکھ، سہ پہر کو لکھدو آج دو شنبہ ۲۳ جولائی بارہ پر دو بجے ہرکارہ نے آپ کا خط دیا پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا اور اُسی طرح جواب لکھا اگرچہ ڈاک کا وقت نہ رہا تھا مگر بھجوا دیا کل روانہ ہو رہے گا آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ " ذکا " اور نواب مصطفیٰ خاں " حسرتی " کو کبھی اردو خط نہیں لکھا ہاں " ذکا " کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشاء اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے کہار آیا خط لایا آم پہلچے کچھ بانٹے کچھ کھائے بچوں کو دعا بچوں کی بندگی مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام -............ ....جناب کمسن صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا با وجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا کچھ اُردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا

---

[۱]—عود ہندي ، خط ۱۶۱ سنہ ۱۸۶۶ ع -

اس کا جواب لکھ بھیجا نظم و نثر اُردو طلب کي تھی مجموعۂ نظم بھیجدیا نثر کے باب میں تمھارا نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ھے بعد انطباع و حصول اطلاع وھاں سے منگا کر بھیجدونگا زیادہ حد ادب نامہ جواب طلب'' -

پھر اس کے جواب میں خواجہ صاحب نے مرزا کو لکھا ھے [۱] :—

'' منشی ممتاز علی خاں صاحب کو میں نے کل لکھا کہ آپ ایک عرضي جناب کمسنر صاحب بہادر افسر مدارس کے حضور میں بھیج دیں اور اُس میں یہ لکھیں کہ حضرت غالب نے آپ کو جس مجموعہ نثر کا ذکر لکھا ھے اُسے میں مرتب کرتا ھوں عنقریب چھپنا شروع ھوگا کچھ جلدیں مدرسوں کے لئے آپ بھی خریدیں تو آپ کی اس اعانت سے کتاب جلد چھپ جائے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ صاحب تک ذکر پہنچانے کا میري رائے میں نہ آیا - جا بجا سے جو آپ کے خطوط جمع کئے گئے وہ اصل تو کہیں سے آئے نہیں نقلیں آئیں - سرور کے نام کے ایک خط میں جلال اسیر کا ایک مصرعہ لکھا ھے وہ اِسي قدر پڑھا جاتا ھے -

زفہر در شکر آب است -

بعد اِس کے کیا جانے کیا لفظ لکھا ھے مارھرہ والوں کے خط کا حال تو آپ پر خوب ھویدا ھے - دوسرے لفظ پنشن کو کہیں مذکر لکھا ھے اور کہیں مونث آپ تو اُسے مخنث کیوں بناتے - مگر یہ خرابی بھي کاتب سے ھوئی ھے - ان دونوں کی تصحیح لکھئے تو کتاب میں صحیح لکھ دیا جائے '' -

---

[۱]— غالب بے خبر ' ص ۸۱ و ۸۲ -

ایک اور خط میں خواجہ صاحب لکھتے ھیں [۱] :—

" یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ مرزا محمد خان صاحب سے اپنی اردو نثریں لیکر مجھے بھیجدیجئے اِس کا کچھہ جواب ھی ارشاد نہ ھوا "۔

اِس میں شک نہیں کہ عود ھندی کی ترتیب میں مولانا بے خبر کی کار فرمائی کو بہت کچھہ دخل تھا - وقتاً فوقتاً مرزا کی بھی مدد شامل حال تھی چنانچہ مرزا غالب نواب انورالدولہ " شفق " کو ایک خط [۲] میں لکھتے ھیں :—

" اگر ان سطور کی نقل میرے مخدوم مولوی غلام غوث خاں بہادر میر منشی لفٹننٹ گورنری غرب و شمال کے پاس بھیجدیجئے تو اُن کو خوش اور مجھہ کو ممنون کیجئے گا "۔

ھاں عود ھندی کے معاملے میں مرزا صاحب کی عجلت پسندی بھی قابل ذکر ھے کیوں کہ عود ھندی کا نسخہ جبکہ زیر ترتیب ھے - چھپنے میں دیر ھے اور آپ نے نسخوں کےلیے تقاضے شروع کر دیئے ھیں مثلاً ایک خط [۳] مورخہ ۷ مارچ سنہ ۱۸۶۷ع میں خواجہ صاحب کو لکھتے ھیں :—

" ھاں حضرت! کہئے ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ھو گی وہ مجموعہ اردو چھپا یا چھپاھی رھے گا احباب اُس کے طالب ھیں بلکہ بعض نے طلب کو بسر حد تقاضا پہونچا دیا ھے "

---

[۱]—فغان بے خبر ص ۱۰۰ -

[۲]— عود ھندی ' ۱۰۴ -

[۳]—عود ھندی ' خط ۱۱۱ -

ایک اور خط [۱] میں لکھتے ہیں :—

" اجی حضرت ! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں رقعے جمع کئے اور نہ چھپوائے فی‌الحال پنجاب احاطہ میں اُن کی بڑی خواہش ہے جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ اُن سے کہیں مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا اُن سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں - جی یوں چاہتا ہے کہ اِس خط کا جواب وہی پارسل ہو - مصرعہ - تم سلامت رہو قیامت تک [۲] " - خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ عود ہندی کا دیباچہ مرزا صاحب خود لکھیں چنانچہ ایک بار اِس ضمن میں مرزا نے یہ لکھا [۳] :—

" بندہ پرور اگر ایک بندہ قدیم کہ عمر بھر فرماں پزیر رہا ہو بڑھاپے میں ایک حکم بجانہ لاوے تو مجرم نہیں ہو جاتا - مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوے دیباچے پر موقوف ہے تو اُس مجموعے کا چھپ جانا بالفعل میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں - سعدی علیہ‌الرحمہ فرماتے ہیں - بیت

رسم ایست کہ مالکان تحریر
آزاد کنند بندہ پیر

آپ بھی اُسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں پھر اِس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے - الخ " -

---

[۱]—عود ہندی ، خط ۱۲۴ (جو غالباً جون سنہ ۱۸۹۵ع میں لکھا گیا تھا)

[۲]—یہ خطوط اُردوے معلی میں شامل کئے جانے کے لئے طلب کیئے گئے ہیں -

[۳]—عود ہندی خط ۱۱۵ -

ایک اور خط مرزا نے یوں لکھا ہے :—

''حضرت پیر و مرشد اِس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سےمیری ملاقات ہے اور وہ میرے دوست ہیں - یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ میں صاحب فراش ہوں - اوٹھنا بیٹھنا نا ممکن ہے خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں اِس حال میں دیباچہ کیا لکھوں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ تتمہ کو میں نے خط نہیں لکھا اشعار اُن کے آئے اصلاح دیدی منشاء اصلاح جا بجاحاشیے پر لکھدیا کل جو عنایت نامہ آیا اُس میں بھی دیباچے کا اشارہ اور تتمہ کے خطوط کا حکم مندرج پایا نا چار تحریر سابق کا اعادہ کر کے حکم بجا لایا [۱] الخ '' -

چودھری عبدالغفور '' سرور '' صاحب نے جو دیباچہ پہلی فصل کا لکھا ہے اُس پر مرزا نے اپنی خوشنودی کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے [۲] :—

اہا ہا ! جناب منشی ممتازعلی خاں صاحب مارہرہ پہنچے صاحب یہ تو سیاح گیتی نورد ثانی مخدوم جہانیاں جہاں گرد ہوں - بہرحال آپ نے دیباچہ بہت اچھا لکھا ہے کتاب کو اس سے رونق ہو جائیگی الخ -

آخر کار خدا خدا کر کے عود ہندی کی ترتیب ختم ہوتی ہے اور وہ منشی ممتازعلی صاحب کی خدمت میں بھیجی جاتی ہے چنانچہ مرزا کو خواجہ صاحب ایک خط یوں لکھتے ہیں [۳] :—

---

[۱]—عود ہندی خط ۱۲۷ -

[۲]—مکتوب بنام چودھری عبدا غفور سرور ' عود ہندی ' ص ۳۱ -

[۳]—فغان بے خبر ' ص ۸۳ و ۸۴ -

" جناب عالی - میں نے ایک عریضہ اِس سے پہلے آپ کو بھیجا ہے - اُس میں یہ مطلب جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی صاحب جہانگیر نگری نے جو رسالہ تصنیف کیا ہے اُس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں چھپا ہے آج تک جواب نہ آیا - کیوں کر مجھے حیرت نہ ہو ' جب ترک جواب حضرت کی عادت نہ ہو - جواب عنایت کیجئے مجھے بلاے انتظار سے نجات دیجئے الحمداللہ کہ عود ہندی کی ترتیب تمام ہوئی جلد بندھوا کر آج ہی منشی ممتازعلی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی اب چھپوانے میں دیر کریں یا جلدی اُنہیں اختیار ہے "-

خواجہ صاحب کے اس خط میں مولوی صاحب جہانگیر نگری کے رسالے سے مراد " موید برہان " ہے - جو مرزا کی " قاطع برہان " کے جواب میں سنہ ۱۲۸۲ھ یعنی سنہ ۱۸۶۶ع میں شایع ہوئی ہے - پس اِس اور نیز مذکورۂ بالا تحریر کی بنا پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ " عود " کا نسخہ اگست یا بعد اگست سنہ ۱۸۶۶ع منشی ممتازعلی صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تھا مگر ہاں یہ بھی واضح رہے کہ خواجہ صاحب کا ایک خط جو منشی ممتازعلی صاحب کے نام ہے اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ نے " عود ہندی " کے نسخے کو سیدھے منشی صاحب کے پاس نہیں بھیجا تھا علاوہ بریں اِسی خط کی بدولت " عود ہندی " کے متعلق کچھ اور باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں جیسا کہ خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں [۱] :—

" مرزا نوشہ صاحب کے نثر کا مجموعہ مرتب کر کے آج مصنف صاحب کے حوالہ کیا کہ غازی‌الدین حسین خاں صاحب کے پاس

---

[۱]—فغان بے خبرص ۸۵ -

بھیجدیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں - مصنف آپ سے بہت قریب ھیں ایک نظر اُن کو بھی دکھا لیجئے تب چھپوانا شروع کیجئے تو بہتر ھے فقیر نے اِس کے ترتیب دینے اور لکھوانے اور بذات خود مقابلہ کرنے ھی میں محنت نہیں کی بلکہ اِتنا تردد اور کیا کہ جو رقعات بریلی سے آئے ہوئے آپ نے کھودیے اُن کو وھاں سے مکرر منگوایا اور سوائے اِس کے گورکھپور - لکھنؤ - کانپور سے کچھ بہم پہنچایا اور تین نثریں مصنف سے اور لیں اور اُن سب کو بھی مجموعہ میں داخل کیا اور جہاں کہیں شک ہوا مصنف سے اُس کی تصحیح کر لی اب اگر یہ مجموعہ طاق نسیاں پر رکھا نہ رھے اور جلد چھپے تو مصنف پر احسان ہوگا - فقیر کے پاس تو اصل موجود ھے جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے تو اپنے لئے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوا لے گا اور جو جو نقل کے طالب ہوں گے اُن کو دے دیگا "-

القصہ عود ھندی کا نسخہ منشی صاحب کے پاس پہنچا - بہت کچھ چھپ کر کافی عرصہ تک کھٹائی میں پڑا رھا کیوں کہ خواجہ صاحب ایک خط میں مرزا کو لکھتے ھیں [۱] :—

" اِس سال روھیلکھنڈ کا دورہ ھوتا ھے کل تک لشکر رام پور کے علاقہ میں تھا آج بریلی کی حد میں داخل ھوا - زندگی باقی ھے تو پانچویں فروری کو یہ دورہ ختم ھوگا اور الہ‌آباد پہنچیں گے میں جب الہ‌آباد سے مرادآباد لشکر میں شامل ھونے کو آیا تھا میرٹھ ھو کر آیا وھاں منشی ممتاز علی خاں صاحب کے بھانجے نے آپ کی اردو انشا مجھے دکھائی سب چھپ گئی ایک صفحہ اخیر کا باقی ھے خاں صاحب نے

---

[۱]—فغان بے خبر صفحہ ۱۲۹ -

قطعۂ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کھدے پھیلک رکھا ہے - مرادآباد میں اخبار ' جلوۂ طور ' کا مہتمم بھی وارد تھا وہ کہتا تھا کہ میں نے ویسے ہی نا تمام پچیس جلدیں لیں اور لوگوں کو دیں میں نے خاں صاحب کو لکھا تو ہے کہ قطعۂ تاریخ کا ہونا فرض نہیں - یوں ہی اُس صفحہ کو چھپوا کے کتاب تمام کر دیجئے دیکھئے خدا کرے کہ وہ مان لیں " -

چودھری عبدالغفور " سرور " کے لکھے ہوئے دیباچے کا جو اقتباس پہلے مذکور ہے اُس سے ثابت ہے کہ چودھری صاحب نے اپنے مرتب کئے ہوئے مجموعے کا تاریخی نام ' مہر غالب ' رکھا ہے چنانچہ اسی کو یعنی سنہ ۱۲۷۸ھ (سنہ ۱۸۶۱ع یا سنہ ۱۸۶۲ع) کو بعض حضرات نے تمام عود ہندی کا سال ترتیب یا سال اشاعت سمجھا ہے مگر حقیقت میں " عود ہندی " کی اشاعت سنہ ۱۸۶۸ع میں مرزا کی وفات سے کل چار مہینے پہلے ہوئی ہے کیوں کہ اُس کے اخیر میں تاریخ اشاعت ۲ رجب سنہ ۱۲۸۵ھ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ع درج ہے باقی اِس کی تالیف کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تمام مسودہ سنہ ۱۸۶۶ع میں پایۂ تکمیل کو پہنچکر مالک مطبع کے حوالے کیا -

چونکہ عود ہندی کی پہلی اشاعت کا میسر آنا اب آسان کام نہیں لہذا اُس کے متعلق چند ضروری باتیں ذیل میں دی جاتی ہیں -

۱—تقطیع بڑی ۹½ × ۶ انچ -

۲—کاغذ سفید لکھائی چھپائی معمولی -

۳—حجم ۱۸۸ صفحے -

۴—کتابت میں یاے معروف اور یاے مجہول کا لحاظ نہیں -

۵—چھاپے کی غلطیاں بہت ھیں باوجودیکہ مولانا " بے خبر " نے صحت کا بہت اهتمام کیا تھا -

خواجہ صاحب نے مولوی عبدالقیوم صاحب صدر امین علی‌گڑہ کو اپنے ایک خط میں عود هندی کے اِس مطبوع نسخے کی بابت یہ لکھا ھے :—

" عود هندی یعنی مرزا غالب کے رقعات کا مجموعہ مجھ تک پہنچا افسوس ھے کہ نہایت غلط چھپا بہت جگہ غلطی سے مطلب خبط ھے " -

جب عود هندی چھپ چکی تھی اور اردوے معلیٰ چھپ رھی تھی تو مرزا غالب نے ایک خط خواجہ صاحب کو لکھا تھا جس میں اُنھوں نے " عود هندي " کے نسخے کو مہمل قرار دیکر دوسرے مجموعے کی ضرورت بتلائی تھی چنانچہ اِس خط کے جواب میں خواجہ صاحب عود هندی کی نسبت لکھتے ھیں :—

" پہلا مجموعہ اگر ایسا مہمل چھپا تو دوسرے کا چھپنا بہت مناسب ھوا " خلاصہ یہ کہ باوجود تمام کوششوں کے " عود هندی " مرزا غالب اور خواجہ " بیخبر " دونوں کے نزدیک تسلي بخش اور صحیح نہ چھپی -

پہلے اڈیشن کے بعد مختلف مطابع سے عود هندي کے جو اڈیشن شایع ھوئے ھیں اُن میں سے یہ اڈیشن میري نظر سے گزرے ھیں :—

۱—مطبع نارایني دهلی ۲۳ فروری سنہ ۱۸۷۸ع (۲۰ صفر سنہ ۱۲۹۵ھ) -

۲—مطبع نولکشور کان پور ستمبر ۱۸۷۸ع (رمضان ۱۲۹۵ھ) -

۳—مطبع مفید عام آگرہ مئی سنہ ۱۹۱۰ع -

۴—مطبع نولکشور واقع کان پور سنہ ۱۹۱۳ع (بار چہارم) -

۵—مطبع مسلم یونیورسیٹی علی گڑہ سنہ ۱۹۲۷ع -

۶—نیشنل پریس الہ آباد سنہ ۱۹۲۹ع -

۷—مطبع انوار احمدی ' الہ آباد -

۸—مطبع کریمی لاہور -

۹—گلزار ہند اسٹیم پریس لاہور -

عود ہندی مکمل یا اُس کا کم و بیش حصہ مختلف امتحانات کے نصاب میں داخل ہے اور میرا خیال ہے کہ پہلے اڈیشن کے بعد " عود " کے کل تقریباً ۱۲ ہزار نسخے مختلف مطابع سے شایع ہو چکے ہیں اور پہلے اڈیشن اور دیگر اڈیشنوں میں جو باتیں نمایاں طور پر ملتی ہیں وہ یہ ہیں -

۱—پہلے اڈیشن کے ہر رقعے کے عنوان میں شمار کا عدد درج نہیں لیکن بعد کے اڈیشنوں میں درج ہے -

۲—آخر زمانے کے بعض اڈیشنوں کے سرورق پر کتاب کا نام اس طرح درج ہے [۱] :—

" عود ہندی

مسمیٰ باسم تاریخی

مہر غالب "

لیکن پہلے اڈیشن کے سرورق پر اس قسم کی عبارت نہیں -

---

[۱]—(۱) نسخۂ مطبوعۂ انوار احمدی پریس الہ آباد - (۲) مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑہ - (۳) گلزار ہند اسٹیم پریس لاہور -

۳—ذیل کی عبارتیں عود هندی کے عام نسخوں میں اُن خطوط کی عبارتوں کے ساتھ شامل هیں جو چودهری عبدالغفور سرور کے نام هیں مگر پہلے اڈیشن میں حاشیوں پر مندرج هیں اور ایسا معلوم هوتا هے که جس طرح پہلے اڈیشن میں مندرج هیں - مرزا نے اپنے قلم سے اُن کو اُسی طرح لکھا تھا -

(۱) " اب روئے سخن حضرت صاحب عالم کی طرف هے " -

خط نمبر ۳

(۲) " اب خطاب جناب حضرت عالم کی طرف هے " -

خط نمبر ۵

(۳) " یہاں سے روئے سخن صاحب عالم کی طرف هے " -

خط نمبر ٦

(۴) " یہاں سے روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحب عالم کی طرف هے " -

خط نمبر ۱۸

(۵) " اب روئے سخن حضرت عالم کی طرف هے " -

خط نمبر ۲۸

عود هندی کی اشاعت کے باب میں جو کوششیں اب تک هوئی هیں وہ همارى شکر گزاری کی مستحق هیں لیکن ساتھ هی اس کے یہ امر نہایت هی افسوس ناک هے که عود هندی کے اغلاط و اسقام کی درستی کی طرف مطلق توجه نہیں کی گئی - ذیل میں بطور نمونه دو عبارتوں کا صحیح مسودہ اصل خطوط کے مطابق پیش کیا جاتا هے پھر

اُن کی وہ غلط صورتیں دی جاتی ہیں جو عود ہندی کے پہلے اڈیشن میں اور اُس کے تتبع میں دوسرے اڈیشنوں میں بھی پائی جاتی ہیں :—

اصل عبارت	عود ہندی میں مطبوعہ
(۱) پیرو مرشد فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گذاری میں حاضر اور غیر حاضر رہا ہے -	پیر و مرشد فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گذاری میں حاضر اور غیر قاصر رہا ہے - [مکتوب بنام قاضی عبدالجمیل بریلوی]
(۲) جناب قاضی صاحب کو سلام اور قصیدہ کی بندگی - اگر مجھے قوۃناطقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدہ کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا - بات یہ ہے کہ جو میں شایستہ مدح نہیں تو یہ شتایش راجع آپ کی طرف ہوگی - گویا یہ قصیدہ آپ ہی کی مدح میں ہے - میں اب رنجور نہیں -	جناب قاضی صاحب کو سلام اور قصیدے کی بندگی اگر مجھے قوۃناطقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدہ کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھنا بات یہ ہے کہ جو آئین شایستہ مدح میں ہے - میں اب رنجور نہیں - [مکتوب نمبر ۱۵۴ بنام قاضی عبدالجمیل بریلوی]

مطبع مفید عام آگرہ (۱۹۱۰ع) کے نسخے میں بعض عبارتیں پہلے اڈیشن کی عبارتوں سے جس قدر مختلف ہوگئی ہیں اس کا کسی قدر اندازہ ذیل کے نقشے سے ہو سکتا ہے :—

پہلا اڈیشن	آگرہ والا نسخہ
(۱) صاحب یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہوگئی - ہے ! اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے تب یہ تراوش خون نابہ ظہور میں آئی ہوگی -	(۱) صاحب یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہوگئی ہے اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے تب یہ تراوش خون نابہ ظہور میں آئی ہوگی - نمبر ۹ ص ۲۲
(۲) وہ چیز حصے میں اگر پارسیوں کے آئی ہے ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے - میر تقی علیہ‌الرحمۃ	(۲) وہ چیز حصے میں اگر پارسیوں کے آئی ہے ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے - مرتضیٰ علیہ‌الرحمۃ - نمبر ۲۹ ص ۴۳
(۳) خدا کرے تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو خفقانی آدمی کو بغیر حال معلوم ہوئے آرام نہیں آتا -	(۳) خدا کرے تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو حقانی آدمی کو بغیر حال معلوم ہوئے آرام نہیں آتا - نمبر ۹۴ ص ۱۰۴

خواجہ صاحب نے عود ہندی کا جو قلمی نسخہ منشی ممتاز علی صاحب کے پاس چھپنے کے لئے بھیجا تھا اُس کے متعلق منشی صاحب کو لکھا تھا کہ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے - خواجہ صاحب کی اِس تحریر کی بنا پر میں نے کوشش کی کہ خواجہ صاحب نے اپنا جو ذاتی کتب خانہ چھوڑا ہے اُس میں کہیں وہ نسخہ مل جائے - مگر خواجہ صاحب کے جو اعزہ بنارس میں ہیں اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ اُن کا بے بہا سرمایہ بنارس ہی میں ضائع ہوکر مفقود ہوچکا ہے تاہم ہنوز کوشاں ہوں - ممکن ہے کہ کہیں وہ نسخہ دستیاب ہوجاے تاکہ اغلاط کی تصحیح یقین کے ساتھ ہوسکے کیوں کہ عود ہندی کے تمام اڈیشنوں میں غلطیاں بہت ہیں اور جیوں جیوں اُس کے اڈیشن بڑھتے جا رہے ہیں تیوں تیوں غلطیوں میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آیندہ انہیں غلطیوں کو کہیں صحت کا درجہ نصیب نہ ہوجائے اور بطور سند پیش کی جائیں -

یہ بھی واضح رہے کہ خواجہ صاحب کے پاس مرزا کے اصل خطوط کہیں سے نہیں آئے تھے بلکہ اُن کی نقلیں آئی تھیں پس اگر کہیں اصل خطوط کا پتا لگے تو تصحیح اور بھی بہتر طور پر ہوسکتی ہے ؛ اکثر خطوط کی تاریخیں معلوم ہوسکتی ہیں اور بعض خطوط کے مضامین میں اضافہ ہوسکتا ہے - چنانچہ جناب قاضی محمد خلیل صاحب رئیس اعظم بریلی کے پاس مرزا کے جو اصل خطوط ہیں اور جن میں سے بیشتر عود ہندی میں شایع ہوچکے ہیں اُن کی بدولت میں تصحیح بھی کر سکا ہوں اور بہت سے خطوط کی تاریخیں بھی معلوم کر سکا ہوں

---

[۱]—عود ہندی ، خط ۱۵۶ -

اور کئی خطوط کے مضامین میں اضافہ کرسکا ہوں چنانچہ ایک خط [۱] مطبوعہ نسخوں میں صرف اِس قدر ہے :—

" جناب عالی وہ غزل جو کہار لایا تھا وہاں پہنچی جہاں اب میں جانے والا ہوں یعنی عدم - مدعا یہ کہ گم ہوگئی -

مگر اصل مکتوب کی پوری عبارت یہ ہے :—

جناب عالی—وہ غزل جو کہار لایا تھا وہاں پہنچی جہاں اب میں جانے والا ہوں یعنی عدم - مدعا یہ کہ گم ہوگئی -

گھات میں مدعا بـر آری کی

ہم نے غیروں کی غم گساری کی

تقدیم و تاخیر مصرعتیں کرکے رہنے دو اِس میں کوئی سقم نہیں - مدعا براری کایستھوں کا لفظ ہے میں اِس طرح کے الفاظ سے اِحتراز کرتا ہوں مگر چونکہ من حیث المعنی یہ لفظ صحیح ہے مضایقہ نہیں -

قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا

خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس مطلع میں خیال ہے دقیق مگر کوہ کندن و کاہ بر آوردن یعنی لطف زیادہ نہیں - قطرہ تھکنے میں بے اختیار ہے بقدر یک مژہ برهمزدن ثبات و قرار ہے - حیرت ازالۂ حرکت کرتی ہے قطرۂ مے حیرت سے تھکنا بھول گیا - برابر برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالی کا خط بصورت اُس تاگے کے بن گیا جس میں موتی پروئے ہوں -

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین

کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ وفغاں اور

[۱] عود هندی خط ۱۵۶

یہ بہت لطیف تقریر ہے ' لیتا کو ربط ہے جینے سے - کرتا مربوط ہے
آہ وفغاں سے ' عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں -
فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے بلکہ فصیح اور
بلیغ ریختہ تقلید ہے فارسی کی - حاصل معنی مصرعتین یہ کہ اگر
دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا - اگر نہ مرتا تو کوئی دن آور آہ
و فغاں کرتا -

ملنا اگر نہیں ترا آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یعنی اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے -
خیر اگر ترا ملنا آسان نہیں نہ سہی نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور
مل سکے گا - مشکل تو یہ ہے کہ وہی ترا ملنا دشوار بھی نہیں - جس سے
تو چاھتا ہے مل بھی سکتا ہے ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا مگر
رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے ۱۲ -

حسن اور اُس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

مولوی صاحب کیا لطیف معنی ہیں داد دینا - حسن عارض
اور حسن ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے
گمان اس کا صحیح کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اُس کو یہ نسبت اپنے
ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا پس جب
اُس کو اپنے اوپر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے ' اور حسن
ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا -
رقیب عاشق صادق نہ تھا ہوسناک آدمی تھا - اگر پاے امتحان
درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی -

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بسر ملے

یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ' ایک دوست اُس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اُس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے - میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کرے گا - خیر اُس کے ہاتھ خط بھیجا گیا - قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا - قاصد مکتوب‌الیہ کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہو گیا کیسا خط کیسا جواب - دیوانہ بن کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا - اب عاشق اِس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غضب داں تو خدا ہے کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر - اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اُس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا -

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اِس میں کوئی اِشکال نہیں جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں - شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا خدا جانے شہر میں یا نواح شہر میں تکیہ بناکر فقیر ہوکر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے [۱] -

خواجہ صاحب کا ایک خط پہلے درج کیا جا چکا ہے جس میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ جو مضمون اعلان کے لائق نہ تھے وہ نکال دیے گئے مگر

[۱]—اِس خط کے پیشتر مسودے کا عکس دیوان غالب ' مطبوعۂ نظامی پریس بدائوں ابتدا میں شائع ہوچکا ہے -

اِس خط اور چند خطوں کی عبارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عود ہندی کے بعض خطوں کی کچھ عبارتیں قطع و برید کی زد میں ضرور آگئی ہیں ـ

اس موقع پر میں جناب قاضی محمد خلیل صاحب رئیس اعظم بریلی کا تہ دل سے شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس معاملے میں میرے ساتھ نہایت دریا دلی سے کام لیا ہے -

عود ہندی کی ترتیب میں اگرچہ خواجہ صاحب نے بذات خود بہت کوشش کی اور مرزا نے بھی اس میں ان کی مدد کی - تاہم یہ کل ۱۶۸ ہی خطوں کا مجموعہ بن سکا - وجہ یہ کہ بہت سے خطوط کتاب کی ترتیب کے وقت مل نہ سکے تھے اور کچھ خط ایسے ایسے بھی تھے جن کا شائع کرنا مناسب نہ سمجھا گیا اور اس لئے وہ خارج کر دئے گئے - خیر جو کچھ ہو سو ہو - ان تمام خطوط کی ترتیب پر جب ہم علمی اور ادبی حیثیت سے غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فصلوں کے بہت سے خطوط اور خصوصاً ابتدائی خطوط کا کما حقہ سمجھنا سمجھانا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ یہ خطوط ایسے خطوط کے جواب میں ہیں جن میں کسی مشکل شعر کے معنی پوچھے گئے ہیں یا کوئی تحقیق طلب مسئلہ فارسی یا اردو کا دریافت کیا گیا ہے -" عود ہندی" کے سارے خطوں پر تبصرہ کرنے کی اِس مضمون میں گنجائش نہیں اِس لیے فصل اول کے پہلے خط کی صرف چند سطریں بطو نمونہ یہاں نقل کی جاتی ہیں :—

" چودھری صاحب شفیق مکرم کی خدمت میں بعد ارسال سلام مسنون عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی ورنہ میں سزاوار ستایش نہیں ہوں - ایک سپاہی زادۂ ہیچمداں اور پھر

دل افسردہ ' دروں فرسودہ - ہاں ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کی پرواز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پایئے گا اور حق بجانب میرے ہو گا - پہلے میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزدی سروش ہیں اور اِن کا کلام وحی ہے - اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں - یہ میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ اِن کا قیاس غلط ہے مگر یہ بھی کوئی کہہ نہیں سکتا کہ جو کچھ یہ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے - اِسی چھاپے میں کہ جس کا آپ حوالہ دیتے ہیں ملکہ باشم عقل کل الخ اِس شعر کی شرح کو ملاحظہ کیجئے عبارت دو تعقید سے لبریز کہ مقصود شارح کا سمجھا بھی نہیں جاتا اور جب غور و تامل کے بعد سمجھ لیجئے تو وہ معنی ہر گز لایق اِس کے نہیں ہیں کہ فکر سلیم اُس کو قبول کرے پھر اِحسان تو بشگافتہ الخ اِس مصرعہ کی توجیہ کتنی بیمزہ اور بے نفع ہے عرفی کو کہاں سے لاؤں جو اُس سے پوچھوں کہ بھائی تونے اِس شعر کے کیا معنی رکھے ہیں '' -

عود ہندی کے کسی اڈیشن پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ کسی ایک مکتوب الیہ کے سب خط ایک ہی جگہ نہیں ہیں - کتابت کی تاریخوں کے سلسلے سے بھی خطوں کی ترتیب نہیں ہوئی ہے بلکہ کتاب کے ترتیب دینے والوں نے تاریخوں کو سراسر حذف کردیا ہے - چنانچہ قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی مرحوم کے نام جو خط '' عود ہندی '' میں ' درج ہیں اُن میں سے بعض کے اصل نسخے محفوظ ہیں اور ان میں کتابت کی تاریخ موجود ہے (جیسے خط ۱۴۲ — ۲۰ نومبر ۱۸۵۵ع ' خط ۱۷۴ — ۳۰ جون ۱۸۶۱ع ' خط ۱۳۹ — ۲۹ اپریل ۱۸۵۹) -

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ بے ترتیبی کیوں کر واقع ہوئی - غالب یہ ہے کہ کتاب کے ترتیب دینے والوں میں سے ہر ایک کو جس سلسلے سے خطوط ملتے گئے اُسی سلسلے سے وہ مجموعے میں شامل ہوتے رہے اور اُسی ترتیب سے کتاب شائع ہوئی - مثلاً خواجہ صاحب کے نام مرزا غالب کا ایک خط یہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا " عود ہندی " میں شامل کیے جانے کے لیے خطوں کو جمع کر کے بھیجتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حق التصنیف کی جلدیں بھی طلب کررہے ہیں :—

" پیر و مرشد کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں مولوی عبدالغفور خاں اُن کا نام اور نساخ اُن کا تخلص ہے میری اُن کی ملاقات نہیں اُنہوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ " دفتر بے مثال " مجھ کو بھیجا اُس کی رسید میں یہ خط میں نے اُن کو لکھا - چونکہ یہ خط مجموعۂ نثر اردو کے لائق ہے آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں اور ہاں حضرت وہ مجموعہ چھپے گا بلقتم یا چھپے گا بالفم - چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے فقیر کو بھیجئے والسلام - "

اِسی کے بعد مولانا نساخ کے نام کا یہ خط [۱] درج ہے :—

" جناب مولوی صاحب قبلہ یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم باسداللہ اور متخلص بہ غالب ہے مکرمت حال کا شاکر اور آیندہ افزایش عنایت کا طالب ہے دفتر بے مثال کو عطیۂ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان مانا الخ "

---

[۱]— (عود ہندی) خط ۱۱۲ -

[۲]— عود ہندی خط ۱۱۳ -

عود ہندی میں منشی غلام بسم‌اللہ کے نام کا خط سب کے آخر میں ہے۔اِس کے قبل مرزا کی لکھی ہوئی دو تقریظیں اور تین دیباچے ہیں پھر ان تقریظوں اور دیباچوں کے قبل خطوط ہی خطوط ہیں - اب سوال یہہ ہےکہ ترتیب میں منشی غلام بسم‌اللہ کے نام کا خط تقریظوں اور دیباچوں کے بعد کیوں ہوا - میرے نزدیک یہ بات یوں ہے کہ منشی صاحب میرٹھ میں ناظر تھے وہاں منشی ممتاز علی صاحب کو اُن کے نام کا خط اُس وقت ملا ہوگا جب کہ عود ہندی قریب قریب چھپ گئی ہوگی اس لئے منشی صاحب نے اُس کو آخر میں جگہ دیدی -

عود ہندی کی پہلی فصل کا مسودہ خواجہ صاحب کے پاس چودھری عبدالغفور سرور نے بھیجا ہے لیکن دوسری فصل کے باب میں سوال یہ ہوتا ہے کہ اس کا کس قدر مواد خواجہ صاحب نے اپنی طرف سے جمع کیا ہے اور کس قدر مرزا کی مدد سے ان کے پاس پہونچا - اس کے باب میں یہ جاننا چاہئے کہ خواجہ صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھ پور اور اکبرآباد سے تحریریں فراہم کیں [۱] اس کی بنا پر یہ ضرور ہے کہ موسومہ ذیل حضرات کے نام کے خطوط خواجہ صاحب نے بذات خود جمع کئے البتہ یہ ممکن ہو کہ اِن کی فراہمی میں منشی محمد ممتاز علی صاحب سے مدد ملی ہو:—

۱—نواب انورالدولہ سعدالدین شفق (کالپی)

۲—مرزا حاتم علی مہر (آگرہ)

مرزا رحیم بیگ (میرٹھی) [۲]

---

[۱]—فغان بےخبر ' ص ۸۲ -

[۲]—ان کے نام جو ایک خط " عود ہندی " میں ہے " رد قاطع برہان " کے مباحثے کے زمانے میں الگ چھپ چکا تھا - [ادارہ]

۴—مولوی عبدالرزاق شاکر [۳] گورکھ پور)
۵—قاضی عبدالجمیل (بریلی)
۶—مفتی سید محمد عباس (لکھنؤ)
۷—خواجہ صاحب
۸—مولوی عزیزالدین
۹—منشی مردان علی رعنا
۱۰—نواب مصطفی خاں شیفتہ

خواجہ صاحب چونکہ اس صوبے کے اعلیٰ حاکم کے میر منشی تھے اور ایک معروف ادیب بھی تھے لہذا اِس صوبے سے تعلق رکھنے والی تحریروں کو وہ بآسانی اکٹھا کر سکے باقی جس طرح مولوی عبدالغفور نساخ کے نام کے خط کا مسودہ خواجہ صاحب کے پاس مرزا نے خود بھیجا تھا اُسی طرح ممکن ہے کہ اِن حضرات کے نام کے خطوط کی نقلیں بھی مرزا غالب ہی نے خواجہ صاحب کو بھیجی ہوں جیسا کہ خواجہ صاحب خود لکھتے ہیں کہ مرزا سے بہت کچھ حاصل کیا [۴] :—

۱—مولوی عبدالغفور نساخ
۲—میر مہدی حسین مجروح
۳—میر سرفراز حسین
۴—نواب علاءالدین خاں بہادر
۵—منشی ہر گوپال تفتہ
۶—مرزا یوسف علی خاں عزیز
۷—حافظ از طرف ظہیرالدین

[۳]—مولانا کا وطن مچھلی شہر ہے مگر اس زمانے میں گورکھ پور میں مقیم تھے -
[۴] غالب بےخبر، ص ۸۲ -

حقیقت یہ ہے کہ مرزا کے خطوط محض مزا لینے یا ادبی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے جمع کیے گئے اِس لیے ترتیب کتاب کے ذمہ‌داروں نے کتابت کی تاریخوں کو بے کار جان کر حذف کردیا اور اسی سلسلے میں اکثر اُن معنی خیز فقروں کو بھی حذف کردیا جو مرزا غالب اپنے خط کے خاتمے میں حسب موقع و محل لکھا کرتے تھے مثلاً مرزا کا ایک خط [۱] بنام قاضی عبدالجمیل صاحب یوں ہے :—

پیر و مرشد - نواب صاحب کا وظیفہ خوار گویا اس در کا فقیر تکیہ دار ہوں مسندنشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا - میں کہاں اور بریلی کہاں - ۱۳ اکتوبر کو یہاں پہنچا بشرط زندگی آخر دسمبر دھلی کو جاؤنگا - نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں - لاالہ‌الا اللہ الا اللہ لا موثر فی‌الوجود الا اللہ -

نجات کا طالب غالب

سہ شنبہ ۷ نومبر سنہ ۱۸۱۵ -

لیکن اس کے خاتمے کے یہ لطف آمیز الفاظ ' نجات کا طالب غالب ' مطبوعہ خط میں درج نہیں -

قصہ کوتاہ عود ہندی میں جو غلطیاں اور علمی وادبی یا ترتیب وغیرہ کی جو خرابیاں ہیں اگر ابتدا ہی میں اُن کی روک تھام ہوگئی ہوتی تو جس قدر فائدہ ہم اُس سے اُٹھا رہے ہیں اُس سے کہیں زیادہ فایدہ اُٹھا سکتے - اگر اب بھی کوشش کی جائےتو بہت کچھ اصلاح ممکن ہے مگر اس طرف سے بے پروائی کی گئی‌ضروری‌مواد تھوڑے دنوں‌میں یقیناً ضائع ہوجائےگا

[۱]—۱۵۷ (عود ہندی)

ملک حبش

(از پنڈت منوہر لال زتشی ایم - اے)

حبش کا ملک جس کو فرنگی ابی سینیا (Abyssinia) اور اِتھی یوپیا (Ethiopia) بھی کہتے ہیں براعظم افریقہ کے شمالی مشرقی گوشہ میں واقع ہے - اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس ملک کا رقبہ ساڑھے تین لاکھ مربع میل اور آبادی پچاس لاکھ ہے نشیبی حصہ میں جو میدان اور وادیاں ہیں وہ گرم ہیں مگر ملک کا بڑا حصہ پہاڑی ہے اور پہاڑی حصہ با وجود خط استوا کی قربت کے معتدل ہے بحر ازرق جس کو فرنگی بلیو نائل (Blue nile) کہتے ہیں حبش کے مغربی پہاڑوں سے نکلتی ہے اور سوڈان میں جا کر دریاے نیل سے مل جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ دریاے نیل میں جو سالانہ باڑھ آتی ہے اور جس کے اوپر مصر والوں کی کھیتی کا سارا بھروسہ ہے اُس کا مدار زیادہ تر اس شدید بارش پر ہے جو حبش کے کوہستانی علاقہ میں مانسون کے زمانہ میں ہوتی ہے اور جس کا پانی بحر ازرق میں ہو کر دریاے نیل میں پہنچتا ہے - حبش والوں کا کام تو ہلکی بارش سے بھی چل سکتا ہے لیکن اگر بارش قلیل ہو اور اس کا زائد پانی دریاے نیل میں نہ پہنچے یا حبش والے کسی وجہ سے اور کسی ترکیب سے اس پانی کو روک لیں تو سوڈان اور مصر کی زراعت کے لینے کے دینے پڑ جائیں حبش کے مشرقی حصہ میں اور دریا بھی ہیں جو سومالی لینڈ سے گذر کر بحر ہند میں گرتے ہیں - سومالی لینڈ افریقہ کا وہ ملک ہے جو حبش کے پورب طرف بحیرہ قلزم اور بحر

هند کے ساحل پر واقع ہے اس کا کچھ حصہ تو حبش کی حکومت میں ہے اور باقي کے فرنگیوں نے حصے بخرے کر لئے ہیں - جنوبی حصہ اٹلی کے قبضہ میں ہے اور شمالی حصہ جس میں ژبوتی (Jibuti) کا مشہور بندر واقع ہے فرانسیسیوں کے پاس ہے اور ان دونوں کے بیچ کا حصہ انگریزي سلطنت میں شامل ہے -

حبش کے موسم کچھ ہندوستان ہي کے طرح ہیں اکتوبر سے فروری تک جاڑا مارچ سے جون تک گرمی اور جولائی سے ستمبر تک بارش - اس ملک میں جنگل بہت ہیں جن میں کھجور - زیتون اور چیر کثرت سے ہیں ان کے علاوہ انجیر نارنگی نیبو انار اور آڑو کے درخت بھی پائے جاتے ہیں اور قہوہ کي کاشت بھی ہوتي ہے - یہاں کے لوگ اپنے روزمرہ کے استعمال کے لئے گیہوں جو اور جوار کي کھیتي کرتے ہیں اور روئی اور گنا بھي پیدا کرتے ہیں - قہوہ دو قسم کا ہوتا ہے گھٹیا قسم کا قہوا زیادہ تر حبش ہی میں استعمال ہوتا ہے مگر بڑھیا قسم کے قہوا کی مانگ باہر کے ملکوں میں ہے بیسویں صدي میں روئی کی کاشت میں ترقی ہوئی ہے بعض مقامات کی زمین روئی کے کاشت کے لئے اس قدر موزوں ہے کہ سال میں دو اور کہیں کہیں تین فصلیں ہوتی ہیں - حبش کے جنگلوں میں شیر ببر - چیتے اور بھیڑئے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور حبشی اُمرا ہرن کا شکار چیتوں سے اور شتر مرغ کا شکار کتوں سے کرتے ہیں -

تجارت کی اشیا حبش میں کم ہیں - زیادہ تر قہوہ - جانوروں کی کھالیں - ہاتھی دانت اور شتر مرغ کے پَر ملک سے باہر بھیجے جاتے ہیں اور ان کے عوض میں حبش والے سوتي کپڑا چاول شکر اور بندوقیں خریدتے ہیں قہوہ کی بڑي مقدار امریکا جاتی ہے اور سوتی کپڑا امریکا

انگلستان اور هندوستان سے آتا ہے اس ملک میں بندرگاہ نہیں هیں اس لئے تجارت اطالوی فرانسیسی اور انگریزی سومالی لینڈ کے بندروں سے هوتی هے جن سب کا تعلق عدن سے هے - انیسویں صدی کے آخر تک اس ملک میں ایک فرنگی ڈالر سکے کا رواج تھا اور پہاڑی نمک کی سلیں اور کارتوس بھی سکوں کی طرح استعمال کئے جاتے تھے - سنہ ۱۹۰۵ع میں دارالسلطنت آدس ابے با (Adis Ababa) میں بینک آف ابی سینیا قائم هوا اور اس کو حبش میں سکے بنانے اور نوٹ جاری کرنے کا اختیار دیا گیا - تجارت کی سُستی کی ایک وجہ یہ بھی هے کہ ملک پہاڑی اور جنگلی هے اور اس میں شہر اور قصبے چھوٹے اور کم هیں اور آمدورفت کے راستے محدود هیں صرف ایک ریل کی لائن هے جو ژبوتی سے نکل کر حبش کے اندرونی حصے میں کچھ دور تک چلی گئی هے برقی تار دارالسلطنت سے صرف چند شہروں تک پھیلے هیں اور ملک بھر میں ٹیلیفون کی صرف ایک لائن هے - سڑکیں کم هیں اور باربرداری کا کام گدھوں خچروں گھوڑوں اور اونٹوں سے لیا جاتا هے -

حبش کے باشندے ظاهر هے کہ حبشی هونگے مگر اس قوم کے قوام میں مصری اور حمیری خون کی بھی آمیزش هے - مصر اور یمن سے حبش کے تعلقات پرانے هیں - مصر کی تاریخ کا انکشاف وهاں کے پرانے کتبوں سے هو رها هے جس سے معلوم هوتا هے کہ ایک زمانہ میں مصر کے بادشاهوں نے حبش کو فتح کیا تھا اور حبش والے شاهان مصر کو حبشی غلام سونا اور هاتھی دانت خراج میں دیتے تھے - مسیح سے قبل گیارهویں صدی میں حبش والوں نے آزادی حاصل کر کے اپنی سلطنت الگ قائم کر لی اور کچھ ایسا پانسہ پلٹا کہ آٹھویں میں مصر کو فتح کر کے وهاں ایک حبشی شاهی خاندان قائم کر دیا جس نے مصر پر سو برس سے زیادہ

حکومت کی اس خاندان کے زوال کے بعد مصر والے خود مختار ہو گئے مگر وہ حبش کو پھر نہ فتح کر سکے تاہم مصر اور حبش کے تمدنی تعلقات جاری رہے عرب کا جنوبی صوبہ یمن جو کسی زمانہ میں تہذیب کا گہوارہ تھا بحیرہ قلزم کے ایک طرف ہے اور حبش دوسری طرف - مورخ بیان کرتے ہیں کہ یمن کے حمیر اور حبش والوں میں پرانے تعلقات تھے - چھٹی صدی عیسوی میں جب یمن میں عیسائیوں پر سختی ہوئی تو روم (Rome) کے شہنشاہ نے حبش کے عیسائی فرماں روا سے درخواست کی کہ وہ عیسائیوں کی مدد کرے چنانچہ حبشیوں نے خلیج عدن کو عبور کرکے یمن پر حملہ کیا اور پچاس برس تک اس پر قابض رہے - مولانا شبلی سیرۃ النبی میں لکھتے ہیں :—

" حمیر نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دیکر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی" اس عہد کا ایک کتبہ جو آج کل ہات آیا ہے اس پر یہ الفاظ ہیں -

" رحمان مسیح اور روح‌القدس کی قدرت و فضل و رحمت سے اس یاد گاری پتھر پر ابرھتہ نے کتبہ لکھا جو کہ بادشاہ حبش اراحمیس ذبی مان کا نائب‌الحکومتہ ہے " سر ولیم میور اپنی کتاب Life of Mohammad میں لکھتے ہیں کہ سنہ ۵۷۰ عیسوی میں حبشی نائب‌السلطنت نے مکہ پر حملہ کیا اور کعبہ کو ڈھانا چاہا - حبشی لشکر میں ہاتھی بھی تھے - یہی وہ اصحاب فیل ہیں جن کے لشکر کو ابابیلوں نے کنکریاں مار کر تباہ کر دیا تھا جس کی تعبیر فرنگی مورخ یوں کرتے ہیں کہ حملہ آوروں کی فوج میں چیچک کی وبا پھیلی اور وہ غارت ہو گئی - عرب اور حبش کے تعلقات میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب رسول

عربی نے مکہ میں بھی اسلام کی اشاعت شروع کی اور قریش نے مسلمانوں کو دق کرنا شروع کیا تو اُن کے ظلم و تعدی سے تنگ آکر مسلمانوں کے ایک گروہ نے اپنے رسول کی اجازت سے حبش کو ھجرت کی اور کئی برس تک وہاں قیام کیا قریش نے حبش کے بادشاہ نجاشی کے پاس ایک سفارت بھیجی اور اس سے کہا کہ ھمارے مجرم ھم کو حوالے کر دے جائیں مگر نجاشی نے ان کو واپس دینے سے انکار کر دیا - آخر جب رسول نے مدینہ کو ھجرت کی اور اسلام کا اقتدار وہاں قائم ہو گیا تب یہ حبش کے مہاجر واپس بلا لئے گئے -

اهل حبش روایت کرتے ھیں کہ ان کا شاھی خاندان ملکہ سبا کی اولاد ھے جس کو عرب بلقیس کہتے ھیں اور جو حضرت سلیمان سے ملنے یروشلم گئی تھی یہ بھی کہا جاتا ھے کہ جب بنی اسرائیل گرفتار کر کے بابل بھیجے گئے تھے تو ان میں سے کچھ لوگ حبش میں آکر آباد ھو گئے تھے اس کا پتہ بھی چلتا ھے کہ سکندر کی وفات کے بعد جب یونانی بادشاہ مصر پر حکومت کرتے تھے تو حبش میں یونانی آتے جاتے تھے مگر اس زمانۂ قدیم کی کوئی مستند اور مسلسل تاریخ دستیاب نہیں ھوئی ھے - چوتھی صدی عیسوی میں اس ملک میں عیسائی مذھب کی اشاعت ھوئی اور رفتہ رفتہ سارا ملک عیسائی ھو گیا اور اب تک اسی مذھب پر قائم ھے - جب عرب میں اسلام کا رواج ھوا اور مسلمانوں نے یمن اور مصر کو فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کی تو حبش کے تعلقات ان ملکوں سے قطع ھو گئے اور بہ قول ایک مورخ کے ہزار برس تک اهل حبش سوتے رھے نہ ان کو دنیا کی خبر تھی اور نہ دنیا کو ان کی - اتنا ضرور تھا کہ اهل فرنگ روایت کیا کرتے تھے کہ مشرق میں ایک عیسائی سلطنت قائم ھے جس کے بادشاہ کا نام پر سٹر جان ھے - پندرھویں

صدی میں جب پرتگال والوں نے یورپ کا رخ کیا اور افریقہ کے سواحل کو طے کر کے ہندوستان پہنچنے کی فکر ہونے لگی تو سنہ ۱۴۹۰ع میں ایک پرتگالی سیاح حبش پہنچا اور وہاں کے بادشاہ کو جس کا خطاب نی‌گس یا نجاشی تھا اپنے بادشاہ کا خط دیا اس وقت سے حبش کے تعلقات پرتگال سے قائم ہوئے اور کبھی کبھی مذہبی یکا نگت کی بنا پر پرتگال والے مسلمانوں کے خلاف اہل حبش کی مدد کرنے لگے - سنہ ۱۷۶۹ع میں جیمس بروس نامے ایک انگریز سیاح دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کی دھن میں ابی سینیا پہنچا تھا اور وقتاً فوقتاً یورپ سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ پادری اپنے اپنے مذاہب کی اشاعت کی غرض سے حبش جایا کرتے تھے مذہب کے ساتھ ساتھ دنیاوی مسائل کا چرچا بھی رہتا تھا اور ان کی بنا پر انیسویں صدی کے شروع میں فرانس اور انگلستان میں خاصی اچھی رقابت پیدا ہو گئی تھی - جب نپولین نے مصر پر حملہ کر کے اس ملک کو اپنے قبضہ میں لانا چاہا تو انگریزوں کو حبش کی فکر دامن گیر ہوئی اور سنہ ۱۹۰۵ع میں پہلی انگریزی سفارت اس غرض سے بھیجی گئی کہ انگلستان اور حبش میں اتحاد قائم کرے اور انگلستان کے واسطے بحیرۂ قلزم کے ساحل پر ایک بندر گاہ حاصل کرے ' اس وقت سے یہ سلسلہ پادریوں اور سفیروں کا جاری ہے حتیٰ کہ ایک مرتبہ جنگ کی نوبت بھی آچکی ہے -

حبش کا فرماں روا نی‌گس کہلاتا ہے جس کے معنی شہنشاہ کے ہیں- ملک کے مختلف صوبوں اور اضلاع پر چھوٹے چھوٹے سردار قائم ہیں جن کو راس کہتے ہیں - جیسا کہ شخصی حکومت کا دستور ہے - جب مرکزی حکومت کمزور ہوتی ہے تو مقامی سرداروں میں خانہ جنگی کا بازار گرم رہتا ہے اور ہر راس یا مقامی حاکم اپنا اقتدار اور دائرۂ حکومت وسیع

کرنے کی کوشش کرتا ہے - انیسویں صدی کے وسط میں تھیو ڈور (Theodore) حبش کا شہنشاہ تھا اور اس نے لڑ بھڑ کر قریب قریب سارے ملک پر اپنی حکومت جمالی تھی - تھیوڈور سے اور انگریزوں سے پہلے تو خاصہ اچھا اتحاد تھا یہاں تک کہ جب سنہ ۱۸۶۰ع میں انگریزی سفیر پلاوڈن کو حبشیوں کے ایک قبیلہ نے مار ڈالا تو تھیو ڈور نے اس کو سخت سزا دی اور اس قبیلہ کے دو ہزار آدمیوں کو تہ تیغ کیا مگر جب سنہ ۱۸۶۳ع میں تھیو ڈور نے ایک خط ملکہ وکٹوریہ کو لکھا اور صیغہ خارجیہ کے طرف سے اس کا کچھ جواب نہ گیا تو تھیو ڈور کی نظر انگلستان کے طرف سے پھر گئی چنانچہ سنہ ۱۸۶۵ع میں اس نے ناراض ہوکر انگریزی سفیر اور اس کے ساتھیوں کو قید کردیا اور مسلسل نامہ و پیام کے باوجود ان کو چھوڑنے سے انکار کیا آخر سر رابرٹ نیپیر (Sir Robert Napier) تیس ہزار فوج کے ساتھ حبش بھیجے گئے سنہ ۱۸۶۸ع میں انہوں نے ملگ ڈیلا کے مقام پر حبشیوں کو شکست دی اور انگریزی قیدیوں کو رہا کرکے اپنے ساتھ واپس لائے - تھیو ڈور نے خود کشی کرلی -

تھیو ڈور حبش کے شاہی خاندان سے نہ تھا اس نے حبش کی سلطنت اپنے قوت بازو سے حاصل کی تھی - حبش کے شاہی خاندان کا شاہزادہ اور حبش کے تخت و تاج کا وارث مے نے لک (Menelik) گوشہ گمنامی میں پڑا تھا - تھیو ڈور کے مرنے کے بعد بھی اس کے دن نہیں پھرے جس طرح تھیو ڈور نے اپنے زور بازو سے حبش کی سلطنت حاصل کی تھی اسی طرح اس کے مرنے کے بعد ایک سردار جان (John) نامی نے سارے ملک پر اپنا اقتدار جمالیا اور مے نے لک کو اس کی اطاعت کرنی پڑی - جان کے زمانہ میں مصر سے اور سوڈان کے درویشوں سے کبھی کبھی جھپٹ ہوجاتی تھی - اٹلی والوں نے بھی اسی زمانے میں

ریشہ دوانی شروع کی اور بحرہ قلزم کے کنارہ پر اپنی ایک نو آبادی
قائم کرلی - سنہ ۱۸۸۹ع میں جان کے مرنے کے بعد مے نے لک کی باری
آئی - اس بادشاہ نے اپنے زمانہ حکومت میں فرنگی ممالک سے تعلقات
بڑھائے اور اپنے ملک میں تہذیب و تمدن کو فروغ دیا ' فوج کو نئے
ہتھیاروں سے مسلح کیا کہ اہل حبش کو اس قابل بنا یا کہ وہ دول
فرنگ سے برابری کے دعوے سے بات چیت کرسکیں - اٹلی والوں نے اب
پھر قدم بڑھانے شروع کئے اور کئی برس کی چھیڑ چھاڑ کے بعد آخر کار
سنہ ۱۸۹۶ع میں اڈووا کے مقام پر اطالوی اور حبشی فوجوں میں خونریز
جنگ ہوئی جس میں اٹلی والوں کو شکست فاش ہوئی - اُن کے ساڑھے
چھ ہزار سپاہی مارے گئے اور ڈھائی ہزار قید ہوئے اس کے بعد اٹلی کا
جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اٹلی اور حبش میں صلح ہوگئی - سنہ ۱۹۰۶ع
میں اٹلی انگلستان اور فرانس میں حبش کے متعلق ایک معاہدہ ہوا
جس میں حبش کی خود مختاری کو قبول تو کیا گیا مگر اسی کے ساتھ
یہ بھی کہا گیا کہ جب ضرورت پڑے گی تو یہ تینوں قومیں اپنے اپنے
فوائد کے واسطے کوشش کرینگی - مے نے لک کے مرنے کے بعد اس کا پوتا
جس کو اُس نے اپنی زندگی میں اپنا وارث نامزد کیا تھا بادشاہ ہوا -
فرنگی اقوام کو فرنگستان کے باہر ملک و مال کی تلاش ہے فرنگیوں نے
وہ ذرائع جن سے انسان نیچر کے کارخانہ پر قدرت پاسکتا ہے اچھی طرح
حاصل کر لئے ہیں اور ایسی بےشمار چیزیں ایجاد کی ہیں جن کی مدد سے
وہ زراعت - خبر رسانی - تجارت - جنگ - غرض کہ دنیاوی ترقی کے ہر صیغہ
پر قادر اور قابض ہوتے جاتے ہیں - ان ممالک کی آبادی بڑھتی جاتی ہے
اور اسی وجہ سے ان کو فرنگستان کے باہر ایسی زمینوں کی تلاش ہے
جہاں یا تو وہ اپنے یہاں کے زائد باشندوں کو آباد کرسکیں یا تجارت کے

ذریعہ سے دولت حاصل کر سکیں - اس دوڑ میں سب سے زیادہ کامیابی انگلستان کو حاصل ہوئی ہے اس کے بعد فرانس کا نمبر ہے - جرمنی اور اٹلی والے اپنے اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے اس دوڑ میں پیچھے رہے - اب چوں کہ اٹلی کی آبادی بڑھ رہی ہے اور مسولونی کی سر کردگی میں اس کو قومی اور سیاسی استحکام حاصل ہوگیا ہے اس لئے اس کی بھی خواہش ہے کہ اور فرنگی اقوام کی طرح فرنگستان سے باہر وہ بھی ملک و مال حاصل کرے - اٹلی والے اپنے تئیں پرانے روم (Rome) کا وارث سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں شمالی افریقہ اس سرے سے اس سرے تک روم کی سلطنت میں شامل تھا - جنگ عظیم سے پہلے ترکی کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر اٹلی نے ٹری پولی (Tripoli) کے صوبہ پر قبضہ کر لیا تھا مگر اٹلی والوں کی توسیع مملکت کے لئے شاید یہ کافی نہیں ہے - سوال یہ ہے کہ کریں تو کیا کریں - یونا ئٹڈ اسٹیٹس (United States) کے ڈر سے امریکا میں قدم نہیں رکھ سکتے - ایشیا اور افریقہ کی تقسیم دول فرنگ میں ہوچکی ہے - افریقہ کے سارے بر اعظم میں صرف حبش کا ایک ملک ہے جو خود مختار ہے اور اسی وجہ سے اٹلی والوں کا دانت اس پر ہے - لڑائی کا بہانہ کہیں ڈھونڈنے تو جانا نہیں - کہیں سرحد پر بندوق چل گئی کہیں حبش کے سپاہی اپنی لائن سے دس قدم آگے بڑھ آئے - حبش والے بار بار کہتے ہیں کہ اس قسم کے جتنے جھگڑے ہوں اور اٹلی کو جتنی شکایتیں ہوں وہ سب مجلس بین الاقوام (League of Nations) کے سامنے پیش کردئے جائیں اور اس مجلس کا فیصلہ منظور کر لیاجائے مگر اٹلی اس پر رضامند نہیں ہے اٹلی والے بار بار یہی کہتے ہیں کہ ہم بغیر لڑے نہ مانینگے - مجلس بین الاقوام کے پاس نہ توپ ہے نہ بندوق

نہ فوج ہے نہ پولس - اخلاقی دباوجو تھوڑا بہت تھا وہ کب کا زائل ہوچکا - جرمنی اور جاپان اُس کو چھوڑ چکے - امریکا والے لیگ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور یورپ کے مخمصوں میں پڑنا نہیں چاہتے - انگلستان اور فرانس کو یہ ڈر ہے کہ اگر ہم اٹلی کے خلاف کچھ کہیں یا کریں تو اٹلی والے جرمنی کے ساتھ ہوجائیں گے - نہ معلوم فرنگستان میں شطرنج کی چال کیسی پڑے اور ہم کو کس وقت اٹلی کی مدد کی ضرورت ہو اس لئے وہ دم بخود ہیں - اٹلی والے اس داو پیچ کو اور فرانس اور انگلستان کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے جامہ سے باہر ہورہے ہیں وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ لڑائی گورے اور کالے کی ہے اور ہم ان کالے آدمیوں کو فتح کر کے رہینگے - حبش والے عیسائی ہیں تو ہوا کریں - حبش کے لوگ بہادر ہیں بندوقیں ان کے پاس ہیں ان کا ملک پہاڑی ہے اس سے اب تک مقابلہ پر اڑے ہوے ہیں مگر نہ اُن کے پاس اژدر دہاں توپیں ہیں نہ آہن پوش جہاز نہ فلک سیر طیارے - ان کی آبادی بھی اٹلی کے مقابلہ میں کم بلکہ بہت کم ہے اور ایجادات جدید سے وہ اس درجہ مستفید نہیں ہیں جس درجہ کہ فرنگی - شاہنشاہ حبش کا دعویٰ ہے کہ غلامی کی زندگی سے آزادی اور عزت کی موت بہتر ہے - دیکھنا یہ ہے کہ اس دعویٰ میں اس کی قوم کہاں تک اس کا ساتھ دیتی ہے - مشرقی ممالک میں قومی احساس کم ہے اور نمک حراموں کی تعداد زیادہ اور تجربہ بتاتا ہے کہ اٹلی والے حبش کے سرداروں کو اور حبش کے قبائل کو توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑینگے ہر قسم کی لالچ اُن کو دی جائے گی اور ہر قسم کے وعدے ان سے کئے جائینگے - ایک بات البتہ ہے کہ حبش حق بجانب ہے مگر ایک فرنگی مدبر کا قول ہے کہ خدا بھی بھاری پلٹنوں کا ساتھ دیتا ہے - واللہ اعلم -

چند دکھنی پہیلیاں

آٹھویں فصل

لباس ' سنگار ' زیور

---

(۱۸۰) تو جاتا تھا ' میں پکارتی تھی . تو ڈالتا تھا ' میں روتی تھی .

[منیہار بھی بنگڑی ' منیہار اور چوڑی

تو (ضمیر واحد حاضر) کا مخاطب چوڑیاں بیچنے والا (منیہار) ہے . چوڑیاں پہننے والی منیہار کو ' جو گلی میں چوڑیاں بیچنے کے لیے آواز لگا رہا ہے ' پکارتی ہے . جب وہ چوڑیاں ہاتھ میں ڈالتا (ڈالتا) ہے ' تو اس کے ہاتھ کو دبانے اور موڑنے کی وجہ سے اسے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ وہ گویا رو پڑتی ہے .

دوسرے جملے میں " ڈالتا " اور " روتی " میں جو بات کا ایک نازک (اور نا گفتہ بہ) پہلو پیدا ہوتا ہے ' اسے امیرخسرو نے اپنی اِس پہیلی میں کچھ، اور بھی نمایاں کر دیا ہے :

چٹاخ پٹاخ کب سے ؟ ہاتھ پکڑا ' جب سے !
آہ اوئی کب سے ؟ آدھا گیا ' جب سے !
چپ چاپ کب سے ؟ سارا گیا ' جب سے !

فاضل مصحح ' محمد امین چریا کوٹی نے اس پہیلی کا عنوان (ص ۱۷) " چوڑیاں " درج کیا ہے ' جو محل کلام ہے . پہیلی کے الفاظ " آدھا " اور " سارا " سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اثر بہید مذکر ہے . زرا سے غور سے اس صحیح نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ اس کا عنوان " چوڑیاں " نہیں بلکہ " چوڑا " (واو معروف سے) ہونا چاہیے . چوڑے

دو قسم کے ہوتے ہیں . ایک میں بہت سی چوڑیاں ہوتی ہیں ' جو کلائی اور اس کے اوپر کے حصے کے لحاظ سے چھوٹی بڑی ہوتی ہیں ؛ دوسرے میں اسی لحاظ سے اوپر سے نیچے تک گاؤ دم شکل کا مسلسل ایک ہی حلقہ ایک بڑی سی کمانی کی وضع کا ہوتا ہے . ملک پنجاب میں اب تک چوڑے کا رواج ہے . دونوں وضع کے چوڑے پہنے جاتے ہیں ' اور عموماً ہاتھی دانت یا ہڈی کا بنا ہوا چوڑا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے .

فاضل چریاکوٹی نے '' چوڑا '' کے عنوان سے دو اور کہہ مکریاں امیر خسرو کی نقل کی ہیں (ص ۳۳) :

۱ــــمو کو تو ہاتھی کا بھاوے ؛ گھٹتی بڑھی پہ موے نہ سہاوے
ڈھونڈھ ڈھانڈھ کے لائی پورا . کیوں سکھی' ساجن؟ نا سکھی' چوڑا !

۲ــــانگوں مورے لپٹا رہے ' رنگ روپ کا سب رس پیے .
میں بھر جنم نہ وا کو چھوڑا . اے سکھی ' ساجن ؟ نا سکھی' چوڑا !

ہمارے ہاں بچوں میں منہیاری اور چوڑی کی ایک پہیلی یوں کہی جاتی ہے :

تو آبیٹھی ' میں جا بیٹھی . تو کھول بیٹھی ' میں پسار بیٹھی .

اس میں چوں کہ منہیار کی جگہ منہیاری کا ذکر ہے ' اور دکھنی اور خسروی پہیلیوں کا سقیم مبتذل پہلو غائب ہے ' اس لئے دوسرا جملہ نازک طبیعتوں کو ناگوار نہیں ہو سکتا .

(۱۸۱) کالی گائی کاتے کھائی . پانی کو دیکھ کو موں پھرائی .

[جوتا

فائدہ : گائی ' گاے . موں ' منہ .

جوتے عموماً دو رنگ کے ہوتے ہیں ' سیاہ اور سرخ . یہاں سیاہ جوتے کا ذکر ہے ' جسے کالی گاے سے تشبیہ دی ہے ؛ اور جوتے کے کاٹنے کو

گاے کے کاٹنے سے تعبیر کیا ھے . یہ گاے پانی کو دیکھ کے منہ پھراتی ھے اور اس کے اندر نہیں جانا چاھتی ؛ یعنی جوتا پہنے پہنے بہت سے پانی میں سے گذر کر نہیں جا سکتے ! عام طور پر دیکھا جاتا ھے کہ دیہاتی اور گنوار لوگ پانی میں سے گذرتے وقت جوتا اتار کر ھاتھ میں لے لیتے ھیں ، یا نہایت احتیاط سے ڈنڈے کے ایک سرے پر ٹانگ کر کندھے پر رکھ لیتے ھیں .

واضح ھو کہ مدراس دکھن میں صرف غیر ھندو قوموں کے افراد ، مسلمان اور عیسائی ، جوتا پہنتے ھیں ؛ اور ان کے ھاں بھی ، سوا دولت مند اور پر تکلف نازک مزاج لوگوں کے ، صرف گھر سے باھر نکلنے کے وقت یہ تکلف برتا جاتا ھے . پھر جوتے جیسی عزیز چیز کو پانی میں اندر لیے ھوے چلے جانا کفران نعمت اور بےجا فضول خرچی نہیں تو اور کیا ھے !

امیر خسرو کی ایک کہہ مکرنی خوب ھے :

ننگے پاؤں پھرن نہیں دیت . پاؤں میں مٹی لگن نہیں دیت .
پاؤں کا چوما لیت نپوتا ! اے سکھی ، ساجن ؟ ناسکھی ، جوتا !

(۱۸۲) سرخ پھول ، دل خوش . پاواں اٹھا کو اندر گھس .
[جوتا]

اس پہیلی میں سرخ رنگ کے جوتے کا ذکر ھے ، جسے پہن کر بلا شبہہ دل خوش ھوتا ھے . جوتے میں پاؤں (پاواں) اٹھا کر ھی گھساے جاتے ھیں . کچھ اسی کے قریب اھل پٹنہ کی ایک پہیلی ھے ، کہ : ھاتھ نہیں ، پر پیٹ میں پاؤں .

(۱۸۳) لکڑے کا گھوڑا ، چمڑے کی لغام . میرا مسئلا نئیں بوجھے سو میرے گھر کا ھجام .

[گھڑاونی

گھڑاؤں کو لکڑی (لکڑے) کے گھوڑے سے تشبیہ دی ھے ' جس کا لگام (لغام) ' یعنی تسمہ ' چمڑے کا ھے . دوسرے جملے میں بوجھنے والوں کو دھمکی دی گئی ھے کہ جو نہ بوجھ سکے گا وہ حجام (ھجام) ھوگا !

(۱۸۴) کونگئی چوٹی کر کو سنگار ' گوری کرتی کالی کو پیار .

[مسی]

فائدہ : کونگئی (واو مجہول ' ن غنہ) ' کنگھی .

گوری سے مسی لگانے والی ' اور کالی سے مسی (جس کا رنگ سیاہ ھوتا ھے) مراد ھے .

اس میں شبہہ نہیں کہ یہ پہیلی اپنے طرز میں لاجواب ھے .

میرزا رفیع سودا کی ایک پہیلی ھے :

نر ناری یہاں کوئی کوئی بنا لگائے رھتی ھیں .
لوھے کی وہ نار بنائی ' تانبا کر وہ کہتی ھیں .

[لوھا مسی کا ایک بڑا جزو ھوتا ھے . مگر نام مسی ھے ' اور مس تانبے کو کہتے ھیں .]

مسی کے تلفظ کے لحاظ سے — مس ' سی (مس ' تانبا ؛ سی = ۳۰)—سودا نے ایک کہہ مکرنی یوں بنائی ھے :

ایک نار جگ موھت چلے . تیس پرکھ سوں نت وہ ملے .
جو تم بوجھو ' کروں اسیس ناوں بتاؤں ؟ تانبا تیس !

[تیس پرکھ سے دانت مراد ھیں . تانبا تیس = مس‌سی .]

لیکن سودا انشا کی پہیلی کو ان میں سے ایک بھی نہیں پہنچتی . انشا نے مستزاد در مستزاد میں کہا ھے :

جا بیگموں کے منہ لگے اک کالی سی حبشن؛
دونا کرے جوبن۔
وہ کیا ؟ اری سوسن!
لوہے کی جلی ہوئے ، کہیں سب اسے تانبا ؛
صورت میں پری سی۔
وہ ، یعنی کہ مسی!

امیر خسرو نے بھی دو پہیلیاں کہی ہیں :

(الف) سولی چڑھ مسکت کرے سہام برن اک نار۔
دو سے ، دس سے ، بیس سے ملے ایک ہی بار۔

(ب) سہام برن ایک نار کہاوے۔
تانبا اپنا نام دھراوے۔
جو کوئی وا کو مکھ پر لاوے ،
رتی سے سیر کھا جاوے۔

(۱۸۵) سلے کی گھڑی ، موتیاں کی جڑی۔ ہات لگا نکو ، تو اچھا دھری!

[بگڑ

بگڑا (ب مضموم) کان کا ایک زیور ہوتا ہے۔ اسے سونے (سلے) کی ایسی چھوٹی سی گھڑیا (گھڑی) سے تشبیہ دی ہے ، جس میں موتی (موتیں) جڑے ہوے ہیں۔ دوسرے جملے میں فرض کیا گیا ہے کہ سہیلی بگڑے کو ہاتھ لگانا چاہتی ہے ، مگر بگڑے والی کہتی ہے کہ "ہاتھ مت لگا (لگانکو) ، تجھے تو اسے رکھنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔ واہ خوب رکھا تو نے!"

لیکن اس میں بگڑے کی کوئی خصوصی کیفیت نظر نہیں آتی۔ یہی الفاظ کسی اور چھوٹے سے طلائی زیور کے لیے بھی کہے جاسکتے ہیں۔

(۱۸۶) ھمارے بھوی ابر مانگے ' جبر مانگے . اُپر کا تنگ کہا ' تو نچھے کے تھن مانگے .

[ناک کی نت ' نتھ

فائدہ : بیوی کے لیے جمع مذکر کی ضمیر " ھمارے " ادب کے لیے استعمال ہوئی ھے . ابر اور جبر ' ہم قافیہ (الف اور جیم مفتوح ' اور دونوں جگہ ب مشدد اور مفتوح) مہمل الفاظ ھیں . ان میں ب اور ر کی وجہ سے ایک لٹکتی ھوی سی چیز کے نام کے ساتھ ایک صوتی مناسبت پیدا ھوتی ھے ' بالخصوص دوسرے لفظ جبر میں ' جس میں ج ب ر کے تلفظ سے ایسی مناسبت اور زیادہ واضح معلوم ھوتی ھے . اپر (الف مضموم ' پ مشدد مفتوح) ' اوپر . تنگ (ت مکسور ' نون غنہ) کسی چیز کے بجنے کی آواز کا اظہار ھے . آخری لفظ تھن میں لفظ تنگ سے صوتی ربط اور پھر تجنیس پیدا ھے . مانگے (م مفتوح' نون غنہ) = مانگے ' بھوی نے مانگا . نچھے (ن مکسور ' چ مشدد ' ی مجہول) ' نیچے .

" اپر کا تنگ کہا " سے دو مفہوم سمجھ میں آتے ھیں . یا تو یہ اُس خفیف سی آواز کا اظہار ھے جو ناک چھیدتے ھوے لڑکی کے رونے یا اس کی " اوی " سے پیدا ھوتی ھے ' یا چھید نے میں نتھنے سے ایسی آواز پیدا ھوتی ھے . " نیچے کے تھن " سے نتھ اور اس کے موتی مراد ھیں .

بیان یہ ھے کہ ھماری بھوی ایک ابر جبر سی چیز لینا چاھتی تھیں . ھم ان کا مطلب سمجھ گئے . ھم نے نتھنے کو کچھ سے کونچ دیا ' اور نیچے تھن چیزیں لٹکا دیں . یعنی نتھ .

امیر خسرو نے کس خوبی سے دو لفظوں سے نتھ کی پہیلی تیار کی ھے :

ناری میں ناری بسے ' ناری میں نر دوے .
دو نر میں ناری بسے ؛ بوجھے برلا کوے.

امیر کی کہہ مکری بھی قابل داد ہے :

مکھ میرا چومت دن رات . ہونٹن لگت ' کہت نہ بات .
جاسے میری جگ میں پت . اے سکھی' ساجن؟ نا سکھی' نتھ!

(۱۸۷) کوزیاں کے بن میں کوزیاں کے بھارے . کھینچیں گے توریاں '
چمکیں گے تارے .

[تیکا

فائدہ : کھینچیں اور چمکیں میں ما قبل آخری کی ی معروف
بولی جاتی ہے . بن میں ب مفتوح ہے .

پہلے جملے کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا . غالباً کوزیاں اُن
قیمتی پتھروں کے نگینوں کی جانشین ہیں جو تیکے میں جڑے ہوے
فرض کیے گئے ہیں ؛ اور بھارے سے بھاری اور قیمتی مراد ہے . توریاں اور
تارے تیکے میں لگاے جاتے ہیں .

نویں فصل

ہتھیار ' اوزار ' آلات ' سواری ' نقدی

---

(۱۸۸) جب میں تھی بھولی بالی ' تب منجے مارتے تھے . اب مار
کو دیکھو منجے ' میں مرد سمجھوں گی .

[ہنڈی ' ہانڈی

فائدہ : منجے (م مفتوح ' ن غنہ) ' مجھے ' مجھ کو . ہنڈی
(ہ مفتوح) ' ہانڈی .

ھانڈی کہتی ھے کہ جب میں بھولی بالی (یعنی بالکل نئی) تھی ' جب تو تم مجھے مارتے تھے ' اب زرا مار کے دیکھو . مطلب یہ ھے کہ ھانڈی کو خریدتے وقت خوب ٹھونک بجا کر لیتے ھیں . لیکن جب وہ اپني چیز ھوجاتی ھے ' تو ایسا کرنے کی ھمت نہیں پڑتی ' اور ھانڈی کو احتیاط کے ساتھ رکھا جاتا ھے .

(۱۸۹) ھمارے گھر بوڑکی باندی . نیچے سر ' اپر پاواں .

[گھونگٹا

فائدہ : بوڑکی (واو مجہول) ' سر منڈی ' بے بالوں کی .
گھونگٹے کا کیسا صحیح بیان ھے !

(۱۹۰) پہاڑ ' ھتھی کان . لوکاں لگے منگنے .

[سوپ

دکھنی پہیلیوں میں پہاڑ کا تخیل کچھ عجب چیز ھے . یہاں سوپ کو پہاڑ بتایا گیا ھے . اس سے قبل اور مقامات میں بھی ھم پہاڑ سے دو چار ھو چکے ھیں . سوپ کو ھاتھي (ھتھی) کے کان سے تشبیہ دینا بے جا نہیں ھے . یہ بھی روز مرہ کا تجربہ ھے کہ لوگ (لوکاں) اکثر سوپ مانگ مانگ کے لے جاتے ھیں . ھماری ھاں کی ایک پہیلی میں بھي اسی مانگ پر زور دیا گیا ھے . وہ پہیلی یوں ھے :

سو ناریوں سے اک نر بنایا . گھر نہیں اپنا ' مانگ لیا پرایا .

(۱۹۱) یہک جناور گھماں : دس پاواں ' دو دماں .

[ترازو

ترازو کو ایک گھومنے والے (گھماں) جانور سے تشبیہ دی ھے ' جس کے دس پاوں ھیں اور دو دمیں . دس پاوں ترازو کے پلوں کی دس تسمیں ھیں ' اور دو دموں سے دونوں پلے مراد ھیں .

ہمارے ہاں کی ایک پہیلی میں واضع نے اس سے بہتر تصویر کھینچی ہے :

ایک نار نورنگی چلنگی ' چھہ نارے لٹکاے .
ناک میں نکھیسر پہنے ' دونوں کان بندھاے .
ست دھرم کا سودا کرتی : جتنا ہوے بتاے .
مردوں سے بھی بازو مارے ' تب بھی نار کہاے .

(۱۹۲) نیک بی بی کے سر میں ڈیڑھ بال .

[سوئی تاگا

نیک بی بی سے سوئی مراد ہے ' اور اس کے سر میں جو ڈیڑھ (ڈیڑھ) بال ہیں وہ تاگا ہے . ڈیڑھ کے بیان میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ عموماً سینے کے لیے سوئی میں تاگا اس طرح پرویا جاتا ہے کہ ایک طرف سے زیادہ لمبا رکھا جاتا ہے اور ایک طرف کم .

ہمارے ہاں کے بچے اسی خیال کو یوں ادا کیا کرتے ہیں :

زرا سی بٹیا ' گز بھر چٹیا .

ایک اور پہیلی اسی تخیل کو کچھ اور طول دے کر بیان کرتی ہے :

اتنے سے منی رام ' اتنی بڑی پونچھ .
وہ گئے منـی رام ' پـکڑ لاؤ پونچھ .

ایک پہیلی میں صرف سوئی کے بھید کو یوں کہا جاتا ہے :

اتنی سی فتنی ' کام کرے کتنی !

اسی کی ایک اور تصویر ملاحظہ ہو :

چھوٹی سی ہے اک نار . ڈبکی مارے جاے پار !

(۱۹۳) اڑوڑوں مڑوڑوں ' تھوک لگا کو اندر گھسوڑوں .

[سوئی میں تاگا

فائدہ : لگا کو (واو مجہول) ' لگا کر ۔

ہمارے ہاں اسے یوں کہتے ہیں :

مروز مراڑ کے سیدھا کیا ؛ گردن پکڑ کے اندر دیا ۔

اہل پٹنہ نے اس میں کچھ اور تفصیل کی ہے :

لڑبڑا لڑبڑا ' تھوک لگا کے کیا کھڑا . نہ جالنا ہنسی کھیل '
کمر پکڑ دیا دھکیل .

(۱۹۴) لکڑ مل کو بھائے ' جلبلا کو اتھے .

[تاگا بٹنا

فائدہ : لکڑ (ل مفتوح ' ک مشدد مفتوح) ' لکڑی . بھائے ' ڈالے ؛
یعنی انہوں نے ڈالا . جلبلا کو (ج ' ب مضموم) ' چلبلا کر ' جلدی سے '
تاگے کے بٹے جانے کا نقشہ کھینچا ہے .

(۱۹۵) سوتے سوتے ہاتھ میں لے کو سوے .

[پنکھا

گرمی کی راتوں میں پنکھے کو ہاتھ میں لیے لیے سو جانا ایک
معمولی بات ہے . اسی کا ذکر ہے . ہمارے بچے ایک چھوٹی سی پہیلی
اسی مضمون کی کہا کرتے ہیں :

ایک پرکھ ' وہ سب کو بھاوے - بنا سمے کوئی ہاتھ نہ لاوے .

امیر خسرو نے اپنے خاص طرز میں دو کہہ مکریاں لکھی ہیں .
دونوں کا مضمون ایک ہی ہے ' مگر کس قدر دل کش ہے :

(ا) آپ ہلے اور موہے ہلاوے . واکا ہلنا مورے من بھاوے .
ہل ہل کے وہ ہوا نسنکھا . اے سکھی ' ساجن؟ نا سکھی ' پنکھا !

(ب) چھتے چھدائے مورے گھر آوے . آپ ہلے اور موہے ہلاوے .
نام لیت موہے آوت سنکھا . اے سکھی ' ساجن؟ ناسکھی ' پنکھا !

(۱۹۶) اتا سا بتاسا ، کھلے کھن کھجور . جو میرا مسلا نہیں کھولے، وو میرے گھر مزدور .

[کیلی بھی خفل ، کلنجی اور قفل

فائدہ : اتاسا (پہلا الف مفتوح ، ت مشدد) ، زرا سا ، چھوٹا سا .
کھلے کھن کھجور (ہر ایک کھ مفتوح) ، مہمل . خفل ، قفل .

بتاسے سے قفل ، اور کھجور سے کلنجی مراد ہے . باقی اور کوئی اتا پتا نہیں دیا گیا .

ھماری ھندستانی پہیلی ہے :

نر ناری کی بات ہے ، زرا دل ھی میں رکھنا . نر کو دینا مار ، ناری کو چوکس رکھنا .

ایک اور پہیلی میں اسی اسلوب کو یوں نباھا ہے :

نر اور ناري ایک ھی زات ، نر مارا تو ناری ھات . سگری رات الگ رھے ، آن ملے پربھات . چکوا چکوی چھوڑ کے بوجھو ان کی بات .

امیر خسرو کا جو چلا دیکھیے :

بات کی بات ، ٹھٹھولی کی ٹھٹھولی : مرد کی گانٹھ عورت نے کھولی !

(۱۹۷) الٹھا پڑیا تو الٹھا پڑیا ، سدا پڑیا تو بالاں بھریا .

[برش

فائدہ : الٹھا (الف مضموم) ، الٹا . پڑیا (پ مفتوح) ، پڑا ، پڑا ہے . سدا (س مکسور ، دال مشدد) ، سیدھا .

کہتے ھیں کہ فلاں جب تک الٹا پڑا ہے پڑا ہے ، کوئی خاص بات اس میں نہیں ہے ؛ لیکن جب سیدھا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سراسر بالوں (بالاں) سے بھرا ہوا ہے . برش کی توجیہ خوب کی ہے .

(۱۹۸) یہک ادمي چلتے چلتے تھک گیا . لاؤ چاخو ' کاٹو گردن . پھر بھی چلنے لگ گیا .

[سرمے کی خلم ' پنسل

فائدہ : ادمي=آدمی . چاخو ' چاقو . خلم (خ ' ل مفتوح) ' قلم .
مضمون عیاں ھے .

ھمارے ھاں کی بھی ایک پہیلي میں بھي تقریباً بالکل یہی الفاظ ھیں . مگر ایک اور پہیلی اس سے زیادہ مفصل اور واضح ھے :

سب ھی کرتے پیار . سمس کاٹتے یار . تبھي چلے وہ چال . اس کا یہی احوال . چلنے میں رک جاے ' سر کاٹے دوڑاے .

(۱۹۹) اتھے تو جھنجھنات ' بوٹھے تو پگ پسار . لاتا تو کے هزار ' کھانا تو کچھ نہیں .

[مچھیارے کا جال

فائدہ : جھنجھنات (دونوں جھ مفتوح ' دوسرا نون مشدد) ' جھن جھناھٹ . کے (ک مفتوح) ' کئی ' بہت سے .

یہ مچھلی پکڑنے کے بڑے جال کا ذکر ھے ' جسے پھیلا کر پانی میں پھینکتے ھیں تو ایک سنسناھٹ سی پیدا ھوتی ھے . مچھیارا ھزاروں مچھلیاں پکڑ کے لاتا ھے ' مگر کھاتا ایک بھی نہیں .

امیر خسرو نے ایک ھی وضع کی دو پہیلیاں بنائی ھیں ' جن میں لفظ '' بن '' (ب مکسور) سے خوب کام لیا ھے . کہتے ھیں :

(ا) بن سر کا نکلا چوري کو ' بن تھن کی پکڑی جاے .
دوڑیو بن پاؤں کے ' بن سر کا لیے جاے .

(ب) کیا کروں بن پاؤں کی ' تجھے لے گیا بن سر کا .
" کیا کروں لمبی دم کی ' تجھے کہا گیا بن چونچ کا لوکا .

[مجھے دوسرے جملے کے آخری الفاظ کی صحت میں بہت شبہہ ہے . مگر اسے فاضل محمد امین چریا کوٹی نے یوں ہی نقل کیا ہے .]

(۲۰۰) کرتا کرکراتا ' آواز بلند جاتا . چلدی لے کو پوجتا ' بتی لے کو دیکھتا .

[کولھو

فائدہ : چندي (چ مکسور) ' کپڑے کا ٹکڑا ' چیتھڑا . پوجتا (واو مجہو) ' پونچھتا ' صاف کرتا ہے .

آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ کولھو کی یہ تصویر رات کے وقت کی ہے . پہلے جملے میں چلتے ہوئے کولھو کی آواز کا ذکر ہے . شروع سے آخر تک جو استعارہ استعمال ہوا ہے وہ عیاں ہے .

(۲۰۱) اتے متے ستے گاوں . تین منڈی دس پاؤں .

[کسان بھی ناگر ' کسان اور ہل

فائدہ : ابتدا کے تین لفظوں میں الف ' م اور س مفتوح ہیں ' اور ت مشدد ہے . یہ تینوں لفظ مہمل ہیں . منڈی (م مضموم) ' سر .

اصلی پہیلی دوسرے جملے میں ہے . تین سروں میں سے ایک سر تو ہل چلانے والے کسان کا ہے' اور دو اُس کے بیلوں کے ہیں . اسی طرح ان تینوں افراد کے دس پاؤں ہوتے ہیں .

(۲۰۲) ارے ارے مالی ! تیرے کھاندے پو کدالی . چھراں کی وان ' چوبیس کلی کا ایک پان .

[ریل گاڑی

فائدہ : کھاندا (نون غنہ) ' کاندھا . کدالی (ک مضموم) ' کھدال . کلی (ک مفتوح ' مشدد) ' کلی . ریل کا تلفظ حرف ر کے زبر سے ہے .

چھراں کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آتا . چوبیس گلی سے ریل گاڑی کے درجے مراد ہیں ' اور پوری گاڑی گویا پان ہے .

(۲۰۳) سولا برس کا گبرا بیٹا ؛ سوب کا انیں لاڑلا . کاٹے تو بھی کٹتا نہیں . اس بنا جگ کا کام ادھورا .

[روپیہ

فائدہ : سوب ' سب . لاڑلا (ڑ مکسور) ' لاڈلا . انیں (الف مضموم ' ی مجہول) ' وہ—ضمیر واحد غائب ' مذکر و مونث .

آخری جملے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہیلی خالص دکھنی نہیں ہے . سولہ برس سے روپے کے سولہ آنے مقصود ہیں .

لاڈ کا تخیل ہمارے ہاں کی ایک پہیلی میں بھی ہے :

سب تن زخمی ' بن پیروں وہ چلتا ہے .

راج دلارا ' سب کا پیارا ' قسمت سے وہ ملتا ہے .

صاحب فرہنگ آصفیہ نے ایک پہیلی نقل کی ہے (ج ۱ ' ص ۳۴۱) ' جس میں روپیے کے سفید رنگ پر زور دیا گیا ہے :

مولی کا سا قتلا ' دہی کا سا بھیس .

بوجھے ہے تو بوجھ ' نہیں تو چھوڑ ہمارا دیس .

روپیے کے رنگ کی سفیدی اور اس سکے کی چال ایک اور چھوٹی سی عام پہیلی میں یوں بیان کی گئی ہے :

چٹی بکری ' چٹے پیر : چل میری بکری اگلے شہر .

سید انشا نے روپیے (زر و مال) کے مزے ' روپیے کے نہ ٹوٹ سکنے اور قاضی الحاجات ہونے کو ایک مستزاد در مستزاد پہیلی میں یوں بیان کیا ہے :

وہ چیز بھلا کیا ' کہ مزے جتنے بنائے

اللہ میاں نے '

سو سب ہیں اسی میں !
پھوٹے نہ بہے، آپ رہے جیسے کا تیسا،
اور کار روائی
کر جائے وہ سب کی ؟

امیر خسرو نے بھی روپئے کی سختی کا ذکر کیا ہے، اور اس کے ساتھ کھانے، پرکھانے اور بھنانے کے تخیل کو جمع کیا ہے۔ ان کی ایک پہیلی ہے، جس میں کھانے اور پرکھانے کا ذکر ہے :

لوہے کے چنے دانت تلے پاتے ہیں اس کو۔
کھایا وہ نہیں جاتا ہے، پر کھاتے ہیں اس کو۔

دوسری میں بھنانے اور کھانے کو لیا ہے :

دانائی سے دانت اس پہ لگاتا نہیں کوئی۔
سب اس کو بھناتے ہیں، پہ کھاتا نہیں کوئی۔

[مجھے ان دونوں پہیلیوں کی زبان کے انداز سے شبہہ ہوتا ہے کہ یہ پہیلیاں امیر خسرو کی نہیں ہیں، بلکہ الحاقی ہیں۔ مگر محمد امین چریا کوٹی صاحب کو اس میں کوئی شبہہ نہیں معلوم ہوتا۔ اللہ کرے جناب چریا کوٹی کا خیال صحیح ہو۔ (جواہر خسروی، حصۂ چیستان، ص ۲۰)]

یہ پہیلی البتہ امیر کی معلوم ہوتی ہے :

چندر بدن، زخمی تن، پاؤں بنا وہ چلتا ہے۔
امیر خسرو یوں کہیں، وہ ہولے ہولے چلتا ہے۔

امیر خسرو نے اپنے مخصوص انداز میں روپئے پر بھی ایک کہہ مکرنی لکھی ہے :

ہاٹ چلت موہے پڑا جو پایا، کھوٹا کھرا میں نا پرکھایا۔

نا جانوں وہ ہے کا کیسا .   اے سکھی، ساجن؟ نا سکھی پیسا !

اس سے قبل امیر کی اسی نوع کی اور کئی کہہ مکریاں نقل کی جا چکی ہیں . ان سب کے مقابلے میں یہ کہہ مکری بہت ہی کم زور اور روکھی پھیکی معلوم ہوتی ہے .

(۲۰۴) ہندو بولتا کلی ، مسلمان بولتا کلی . میرا مسلا نہیں بو جہا سو اُنہیں اس کی جورو کا بھائی .   [روپیہ

فائدہ : نہیں بوجہا سو ، جس نے نہیں بوجھا . انہیں (الف مضموم ، ی مجہول) ، وہ . اس کی = اپنی . بھائی کا دکھنی تلفظ بھئی کی طرح ہوتا ہے اور وہ کلی سے ہم قافیہ ہے .

کل پہیلی پہلے جملے میں مرکوز ہے . میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے روپیہ کا مفہوم کیوں کر بن جاتا ہے .

دسویں فصل

کھیل کود ، تفریح

---

(۲۰۵) جھل جھل چڑیاں ، آسمان چڑیاں . آں کا چور ، باجیں گہاں کیلیاں .

[پتنگ بھی ڈور

فائدہ : جھل جھل (جھ مفتوح) ، چمک دار ، رنگ برنگ کی چڑیاں : پہلے لفظ میں چ مضموم ، جمع ہے چڑی (چ مضموم) کی ، چڑیاں ؛ دوسرے میں چ مفتوح = وہ (جمع مونث) چڑھیں . آں کا = آئے گا . باجیں گہاں ، باجیں گی ، بجیں گی . کیلیاں (پہلی ی معروف) ، جمع کیلی کی ، کنجیاں .

پتنگوں کو چڑیوں سے تشبیہ دی ہے ' جو آسمان کي طرف اڑتی ہوي چڑھی چلی جارہی ہیں . پتنگوں کے طرح طرح کے با رونق رنگوں کے لحاظ سے جھل جھل کہا ہے . دوسرے جملے میں چور اور کنجھوں (اور ان کی جھلکار) کا ذکر نہ معلوم کس مصلحت سے ہے ' اور ان سے کیا مراد ہے .

(۲۰۶) سر سر بہل ' سراری بہل . جہاں تک بہل ' وہاں تک کھیل . توٹ گئی بہل ' ہو گیا کھیل .

[پتنگ

فائدہ : سر سر ' سراری (سب س مفتوح) اسم صوت ہے ' جس سے ہوا میں پتنگ کی سرسراہٹ کا بیان مقصود ہے . تگ ' تک . توٹ گئي ' ٹوٹ گئی . ہو گیا ' ختم ہو گیا . بہل میں ی مجہول ہے .

بہل سے پتنگ کي ڈور مراد ہے ' جس کے کھینچنے اور چھوڑ نے سے ہوا کی مدد سے سرسراہٹ پیدا ہوتي ہے . ڈور ٹوٹ جاتی ہے ' تو ظاہر ہے کہ سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے . خاصی صاف پہیلی ہے .

اس '' بہل '' کا ذکر امیر خسرو سے سنیے :

ایک کہاني میں کہوں ' تو سن لے میرے پوت :
بنا پروں وہ اڑ گیا ' باندھ گلے میں سوت .

(۲۰۷) سرسری ' اسمان چڑی . آں کا چور ' کھینچیں کا ڈور . ہلیں گیاں کیلیاں ' ناچیں کا مور .

[پتنگ

فائدہ : چڑي (چ مفتوح) ' چڑھی . آں کا ' آے کا . ہلیں گیاں (ہ مفتوح ' گ مکسور) ' ہلیں گی . کیلیاں پہلی ی معروف ' کنجھیاں . ناچیں گا ' ناچے گا .

سرسری پتنگ ھے ' جو سر سر کرتا ھوا آسمان (اسمان) پہ چڑھتا ھے . چور غالباً پتنگ اڑانے والے کا ھاتھ ھے ' اور آخر میں مور پھر پتنگ کے لیے استعارہ ھے .

(۲۰۸) کالی مرغی ' دم جوار . انڈے دیتی بے شمار . انڈے پڑے تش میں ' بی بی پڑی غش میں .

[پھل جھڑی

فائدہ : تش ' طشت .

آتش بازی کی پھل جھڑی کا بیان ھے . مجموعی ھیئت کے لحاظ سے پھل جھڑی کو ایسی کالی مرغی کہا ھے جس کی دم جوار کی بالی کی شکل کی ھے . پھل جھڑی میں سے جو پھول طشت (تش) میں جھڑتے ھیں ان کو اس مرغی کے انڈے کہا ھے . پھولوں کے پانی میں جھڑنے سے ایسی پٹاپٹی کی آواز ھوتی ھے کہ گھر کی بی بی بے تاب ھو کر غش کر جاتی ھے . سبحان اللہ !

ھمارے ھاں کی ایک پہیلی ھے :

جا کے پات نہ کونپل پھل ' سدی دیو جلائے .

یہ تررور وہ پھول ھے : اچرج دیکھو آئے !

(۲۰۹) چار انگن ' چار چمن : چار شمادانیاں . اتھران متھران لڑتے تھے : بدخاں دیے لولیاں .

[پچیسی

فائدہ : انگن (الف ' گ مفتوح ' پہلا نون غنہ) ' آنگن . چمن (چ مفتوح ' م مشدد مفتوح) ' چمن . شمادانیاں ' شمع دانیاں . بدخاں (ب مفتوح ' د ساکن) ' جمع ھے بدخ (ب ' د مفتوح) کی ' بطخیں . لولیاں ' (واو مجہول) لوریاں .

پچیسی کی بساط کے چار بازوؤں کو چار چمن ' اور اس کے "گھروں" کو چار آنگن کہا ھے ؛ اور چار گوٹوں کو چار شمع دانیاں فرض کیا ھے . چال چلنے کے لیے جو کوڑیاں پھینکی جاتی ھیں ' ان کو اتیر مقیر (ی مجہول) کا فرضی نام (بصیغہ جمع)دے کر لڑنت پہلوان بنایا ھے ؛ اور وھی کوڑیاں بطخیں بن کر لوریاں دینے آئیں ھیں . کوڑیوں کے لڑنے اور ٹکرانے سے جو آواز پیدا ھوتی ھے ' اسی کو ان کی "لوریاں" کہا گیا ھے . یہ کھیل ھے ' اور اس کا دل کش بیان ھے .

گیارھویں فصل

آسمان و زمین ' اجرام فلکی ' سال و ماہ

---

(۲۱۰) تھام نیں سو منڈوا .

[اسمان

آسمان کو بغیر ستون کا منڈوا کہنا عام' مگر قابل تعریف ' تخیل ھے .

(۲۱۱) بستی تمام ییک چادر .

[اسمان

اس میں صرف حرف جار کی کسر ھے . کہنا یہ ھے کہ ساری بستی ' یعنی تمام دنیا ' پر ایک چادر تنی ھوی ھے . اس سے آسمان کے سوا اور کیا مراد ھوسکتی ھے ؟

(۲۱۲) ییک چان ' چوبیس تارے . موتھی دے کو پدک ھارے .

[اسمان

فائدہ : چان ' چاند . چوبیس کا عدد دکھنی محاورے میں اس لفظ سے ادا نہیں کیا جاتا . دکھنی میں چوبیس کو " بیس پو چار " (یعنی

بیس کے اوپر چار ! کہتے ھیں . یہاں لفظ چوبیس سے " بہت سے ' بے شمار "
مقصود ہے . اسی معنی میں لفظ " پچیس " بھی استعمال ھوتا ھے ؛
پچیس کے عدد کو " بیس پو پانچ " کہتے ھیں . موتھی ' موتی .
پدک (پ اور د مفتوح) ' گلے کا ایک زیور ' مالا .

پہلے جملے میں رات کے آسمان کا سماں دکھایا ھے ' اور بالکل
صاف صاف بیان کر دیا ھے . دوسرے جملے میں موتیوں سے ستارے ' اور
مالا سے تمام تارے (مجموعی حیثیت سے) مراد ھیں . اس (دوسرے)
جملے میں دن کے وقت کا آسمان مقصود ھے .

(۲۱۳) زمین اتا توا ' اسمان اتي روتی ' تاڑ کے جھاڑ اتی نلی .

[زمین ' اسمان ' جھاڑ

فائدہ : اتا (الف مضموم ' ت مشدد) اسم عدد غیرمعین مذکر '
اتنا . اتي (الف مضموم ' ت مشدد) اسم عدد غیرمعین مونث ' اتنی .
توا (واو مشدد) ' توا . نلی (ل مشدد) ' نلی ' ھتی .

شروع سے آخر تک کھانے کے سامان کا استعارہ ھے : توا ھے ' روتی ھے '
اور نلی ھے . توا اور روتی مدراس دکھن میں غیر معمولی چیز ھے '
کیوں‌کہ ان کے ھاں روتی بہت ھی کم کھائی جاتی ھے . غالباً پہیلی
کی شان پیدا کرنے کے لیے ان غیر معمولی چیزوں کا ذکر ضروری سمجھا
گیا ھے . یوں پہیلی بالکل صاف ھے . زمین اور آسمان کا ذکر تو صاف
صاف موجود ھي ھے ' تاڑ کے درخت (جھاڑ) کے برابر نلی سے بھی
آسانی سے درخت کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ھے . اسے گویا دکھنی کی
کہہ مکری کہنا چاھیے . تاھم ' اس بلا کي صاف گوئی نے پہیلی کا
لطف کیسا برباد کیا ھے !

(۲۱۴) کالا کوٹ ' کے ملارے . اُس میں پھرتے دو بلنجارے .

[اسمان ' چان ' سورج

فائدہ : کے (ک مفتوح) ' کئی ' متعدد . سورج کے تلفظ میں واو مکسور ہے .

یہ سنگ سیاہ کا بنا ہوا " کالا کوٹ " آسمان ہے ؛ اور اس میں جو دو بلنجارے پھرتے ہوے دکھائی دے رہے ہیں ' وہ چاند اور سورج ہیں . لیکن اُس کوٹ میں یہ مینار (ملارے) معلوم نہیں کیا چیز ہیں .

دو بلنجاروں کا تخیل ایک ہندوستانی پہیلی میں بھی ہے ' جس میں کئی باتوں کو جمع کیا گیا ہے :

چار کھونٹ ' چودہ چوبارے ' جن میں کھیلیں دو بلنجارے .
سونے کا تربوز گھرتے گھرتے گر پڑا ' املی کتارے جھڑ پڑے .

[اس میں کھونٹ سے سمتیں مراد ہیں ؛ چوبارے زمین اور آسمان کے طبق ہیں ؛ دو بلنجارے چاند اور سورج ہیں ؛ سنہرا تربوز سورج ہے ' اور املی کتارے ستارے ہیں .]

(۲۱۵) آیا رے مالی ' ازایارے پھول . سرمے کی چدر پو سلّے کے پھول .

[اسمان بھی تارے

چاند کو مالی فرض کیا گیا ہے ' جس نے یہ ستاروں کے پھول بکھیرے ہیں (ازایا) . سرمے کی چادر (چدر) آسمان ہے ' جس پر سنہرے (سلے کے) پھول ٹنکے ہیں .

اسی مضمون کی امیر خسرو کی پہیلی بہت مشہور ہے :

ایک تھال موتیوں سے بھرا ' سب کے سر پہ اوندھا دھرا .
چاروں اور وہ تھال پھرے ' موتی اس سے ایک نہ گرے ۔

(۲۱۶) اودا رمال ، سفید سفید پھولاں ..

[اسمان بھی تارے

یہاں آسمان کو اودے رنگ کے رومال (رمال) سے تشبیہ دی ہے ، جس پر بہت سے سفید سفید پھول بنے ہیں .

(۲۱۷) سل کے نچے نیل کے دانے .

[اسمان بھی تارے

اس پہیلی میں آسمان ایک سل بن گیا ہے ، جس کے نیچے (نچے) نیل کے دانے ، یعنی ستارے ، پڑے ہیں .

(۲۱۸) نیل کی چدر پر چاندی کے پھول . میرا مسلا نیں بوجے سو اس کے دھبلے میں دھول .

[اسمان بھی تارے

نیل کی چادر (چدر) ظاہر ہے کہ آسمان ہے ، اور اس پر جو چاندی کے پھول ہیں وہ ستارے ہیں . دوسرے جملے میں وہی معمولی دھمکی ہے کہ جو میری پہیلی نہ بوجھے (بوجے) ، خدا کرے اس کے دھبلے میں دھول ہو .

ایک ہندستانی پہیلی میں اس نیلی چادر کا تخیل یوں ادا ہوا ہے :

نیلی چادر میں چاول باندھے ، دن کو کھووے رات کو پاوے .

(۲۱۹) تتّی بوڑی بوڑی ، سلے کا کٹھورا . چور چھتا ، چرا نہ سکتا .

[چان

فائدہ : تتّی (ت مضموم ، ت مشدد — صحیح تلفظ میں ت کا پیش اس قدر ڈھیلا ہوتا ہے کہ قریب قریب واو مجہول سا بن جاتا

ھے)' کملا . بوڑي (واو مجہول) ' خالی . کٹھورا (ک مضموم ' واو مجہول) ' کٹورا . چھتا (چ مفتوح) ' چاھتا . چان ' چاند .

ایک خالی سا کملا ھے ' ایک سنہرا (سنے کا) کٹورا ھے — یعنی چاند — جسے چور ہزار چاھتا ھے کہ چرا لے ' مگر نہیں چرا سکتا ؛ کیوں کہ وہ اس کی پہنچ سے بہت دور ھے .

اسی تخیل سے ہمارے ہاں بھی ایک چھوٹی سی پہیلی ھے کہ :
چور تکتا ' لے نہ سکتا .

ایک پہیلی میں چاند اور ستاروں کو یوں جمع کیا ھے :

پرات جتنی روٹي ' اور گلگلوں کا ڈھیر .

لیکن بہترین اور مختصر ترین پہیلی ' جو ہمارے بچوں میں رائج ھے ' یہ ھے :

اللہ کا دیا سر پر .

امیر خسرو نے ایک کہہ مکرنی یوں کہي ھے :

اونچی اٹاری پلنگ بچھایو . میں سوئی ' میرے سر پر آیو .
کھل گئی انکھیاں ' بھئی انند اے سکھی ' ساجن ؟ ناسکھی ' چند !

(۲۲۰) بہار سے آئے شہزادے ' گھر میں پری . زر بفت کی چدر پر جڑاؤ کے پھول .

[چان بھی تارے

فائدہ : بہار ' باہر .

یہ شہزادے صاحب چاند ھیں ' جن کا ایسے ادب کے ساتھ نام لیا گیا ھے . گھر والی پری کی دو طرح توجیہہ کی جاتی ھے : گھر کی بی بی ' اور چراغ . اس پری پر (جیسا کہ اردو اور دکھنی ' بلکہ کہنا چاھیے کہ ھندی اور ایرانی ' کہانیوں کی خصوصیت ھے) یہ شہزادہ

عاشق ھے . زربفت کی چادر آسمان ھے ' جس پر جڑاؤ کے پھول لگے ھیں .

(۲۲۱) چاندی کا کٹھورا . چور ڈرتا ' اٹھا نہیں سکتا .

[چان

یہ کٹورا (کٹھورا) چاند ھے . دوسرے جملے میں وھی خیال ادا کیا گیا ھے ' جو اوپر (شمار ۲۱۸) آچکا ھے .

(۲۲۲) سکے تلاب میں چاندی کا کٹھورا .

[اسمان بھی چان -

فائدہ : سکے (س مضموم ' ک مشدد) مجرور صورت ھے سکا (س مضموم ' ک مشدد) کی ' یعنی سوکھا ' سوکھا ھوا .

یہاں آسمان کو سوکھا ھوا تالاب (تلاب) فرض کیا ھے ' جس میں چاندی کا ایک کٹورا پڑا ھے — جو چاند ھے .

(۲۲۳) ییک گلاب کا پھول ' سارا منڈوا چھایا . باپ پیٹ میں ' بیٹا شادی کرنے کو آیا .

[چان ' تارے ' سورج

یہ ایک (ییک) گلاب کا پھول جو سارے منڈوے پر چھا رھا ھے ' چاند ھے ' جس کی روشنی پورے آسمان (منڈوے) پر چھائی ھے . باپ ' یعنی سورج ' ابھی پیدا نہیں ھوا (پیٹ میں) ھے' یعنی کل صبح کو نکلے گا ؛ مگر بیٹا (یعنی چاند) جوان ھوگیا ھے اور اپنی شادی رچا رھا ھے ' جس میں اتنے سارے چمکتے دمکتے تارے جلوس میں شریک ھیں .

(۲۲۴) خدا کا دیا سرتا نہیں . بندے کا دیا بھرتا نہیں .

[چان

فائدہ: سرتا نہیں (س مفتوح) ' ختم نہیں ہوتا . بھرتا نہیں (بھ مفتوح) ' پورا نہیں پڑتا .

لفظ دیا میں توریہ ہے ' جس کے دو معنی ہیں : اس نے دیا ' اور چراغ . " خدا کا دیا " میں وہی تذہل ہے ' جو اوپر کی ایک پہیلی (شمار ۲۱۸) کے ضمن میں ہندوستانی پہیلی " اللہ کا دیا سر پر " میں ہے . دوسرے جملے میں لفظ دیا کے پہلے مفہوم لے کر اللہ کی دی ہوی نعمتوں اور بندے (انسان) کی دی ہوی چیزوں کا مقابلہ کیا ہے . اللہ کی نعمتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں . مگر انسان کے عطیے کسی طرح ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے . دوسرے (یعنی چراغ کے) مفہوم میں کل چستیان کے یہ معنی ہوے کہ اللہ کا چراغ نہیں بجھتا ' مگر انسان کے بنائے ہوے چراغ بجھ جاتے ہیں .

(۲۲۵) ہات ہدخ ' پھول تبخ . مالی گوند نہ سکے ' بادشاہ پہن نہ سکے .

[تارے

فائدہ : ہدخ (ہ ' د مفتوح) ' لفظ مہمل . تبخ (ت ' ب مفتوح) طبق . گوند (واو معروف ' نون غنہ) ' گوندھ نہ سکے . پہن (ی مجہول) نہ سکے ' پہن نہ سکے .

یہ پھول ایک نہیں بلکہ بہت سے ہیں ' جن کو نہ مالی گوندھ کر ہار بناسکتا ہے اور نہ بادشاہ جیسا دولت مند اور مقتدر شخص پہن سکتا ہے . یہ پھول ایک طبق میں بھرے ہوے ہیں—تارے آسمان میں ہیں .

(۲۲۶) تارا توڑوں ' تکو توڑوں ' توڑوں من کا تاکا . ہتھی پو نوبت بجا لے کو آیا ملک کا راجا .

[برسات ' بارش

فائدہ : تاڑا ' فرور ' تکبر . تکڑ (ت مفتوح ' ک مشدد مفتوح) ' مہمل لفظ ہے جو تاڑا کی صوتی مناسبت کے لیے استعمال کیا گیا ہے .
ہتھی (ہ مفتوح ' تھ مشدد) ' ہاتھی .

پہلے جملے سے اس کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں ت اور ڑ کی تکرار سے ایک شان و شکوہ کا اظہار ہوتا ہے ' جو ملک کے ایسے قہرمان بادشاہ کے شایان شان ہو جس کے جلوس میں ایسے طمطراق سے ہاتھیوں پر نوبت بجتی چلی آتی ہے . یہ ہاتھی بادل ہیں ' اور نوبت، مینہ کے برسنے کی آواز ہے .

اہل پٹنہ کا تخیل ملاحظہ ہو :

اروت کی کوٹھڑی ' پروت کا پہاڑ ' لونگوں کی جھنجھری ' پھولوں کا ہار .

اس مضمون کی امیر خسرو کی مشہور کہہ مکرنی ہے :

املق گھملق کر وہ جو آیا ' اندر میں نے پلنگ بچھایا .
میرا وا کا لاگا نیہہ . اے سکھی' ساجن؟ نا سکھی' مینہ!

(۲۲۷) راجا کے راج میں نیں ' مالی کے باغ میں نیں . کھاتے پن توڑتے نیں .

[کار ' اولے

فائدہ : پن (پ مفتوح) ' پر' مگر . نیں (پہلا نون مفتوح) ' نہیں .
اس میں شبہہ نہیں کہ اچھی پہیلی ہے .
ہمارے ہاں کی ایک نہایت مقبول پہیلی میں بھی یہی تخیل کار فرما ہے :

یہاں نہیں' وہاں نہیں ' خانم کے بازار نہیں ؛ چھیلو تو چھلکا نہیں ' چوسو تو گٹھلی نہیں .

لیکن امیر خسرو کی اس پہیلی کا ٹھاٹھ قابل داد ہے :

اجــل اتیـت مـوتی برنـي . پانی کامت دیے موے دھونی .
جہاں دھری تھی، وھاں نہیں پائی . ھات بزار سب ھی ڈھونڈھ آئی .
اے سکھی اب کہجیے کیا ؟ پی مانگے تو دیجیے کیا ؟ !

(۲۲۸) اخل کا پھل بخھیل کے ھاں نہیں . کھاتے سو چیز دنیا میں نہیں .

[گار

فائدہ : اخل (الف مفتوح ' خ مشدد مفتوح) ' عقل .

خالص دکھنی تخیل ہے . الفاظ ضرور اچھے ہیں . اولے کی کس قدر صحیح تعریف کی ہے !

(۲۲۹) سنگ چور ' موتھي بھرم . پیا دیا دھرم . ھاٹ میں نہیں ' بزار میں نہیں ' جہاں دیکھے وھاں نوں ' بادشاہ کے دربار میں نہیں . دیکھو بادشاہ کی چترائی : ھات لگائے چوری آئي .

[گار

فائدہ : چور (وار معروف) ' چورا چور ' ٹوٹا ہوا . موتھی (واو مجہول) ' موتی .

کہنے والي افسوس کرتی ہے کہ پتھر چور چور ہو گیا . اب تک میرا بھرم قائم تھا ' جس کی آب اور قیمت موتی کی سی ہے . اللہ (پیا) نے پہمان دیا ہے ' اور وہ صحیح سلامت ہے . مگر بادشاہ نے بڑي عقل مندي (چترائی) سے کام لیا کہ ایسی نازک چیز میرے پاس امانت رکھی کہ اسے ھاتھ لگاتے ھی میں چور بن گئی . لامحالہ سلنے والے ھمدردی کریں گے ' کہ اولا چیز ھی ایسی ہے کہ ھاتھ میں اٹھتے ھی گھل کے ختم ھو جاتا ہے ' تم کیوں ڈرو .

اس پہیلی کا آخری جملہ تقریباً وہی ہے ' جو امیر خسرو کی ایک مشہور اور مقبول پہیلی میں ہے : دیکھ سکھی پی کی چترائی ' ہاتھ لگاوت چوری آئی .

(۲۳۰) کانچ کی باوڑی ' موتھی کے لڑیاں . پاؤں دھوتے ' پانی نہ پیتے .

[شبنم

فائدہ : باوڑی ' کواں . پاواں ' جمع پاؤں کی . موتھی ' موتی .

موتیوں کی لڑی کا تخیل ہمارے ہاں کی ایک عام پہیلی میں بھی موجود ہے :

ہری ہریالی ' موتیوں کی جالی ؛ چاند کی بہن ' سورج کی سالی .

(۲۳۱) کانچ کی باوڑی ' موتھی کے لڑیاں . جھاڑ دھوئے ' پانی نہیں پئے .

[شبنم

شیشے کے کوئیں اور موتی کی لڑیوں کا تخیل اس میں اور اس سے قبل کی پہیلی میں مشترک ہے . یہ خیال البتہ اچھا ہے کہ اس سے پورے پورے درخت (جھاڑ) دھل جاتے ہیں ' مگر پھر بھی اتنا پانی نہیں ہوتا کہ پیا جاسکے .

ہمارے ہاں بھی ایک پہیلی اسی تخیل پر مبنی ہے ' لیکن اس سے بہتر ہے :

اوگھٹ گھاٹ گھڑا نہیں ڈوبے ' ہاتھی کھڑا نہائے .

پیپل پھر پھلنگ تک ڈوبے ' چڑیا پیاسی جائے .

اہل بہار اس میں ذرا سا تغیر کرکے یوں کہتے ہیں .

اسی کوس کا پوکھرا ،جس میں ھانھی گھوڑا نہاے .
بجر پرے ایسے پوکھرے پر ' فاختة پیاسی جاے .

(۲۳۲) یہیک چمچا آتا ' گھر بھر باٹا .

[روشنی

بھر اور باٹا (بانٹا) کے لفظ بتا رھے ھیں کہ یہ پہیلی خالص دکھنی نہیں ھے . چنانچہ ھمارے ھاں روشنی کی ایک بہت مشہور پہیلی کے الفاظ یہ ھیں کہ " مٹھي بھر آتا ' گھر بھر بانٹا . "

(۲۳۳) ڈھال ماروں تلوار ماروں ' نہ کٹے وو بھل . میرا مسلا نوں بوجھیا سو حیدرآباد کا ڈھیڑ .

[سایہ

فائدہ : نیں بوجھیا ' جس نے نہیں بوجھا . ڈھیڑ (ی مجہول) ' چمار ' پاسی وغیرہ کي طرح کي ایک بہت نیچ ذات قوم کا نام ھے .
پہلے جملے کا تخیل ھمارے ھاں کی ایک پہیلی میں بھی موجود ھے :

سل بھو ٹے ' سل بٹا پھوٹے ' وھي چھز کبھی نہ پھوٹے .

ایک اور پہیلی ھے : پچھو پچھو سب کے دھاوے ' جت اجیارو ات نہیں آوے .

اسی تخیل کو " کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ھوتا ھے انسان ' ایک پہیلی نے خوب ادا کیا ھے :

اک ناري کا مہلو رنگ . لگی رھے وہ پی کے سنگ .
اجیاري میں سنگ براجے ' اندھیاري میں چھوڑ کے بھاگے .

میرزا سودا نے اور زیادہ وسیع نظر سے کام لیا ھے :

کون نار ' جو دن اور رات رھتی ھے وہ سب کے ساتھ '

خالی نہ اس سے کوئی ناتھ   جو ہے دیکھو اس جگ ماتھ .

سودا کی کلیات میں سائے کی ایک اور پہیلی یوں درج ہے :

عجب طرح کی ہے اک نار ،   اس کا کہا میں کروں بچار !

نس دن ڈولے پی کے سنگ ؛   لاگ رہے وا کے انگ .

دیا برے تو وہ شرمائے ،   ڈھگ سے سرک وہ دور ہو جاے !

اسی پہیلی کو جناب محمد امین چریاکوتی نے امیر خسرو کی پہیلیوں میں یوں درج کیا ہے (جواہر خسروی، حصہ چیستان ، ص ۱۳) :

عجب طرح کی ہے اک نار   وا کا میں کیا کروں بچار

دن وہ رہے بدی کے سنگ   لاگ رہی نس واکے انگ

دوسری بیت میں " بدی " اور " رہی " غور طلب ہیں . اوپر کی پہیلی سے واضح ہوتا ہے کہ بدی کی جگہ پی اور رہی کی جگہ رہے ہونا چاہیے . یہ امر تحقیق طلب ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں سے کون اس پہیلی کا مصنف ہے .

سید انشا کا چوچلا بھی ملاحظہ ہو . مستزاد درمستزاد ریختی میں کہتے ہیں :

اندھیاری میں جو بہت سے ہو ، کون بھلا وہ .

جھٹ جن پڑےووھیں

پیارے جو اجالا ؟

لڑکا جو نگوڑا جلے سو بھوت سے کالا ،

اے دائی جنائی !

پرچھائیں ، اری بی !!

(۲۳۴) ایک جناور ہر ، اس کے لگے ہیں تیس پر .

[پہیلی کے نقاں

فائدہ : هر ' پر (پ مفتوح) کے لیے قافیۂ مهملہ . مهنا (م مکسور) ' مهینا . دنان ' دن کی جمع ہے .

یہ جانور مهینا ہے ' اور اس کے تیس پر تیس دن هیں .

(۲۳۵) یک سندغ ' بارا خانے ' تیس دانے .

[سال ' مهنا ' دن

فائدہ : سندغ (س مضموم ' دال مفتوح) ' صندوق .

همارے هاں کی بھی ایک پہیلی میں اسی طرح سال ' مهینا اور اس کے تیس دن جمع کیے گئے هیں :

ایک صندوقچی ' بارا خانے ' هر خانے میں تیس تیس دانے .

(۲۳۶) یک جهاڑ تیس ڈالے ' آدھے سفید آدھے کالے .

[مهنا بھی دن

فائدہ : ڈالے ' ڈالیاں ' شاخیں . سفید (س مفتوح ' ی معروف) ' سفید .

مهینے کو درخت (جهاڑ) سے ' اور اس کے تیس دنوں کو ڈالوں سے تشبیه دی ہے . یہ مهینا قمری ہے ؛ اس لیے آدھے دن سفید یعنی روشن هیں ' اور آدھے کالے یعنی تاریک هیں .

(۲۳۷) یک سندغ ' بارا خانے . یک یک خانے میں تیس تیس دانے : آدھے کالے آدھے اجلے .

[سال ' مهنا ' دناں ' راتاں

فائدہ : سندغ ' صندوق . مهنا ' مهینا . دناں ' جمع ہے دن کی ؛ اور راتاں ' رات کی .

یہ پہیلی اس سے قبل کی دونوں پہیلیوں کے الفاظ اور ان کے تخیل کا مجموعہ ہے .

(۴۳۸) پانچ کو پچھاننا ' بھس کی گردن مارنا . کھڑے سو جھاڑاں پڑیں گے ' اکاس کے پھول کھلیں گے .

[نمازاں ' ناخناں ' ادمیاں ' تارے

فائدہ : پچھاننا (پ مکسور) ' پہچاننا .

ھر ایک جملہ بالترتیب نماز ' ناخن ' آدمی اور تارے کا مظہر ھے . پانچ سے پانچ وقت کی نماز مراد ھے ؛ بھس ناخن ھیں ؛ کھڑے ھوے درخت (جھاڑاں) رات کے وقت سونے کے لیے گر پڑتے ھیں ' یعنی لیٹ جاتے ھیں ؛ اور وھی وہ وقت ھے کہ جب اکاس کے پھول ' یعنی تارے ' کھلتے ھیں .

بس اَتّاچ

هندستانی سنہ ۱۹۳۵ع

ایڈیٹر : اصغر حسین ' اصغر

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

سنہ ۱۹۳۵ع

ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ، الہ آباد

سالانہ چندہ پانچ روپیہ

فہرست مضامین

صفحہ